بیس (۲۰) بڑے مسلمان

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
مولانا رشید احمد گنگوہی
مولانا محمد قاسم نانوتوی
شیخ الہند مولانا محمود حسن
مولانا اشرف علی تھانوی
علامہ محمد انور شاہ کشمیری
مولانا عبیداللہ سندھی
مفتی کفایت اللہ دہلوی
مولانا سید حسین احمد مدنی
علامہ شبیر احمد عثمانی
مولانا محمد الیاس دہلوی
مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری
مولانا احمد علی لاہوری
مفتی محمد حسن امرتسری
مولانا ابوالکلام آزاد
مولانا محمد علی جوہر
مولانا سید سلیمان ندوی
مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری
مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
سردار احمد خان پتافی

عبدالرشید ارشد

مکتبہ رشیدیہ
۲۶۔ لوئر مال (شاہراہ پاکستان)، لاہور

بیس (۲۰) بڑے مسلمان

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
مولانا اشرف علی تھانویؒ	علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ
مولانا عبید اللہ سندھیؒ	مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
مولانا محمد الیاس دہلویؒ	مولانا شیخ عبد القادر رائپوریؒ
مولانا احمد علی لاہوریؒ	مفتی محمد حسن امرتسریؒ
مولانا ابو الکلام آزادؒ	مولانا محمد علی جوہرؒ
مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ	سردار احمد خان پتافیؒ

جمع و ترتیب : عبد الرشید ارشد

بیس (۲۰) بڑے مسلمان

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
مولانا اشرف علی تھانویؒ	علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ
مولانا عبید اللہ سندھیؒ	مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
مولانا محمد الیاس دہلویؒ	مولانا شیخ عبد القادر رائپوریؒ
مولانا احمد علی لاہوریؒ	مفتی محمد حسن امرتسریؒ
مولانا ابو الکلام آزادؒ	مولانا محمد علی جوہرؒ
مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ	سردار احمد خان پتافیؒ

جمع و ترتیب : عبد الرشید ارشد

(۲۰) بیس بڑے مسلمان

ترتیب
عبدالرشید ارشد

مکتبہ رشیدیہ ۲۵۔ لوئر مال لاہور

(۲۰) بیس بڑے مسلمان

ترتیب

عبدالرشید ارشد

مکتبہ رشیدیہ ۲۵۔ لوئر مال لاہور

نام کتاب ———— بیس بڑے مسلمان

مرتب ———— عبدالرشید ارشد

ناشر ———— مکتبہ رشیدیہ لاہور

مطبع ———— زاہد بشیر پرنٹرز ریٹی گن روڈ لاہور

صفحات ———— ۱۰۵۶

بار ہشتم ———— ۱۱۰۰

قیمت ———— ۳۶۰ روپے

رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ فروری ۱۹۹۶ء

360

2/4

نمبر	عنوان	صفحہ
1	بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے ان کی پوری زندگی کتاب و سنت کی اشاعت، ملک و ملت کی آزادی کیلئے وقف تھی	ج
2	نبی رحمان کی زیارت بیداری میں ممکن نہیں	ف
3	ابو الکلام آزاد کی قبر پر فاتحہ خوانی	ل
4	ہندوستان دار الحرب ہے	د
5	انگریز نے ضرورت محسوس کی کہ ہندوستان میں ایک نبوت قائم کی جائے	ض
6	رپورٹ۔ مسلمان کسی غیر ملکی کے زیر سایہ نہیں رہ سکتے	ص
7	ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے	ظ
8	گنگوہی اور نانوتوی کی جنگ آزادی 1857ء میں باقاعدہ شرکت	ط
9	یہ لوگ اولیاء اللہ کے صحیح جانشین تھے	1
10	حدیث: (علم غیب) میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا	10
11	امت کا اجماع حجت ہے	11
12	پیر مہر علی شاہ گولڑوی — قادیانی سے مقابلہ کیلئے تیار کیا	14, 608
13	ختم نبوت کی تحریک میں مولانا ابو الحسنات قادری علیہ الرحمۃ	15
14	سید احمد، اسماعیل دہلوی وہابیوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں اور — حسین علی، گنگوہی، نانوتوی	16
15	امام احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ پر اعتراض	17, 193
16	دیوبند کا ایک گروہ کانگریسی	17
17	تصور پاکستان اور شبیر احمد عثمانی	18
18	قیام پاکستان اور علمائے دیوبند	18
19	مودودی فرقہ	20
20	چند نفوس قدسیہ نے بالہام خداوندی — قیام مدرسہ دیوبند الہامی تھی	24-25
21	15 محرم الحرام 1283ھ مطابق 30 مئی 1867ء کو مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی	26, 701
22	بانی دار العلوم دیوبند — سید محمد عابد حسین، حاجی	26, 28, 72, 85,
23	نانوتوی کا خواب۔ خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں	29 اور 16
24	(علم غیب) سید احمد بریلوی جب دیوبند پہنچے تو کہا مجھے اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے	29
25	دیوبندی لوگ اپنا سلسلہ شاہ ولی اللہ سے ملا دیتے ہیں — کہ یہ ان کا ورثہ ہے	31

صفحہ	مضمون	نمبر
214	گنگوہی مزار پر جایا کرتے — دل چاہتا ہے۔ اب تو دور سے سلام کر رہا ہوں	98
214	حدیث - قیام تعظیمی۔ سردار کیلئے کھڑے ہونا	99
215	مولوی عبد السمیع علیہ الرحمۃ انوار ساطعہ	100
215	بعض مسائل میں گنگوہی کو حاجی صاحب سے اختلاف تھا	101
221	(کشف/غیب) ہاتھ جھٹک دیا ـ مصافحہ نہ کیا ـ مدرسہ میں۔	102
222	چائے میں اشرف۔ چائے زیادہ ہو گئی۔	103
222	(غیب) مجذوب نے بتا دیا کہ فلاں مولوی نے بھیجا ہے۔	104
223	مشکل کشائی تمہاری گنگوہی کی دعا پر موقوف ہے اگر میں کہ سارے اولیاء	105
223	گنگوہی کشف۔ یہ لوگ رافضی تھے۔	106
223	نذرانہ ربانی اور گنگوہی ایک لڑکے کی عقیدت	107
223	گنگوہی کشف۔ طلب پر اطلاع	108
224	(حیات بعد ممات/غیب) شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی زیارت حکم دیا گنگوہی سے بعد	109
225	گنگوہی — وفات	110
225	براہین قاطعہ گنگوہی کی۔	111
	حاجی شاہ بخش	112
6,277,278	ہندو مسلم اتحاد — محمود الحسن، عبید اللہ سندھی	113
	سید احمد بریلوی کی تحریک میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا۔	114
	محمد علی جوہر نے محمود الحسن کی تعریف کی اور دیوبند آئے ان کے مرنے پر	115
	مالٹا میں انگریز افسر محمود الحسن کی تعظیم کرتے تھے۔	116
	ترک موالات میں کانگریس کی ہمنوائی ـ محمود الحسن	117
	جس نے کفار دوستی اور معاونت باقی رکھی اسی میں سے۔	118
	ترک موالات کا فتویٰ۔ پانچ سو علماء کے فتوے۔	119
	نانوتوی کے بیٹے کو انگریز گورنر نے شمس العلماء کا خطاب دیا جو واپس کر دیا گیا	120
	محمود الحسن کی تحریر ـ ہندو سکھ مسلم مل جائیں تو —	121
	القاب ـ محمود الحسن	122
	تھانوی نے عید میلاد، گیارہویں، نیاز، فاتحہ سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔	123
316	تھانوی کی پیدائش — دو لڑکے ہوں گے — علی کے نام پر رکھنا —	124

بسم اللہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ

گزارشِ احوال

اُولٰئِکَ آبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

کتاب بیس بڑے مسلمان " آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں جن اکابر کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پوری زندگی کتاب و سنت کی اشاعت و تبلیغ اور ملک و ملت کی آزادی کے لیے وقف تھی۔ اور اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے انھوں نے اپنی پاکیزہ زندگی میں علم و بصیرت، تقویٰ و ایثار، جہد و عمل اور خلوص و للّٰہیت کی ایسی تابندہ و درخشندہ روایات قائم کی ہیں جن کی بہت کم مثالیں تاریخ عالم میں ملتی ہیں۔ یہ بزرگ ہستیاں غازی اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے جذبۂ اقامتِ دین اور علم و سیاست، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کتاب و سنت سے مستفاد و مستنیر فکر و فلسفہ اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سوزِ دروں، سلوک و تزکیہ نفس، دعوت و عزیمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا بہترین اور حسین مرقع تھیں۔

اس کتاب کے لیے اکابر کے اسمائے گرامی کا انتخاب کرتے وقت مختلف نقشے ہمارے سامنے آئے۔ اور بالآخر یہ نقشہ ترتیب پایا جو آپ کے سامنے ہے۔ اس برصغیر میں — ان اکابر کے علاوہ بھی بہت سی نامور ہستیاں یقیناً ایسی ہیں جن کے سیر و سوانح کو محفوظ کرنا انتہائی ضروری ہے جیسا کہ اس کتاب میں پیش کیے جانے والے حضرات کے تذکار کا — خصوصاً حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی، حضرت مولانا حسین علی واں بھچراں، حضرت مولانا ظہیر احسن محدث نیموی، حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوری، حضرت محمد عبداللہ سلیم پوری (کنڈیاں والے)، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دوسرے متعدد حضرات کی پاکیزہ زندگیاں اس قابل ہیں کہ ان کا مستقل تذکرہ کیا جائے۔ ہم اس کتاب سے فارغ ہو کر ان شاء اللہ اس طرف متوجہ ہوں گے۔ اور عزم یہ ہے کہ سیر و سوانح کے سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے ان تمام علماء و مشائخ کا تذکرہ محفوظ کر دیں۔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس خطہ زمین میں ملک و ملت کی خدمات سرانجام دیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہم اس کے اتمام کی دعا کرتے ہیں۔ (الحمد للہ آجکل بیس مردان حق زیر ترتیب ہے۔ اکٹھوں لا)

جن اصحاب کا ہم نے اس کتاب میں تذکرہ کیا ہے انھوں نے امت مسلمہ کے لیے جو عظیم الشان کارنامے نمایاں انجام دے۔ ان پر وہ ملک و ملت سے کسی صلہ و ستائش یا داد و تحسین کے طالب نہیں تھے۔ ان کی نظر " ان اجری الا علی اللہ " پر رہی، رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر انھوں نے خدا کے بندوں کو اس کے دین کی دعوت پہنچائی۔ اور اس کیلئے زمانے کے گرم و سرد کو انتہائی خندہ پیشانی اور صبر و ثبات سے برداشت کیا۔ یہ لوگ خود تو ملک بدر ہوئے، قید و بند سے گذرے، شعلوں میں کودے، آگ سے کھیلے، طوفانوں سے ٹکرائے اور سلطنتِ برطانیہ کے جاہ و جلال اور جبر و استبداد کا مقابلہ کیا لیکن اس کے بدلے میں ہمیں صحیح دین، خالص توحید، عشقِ رسالت، احترامِ اسلاف، علم و عمل کے بے پناہ

سے گذرے، شعلوں میں کودے، آگ سے کھیلے، طوفانوں سے ٹکرائے اور سلطنتِ برطانیہ کے جاہ و جلال اور جبر و استبداد کا مقابلہ کیا لیکن اس کے بدلے میں ہمیں صحیح دین، خالص توحید، عشقِ رسالت، احترامِ اسلاف، علم و عمل کے بے پناہ جذبے اور آزادی کی نعمتِ عظمیٰ کی دولت سے مالا مال کر گئے۔ —— ان کی بلندیٔ کردار، حسنِ عمل اور پاکیزگیٔ سیرت کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کرنا اور ان کے افکار و خیالات سے افرادِ ملت کو روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضا تھا۔ ہم نے اپنی کم مائیگی اور کوتاہ علمی کے باوجود یہ سعادت و شرف حاصل کرنے کی جہد و سعی کی ہے اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ قارئین پر چھوڑتے ہیں

کتاب کی کتابت مختلف خوشنویسوں سے کرائی گئی اور ہمیں اندازہ نہ رہا کہ کتنے صفحات ہو گئے ہیں تمام کو جمع کرنے کے بعد شمار کیا گیا تو تقریباً تیرہ صد صفحات تھے۔ مجبوراً تین صد کے قریب صفحات کا اخراج کیا گیا۔ لیکن یہ اخراج اس طرح کیا گیا کہ اس کا کتاب پر کوئی اثر نہ پڑے۔ یہ خارج شدہ مواد بجائے خود بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا اسے جلد ہی علیحدہ مستقل کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ اتنا مواد خارج کرنے کے باوجود کتاب کی ضخامت اندازہ سے خاصی زیادہ ہو گئی اس غیر متوقع اضافہ اور کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر بہترین جلد بندی کے سبب اعلان کردہ قیمت میں اضافہ ناگزیر تھا امید ہے کہ قارئین محسوس نہیں فرمائیں گے۔

آخر میں تمام مضمون نگار اصحاب اور اپنے ان بزرگوں اور رفقاء کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے رشحاتِ قلم سے یہ کتاب مرتب و مزین ہوئی اور جن کی کرم فرمائیوں اور دعاؤں سے یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی —— علامہ خالد محمود صاحب اور محترم سید انور حسین صاحب نفیس رقم کی مربیانہ و مشفقانہ سرپرستی اور برادرِ عزیز حافظ محمد اسلم سہیل کے تعاون و محنت پر ان کا ممنون ہوں۔ مولوی مرتضیٰ حسن نے مسودات و مضامین کے نقل کرنے میں جو کام کیا۔ اس پر ان کا شکریہ بھی واجب ہے —— اور یہ کتاب پیش کرتے ہوئے ان سب حضرات کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔

۲۸ رجب ۱۳۸۹ھ

۱۱ اکتوبر ۱۹۶۹ء

عبدالرشید ارشد

بار اول	۱۱۰۰	۱۱ اکتوبر ۱۹۶۹ء
بار دوم	۱۱۰۰	۱۷ ستمبر ۱۹۷۱ء
بار سوم	۱۱۰۰	جولائی ۱۹۷۵ء
بار چہارم	۱۱۰۰	اگست ۱۹۸۳ء
بار پنجم	۱۱۰۰	جولائی ۱۹۸۶ء
بار ششم	۱۱۰۰	مئی ۱۹۸۸ء
بار ہفتم		مئی ۱۹۹۰ء
بار ہشتم	۱۱۰۰	فروری ۱۹۹۶ء

مُرتّبِ کتاب

صحیح تاریخ اور سن تو یاد نہیں۔ بعض دوسرے خاندانی واقعات کی روشنی میں قیاس کرکے اپنی تاریخ پیدائش یکم ستمبر ۱۹۳۲ء ٹھیرائی ہے
جائے پیدائش آبائی گاؤں ہری پور تحصیل نکودر ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) ہے۔ ہمارے گاؤں کی نصف آبادی راعی مسلمانوں اور نصف سکھوں کی تھی۔ اگر ستمبر
۱۹۴۷ء میں ہمارے گاؤں کے مسلمان گاؤں سے نکلنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی تاخیر کر دیتے تو شاید ایک فرد بھی زندہ نہ بچتا۔
پرائمری اپنے گاؤں سے کرکے نکودر ہائی سکول پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ چھٹی جماعت کا آغاز کیا تھا کہ والد ماجد[1] کے حکم سے ہائی سکول چھوڑ کر
مدرسہ عربیہ طیبیہ نکودر میں حضرت قاری تاج محمد (حال عبدالحکیم ضلع ملتان) سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ بڑے بھائی حافظ محمد اسلم صاحب بھی یہیں
قرآن پاک حفظ کرکے دہرا رہے تھے۔ سوا پارہ حفظ کرنے کے بعد مشرقی پنجاب کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ رشیدیہ[2] رائے پور میں قرآن پاک حفظ کرکے
درس نظامی کی کتب شروع کیں۔

---

[1] والد ماجد حاجی تاج محمد صاحب میرے خاندان کے کئی دوسرے افراد کی طرح بغرض معاش پہلے افریقہ اور ان دنوں برطانیہ میں تھے۔ آغاز شباب
ہی سے رائے پور آمد و رفت کی وجہ سے متشرع اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ افریقہ اور برطانیہ میں بھی بقول علامہ اقبالؒ ؎

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

ایسے رہے جیسے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں رہ رہے ہوں۔ خاندان کے بعض دوسرے افراد چودھری ولی محمد گرہیر (رشتے میں پھوپھا جو بعد میں
ایم ایل اے منتخب ہوئے) تایا زاد بھائی محمد منظور (حال ڈائریکٹر واپڈا) جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پڑھ رہے تھے کے تقاضا و اصرار کے باوجود کہ مجھے
جدید اعلیٰ تعلیم دلائی جائے، والد صاحب کا حکم غالب رہا۔ وہ اگر چاہتے تو مجھے برطانیہ بلا کر تعلیم دلا سکتے تھے اور ان دنوں یہ بہت سہل تھا لیکن ان کی کیفیت بھی

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

آج برطانیہ میں تبلیغی جماعت اور بعض دوسری تنظیموں کی بدولت ان گنت چہروں پر مسنون داڑھی دکھائی دیتی ہے لیکن ۳۰-۱۹۲۹ء میں شاید وہ تنہا اس
استقامت پر عمل پیرا تھے۔ ان کے جذب دروں اور آہ سحرگاہی کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ میں دینی اور تبلیغی امور کو فروغ ہوا۔ برطانیہ کے دوسرے بڑے شہر میں
جمعیۃ المسلمین قائم ہوئی جس کے وہ برسوں امیر رہے۔ برمنگھم میں اسی جمعیۃ نے چار لاکھ پونڈ کے صرفے سے یورپ کی سب سے بڑی جامع مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا
جو آج کل ایک ٹرسٹ کے زیر اہتمام تکمیل کے مراحل میں ہے۔ جنرل حق نواز تبلیغی جماعت کے ایک سفر میں والد صاحب سے ملے۔ مجھے خط لکھا کہ آپ کے والد
صحیح معنوں میں مرد مومن ہیں۔ یہی کچھ تاثر کرنل الٰہی بخش معالج بانی پاکستان کے والد میاں محمد بخش، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور قاضی عبدالقادر جاوید
اور ان سے ملنے والے ہر شخص کا ہے۔ ۱۹۷۵ء حج کرکے وطن تشریف لا کر میاں چنوں میں قیام فرما ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان کا سایہ سلامت با کرامت رکھے۔

[2] حال جامعہ رشیدیہ ساہیوال۔ یہ ہمارے گاؤں سے تین میل جانب جنوب دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا۔

ہمارے گاؤں میں میرے تایا بابو فتح محمد نمبردار کا اخبار "مدینہ" بجنور اور چچا چودھری رحمت اللہ کو "زمزم" لاہور آیا کرتے تھے۔ پرائمری ہی سے ان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ دادا جان کے پاس قصّے کہانیوں کی کتابیں حاتم طائی، الف لیلہ، چہار درویش وغیرہ اور ان کے چچازاد بھائی کے ہاں طلسم ہوشربا کے ساتوں دفتر تھے۔ ان سب کو بار بار پڑھتا رہتا۔ خاندان کے اکثر افراد برطانیہ تھے۔ ان کی باتیں سنتا۔ تقریباً سات آٹھ سال کی عمر میں اپنے گاؤں سے دو میل دور کھیم پور میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو ایک جلسہ میں تقریریں کرتے سنا جو یاد نہیں کیا تھیں البتہ عبدالرحیم عاجز مرحوم کی پنجابی نظم کا پہلا شعر اب تک یاد ہے ؎

راتیں ستیاں پیاں مینوں اک خواب آ گیا　　گئے بدیشی ایتھوں ایتھے انقلاب آ گیا

تیرہ سال کی عمر میں اپنے گاؤں سے بارہ میل دور لدھیاں جا کر حاجی محمد شفیع (حال لاہور) کے ہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تقریر سنی۔ اسی کے لگ بھگ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی زیارت کی۔ حضرت سے بیعت پاکستان میں کی۔ علامہ حافظ غلام رسول حال مہتمم جامعہ علوم شرعیہ ساہی وال ان دنوں رائے پور کنز الدقائق وغیرہ پڑھتے تھے ان دنوں بھی ان پر رشک آتا تھا اور آج بھی۔ رائے پور میں تعلیم کے دوران وہیں کے ایک طالب علم رشید احمد[1] سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں دیوبند پڑھتے تھے اور رائے پور کے مدرسہ میں ان کی بہت شہرت تھی۔ ان کی باتیں سنیں، دیوبند کے حالات پڑھتا اور سنتا رہتا تھا۔ اب وہاں کے ایک طالب علم کو دیکھا۔ تایازاد بھائی سے جو میٹرک پڑھتے تھے۔ ان کے گھر آنے پر اکثر گفتگو اور بحث و مذاکرہ رہتا۔ چودھری ولی محمد گوہیرا اکثر ہمارے گاؤں آتے اور کئی کئی ہفتے قیام کرتے ان کے پاس دنیا بھر کے اخبارات و رسائل آتے۔ ان کو دیکھنے کا موقع ملتا۔ میں گاؤں میں پیدا ہوا، گاؤں میں پلا پڑھا لیکن مندرجہ بالا واقعات و حالات نے طبع میں روشنی اور جولانی پیدا کی اور امنگ پیدا ہوئی کہ گاؤں سے نکل کر کسی بڑے شہر کی درس گاہ میں تعلیم حاصل کروں لیکن وہ جگہ کون سی ہو، دارالعلوم دیوبند میں بڑی کتب میں داخلہ مل سکتا تھا اور سر میں سودا یہ بھی سمایا تھا کہ ایسی درس گاہ ہو جہاں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم کا اہتمام ہو۔ جامعہ ملیہ پر نظر انتخاب پڑی۔ خط و کتابت کی، میری عمر زیادہ اور استعداد کم تھی۔ تین سال کا نصاب منگا کر تیاری شروع کی کہ اس طرح چھلانگ لگا کر آٹھویں میں داخلہ لیا جائے۔

ملکی سیاست عروج پر تھی۔ انتخابات کی آمد آمد تھی۔ دو سال یونہی ضائع ہو گئے ——— قیام پاکستان پر قافلے کے ساتھ چل کر پاکستان آ کر ڈیڑھ دو ماہ ادھر ادھر پھر کر میاں چنوں ضلع ملتان میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اور ایک سال مزید ضائع ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان میں داخل ہو کر دوبارہ درس نظامی کی کتب شروع کیں لیکن یہ جان کر کہ تکمیل نصاب میں آٹھ سال لگیں گے۔ واپس میاں چنوں آ کر حضرت مولانا محمد ابراہیم[2] صاحب جگراؤنی کے مدرسہ رحیمیہ میں حضرت موصوف سے اور حضرت مولانا محمد عبداللہ ڈھکوٹیؒ سے منتخب کتب پڑھ کر، جامعہ رشیدیہ ساہی وال

---

[1] ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، قیام پاکستان کے بعد جامعہ عباسیہ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے جامعہ ازہر (مصر) گئے۔ کئی سال وہاں پڑھ کر اور رہ کر برطانیہ سے تصوف میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پاکستان میں مختلف اداروں میں بطور سربراہ کام کیا۔ آج کل ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ڈائریکٹر ہیں۔

[2] حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صورت و سیرت کے لحاظ سے شان بزرگ تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے ابتداً بیعت ہوئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے بعد سوائے نبی اور صحابی کے کسی بزرگ کی زیارت کی حسرت نہیں اور نبی و صحابی کی زیارت بیداری میں ممکن نہیں۔

(بقیہ حاشیہ ۱ اور ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مشکوٰۃ جلالین پڑھ کر اس سے اگلے سال دوبارہ مدرسہ عربی خیر المدارس میں داخل ہو کر ۱۹۵۲ء میں دورۂ حدیث کر کے سندِ فراغت لی۔ مولانا محمد یوسف مدیر "بینات" کراچی دورہ کے ساتھی تھے۔ اُن دنوں بھی اُن کی علمی و عملی بلندی کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا تھا اور آج بھی۔ اور اسی دورہ کے سال میں چند ماہ ضلع لائل پور کی مشہور دینی درس گاہ دار العلوم ربانیہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد رفیق کشمیری سے استفادہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں منشی فاضل کیا۔

نشر و اشاعت، امامت و خطابت: مُلتان سے فراغت کے بعد حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے حکم پر ایک مسجد میں امامت و خطابت کا آغاز کیا اور ان کی سرپرستی میں ادارہ اشاعت دین قدیم میاں چنوں کی بنا ڈالی جس کی جانب سے کئی سالانہ سیرت کانفرنسیں اور بیسیوں تبلیغی اجلاس منعقد کرائے بعنوان "رشیدیہ" کے نام سے سکول کی کتب کی دکان کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ پر مشاہیر شعراء کی کہی ہوئی نظموں کا رزمیہ انتخاب بنام نغماتِ جہاد شائع کیا جس کی ایک ہزار کاپی اہالیانِ میاں چنوں نے فوج کو بھیجی ——— ایک چارٹ "شجرۂ رُوحانی و علماء ربانی اکابر دیوبند کے سلاسلِ سلوک" پر شائع کیا جس کی حضرت قاری محمد طیب نے خصوصاً بہت تعریف فرمائی۔ اور چند ایک چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرائے۔ ۱۹۴۸ء میں ریڈرز ڈائجسٹ کے متعلق ایک وقت میں مضمون پڑھا کہ پندرہ سولہ معروف زبانوں میں کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ اس طرح کا رسالہ نکالنے کی دھن انھی دنوں سے سوار ہو گئی، وسائل نہ تھے۔ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ماہنامہ "عمران" کی درخواست دی جو سی۔ آئی۔ ڈی کی نذر ہو گئی۔ ۱۹۶۳ء میں ایک سال ہفت روزہ "دعوت" کی ادارت کی۔ میرا ذہن ابتدا ہی سے اس طرف چل رہا تھا کہ عمدہ اشاعتی ادارہ ہونا چاہیے۔ ۱۹۶۰ء میں "چٹان" کے سالنامہ میں آغا شورش کاشمیری نے "ندوۃ المصنفین" دہلی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ——— "کاش! پاکستان کے مذہبی دیوانے بھی اس پر غور کریں اور ملک میں ندوہ جیسا کوئی معیاری اشاعتی ادارہ قائم کریں۔ اس بات نے مہمیز کا کام کیا اور میں نے ۹ پر کو روزنامچہ میں لکھا کہ ——— "ان شاء اللہ کبھی نہ کسی دن ایک معیاری اشاعتی ادارہ پبلک لمیٹڈ کمپنی کی شکل میں قائم کیا جائے گا" ——— اور یہ درد لے کر اِدھر اُدھر دستک دیتا رہا کہ مل کر ایسا ادارہ قائم کیا جائے۔ مولانا سید نیاز احمد شاہ گیلانی، علامہ خالد محمود ایم۔ اے مولانا مقبول احمد ساہی وال (حال گلاسگو) کے ساتھ ایک مجلسِ مشاورت میں "ادارہ حفظ معارفِ اسلام لاہور" کی بُنیاد رکھی گئی لیکن اس ادارے کی زندگی دو تین کُتب کی اشاعت تک محدود رہی۔ راقم اس کا مہتمم تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی کی صدارت میں ایک ایسی ہی مجلس میں ایک ادارہ بنام "دار المؤلفین" کے قیام کا فیصلہ ہُوا۔ مولانا محمد علی جالندھری مہتمم، مولانا سید حامد میاں ناظمِ اعلیٰ، راقم ناظم نشر و اشاعت اور حکیم محمود ظفر سیالکوٹی خازن مقرر ہُوئے۔ اس کی تین چار مجلسیں ہوئیں لیکن نشستند و گفتند و برخاستند کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا ———

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سوائے ان لوگوں کے جو حضرت مسیح علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر زندہ ہوں۔ صبح تہجد کے لیے اُٹھے، وضو کیا، چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھے تھے کہ گر کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ وفات سے اگلے سال بارش سے قبر کھُل گئی۔ نعش کو کئی گھنٹے باہر نکال کر دوبارہ قبر ٹھیک کر کے دفن کیے گئے۔ عینی شاہدوں کا حلفیہ بیان ہے کہ جسم کے وزن اور لچک میں کوئی کمی نہ تھی۔ حتیٰ کہ منہ پر گرنے سے چوٹ کا نشان ایسے تھا جیسے غسل دینے کے وقت تھا۔ ایک صاحب نے پنجہ کر ہلا جلا کر دیکھا تو اس میں پوری لچک تھی۔

ے مولانا مرحوم حضرت مولانا ابراہیم صاحب کے پہلے شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے مُرشد حضرت رائے پوری سے عشق تھا۔ بہت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ صحیح معنوں میں صوفی اور عالم باعمل تھے۔ ۱۹۶۳ء میں انتقال فرمایا۔

جیسے لوگ سامعین تھے۔ احقر نے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے حضرت قاری صاحب کو دارالعلوم دیوبند نمبر پیش کیا۔ حضرت قاری صاحب مغفور نے اپنے مخصوص انداز میں احقر کی اس طرح تعریف کی کہ نیچے مجمع میں بیٹھے ہوئے شرم آنے لگی۔ ۱۹۷۹ء میں دوبارہ برطانیہ جانا ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا شہرۂ آفاق ہفت روزہ الہلال (جولائی ۱۹۱۲ء تا نومبر ۱۹۱۴ء) دیکھنے کو لوگ ترستے تھے اور ایک ایک شمارہ کی قیمت ہزار بتلاتے تھے۔ مولانا سمیع الحق صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک نے دارالعلوم دیوبند نمبر کی تقریب پر فرمایا کہ اب "الہلال" کو ہاتھ ڈالو۔ اس کی تلاش شروع ہوئی۔ مکمل فائل جناب ڈاکٹر شیر بہادر پنی کی معرفت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے مل گئی اور مولانا محمد اسحاق خان صاحب مدنی مبعوث رابطہ اسلامک مشن برائے متحدہ امارات' دوبئی جیسے عالم فاضل دوست سرمایہ کے ساتھ اس کی اشاعت میں ممد و معاون ہوئے۔ الحمدللہ مکمل فائل کا عکسی ایڈیشن دوبارہ شائع ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی ۲۸ مئی ۱۹۸۳ء کو فلیٹیز میں زیر صدارت مولانا محمد اسحاق صاحب منعقد ہوئی جس میں مہمان خصوصی پاکستان کے وزیر دفاع میر علی احمد صاحب تالپور تھے۔ یہ بھی ایک منتخب اجتماع تھا۔ میر صاحب موصوف نے مختصر مگر تاریخی خطاب فرمایا۔ حضرت مولانا عبیداللہ انور، مولانا مجاہد الحسینی، مولانا سعید الرحمن علوی نے مقالات پڑھے اور لاہور کے تمام اخبارات نے نمایاں طور پر تقریب کی کارروائی کو شائع کیا۔ ہر انسان کی زندگی میں کچھ دن ایسے آتے ہیں جو یادگار اور تاریخی ہوتے ہیں۔ احقر کی زندگی میں پہلا تاریخی دن وہ تھا جب میں نے ۱۸۵۷ء کی یاد میں مئی ۱۹۵۷ء میں میاں چنوں جلسہ کیا جس میں آغا شورش مرحوم نے خطاب کیا۔ دوسرا، تیسرا اور چوتھا تاریخی دن علی الترتیب "بیس بڑے مسلمان" کی اشاعت، دارالعلوم دیوبند نمبر کی تقریب اور الہلال کی تقریب تھی۔ اور ہاں آغا شورش مرحوم کے ساتھ "موت سے واپسی" کراچی سے لاہور تک تاریخی سفر میں ساتھ رہا۔ ہر اہم اسٹیشن پر آغا صاحب کا جیسا استقبال ہوا اس کی نظیریں برصغیر کی تاریخ میں شاید دو تین اور ہوں۔ احقر نے پورے سفر کی روئیداد قلمبند کی جو "خدام الدین" اور "چٹان" میں شائع ہوئی۔

زندگی کا ایک واقعہ پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہونا ہے۔ گذشتہ صدی کے آخری سال دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جشن منایا گیا جس میں حاضری کی سعادت ہوئی اور ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی دفعہ انڈیا جانا ہوا اور جس دارالعلوم کے بانیوں، سرپرستوں اور اکابر کی کتاب و سنت کی اتباع اور عشق ختمی مرتبت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی زندگیوں کو دیکھ کر اپنی زندگی کی شمع روشن کی تھی۔ اس دارالعلوم کو جیتے جاگتے جا کر دیکھا۔ ان در و بام کو سلام کیا کہ جہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوئی کہ ؎

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے

لاہور سے ایک ٹرین "دیوبند ایکسپریس" چلی جو تین دن وہاں رہی۔ عالم اسلام یا کسی تعلیمی ادارے کا دنیا میں شاید ہی اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے چوراسی پچاسی سال کی عمر میں اس تاریخی اجتماع کا اہتمام کیا اور ایک نشست سے خطاب بھی فرمایا۔ سبحان اللہ اپنے بچپن میں حضرت قاری صاحب کی جوانی میں جو تقریر سنی تھی اس ضعف و پیری میں بھی وہی حسن تقریر، سلاست ربط تھا۔ مترنم آواز کی شیرینی اور لب و لہجہ کا وہی انداز تھا۔ اسی سفر میں اردگرد کے تاریخی مقامات کی زیارت کی۔ حکیم الامت

۔۔۔ آپ کی ساٹھ سالہ تدریس اور اہتمام میں دارالعلوم نے انتہائی ترقی کی۔ تقسیم کے بعد انڈیا میں بلا تقسیم تمام مسلمانوں کے رہنما تھے کہ
استعداد و صلاحیت اور اصابت رائے پر تمام مکتبہ ہائے فکر کا اتفاق تھا۔ مختلف اوقات میں انڈین مسلمانوں کے پرسنل لا، کے لئے جو
انجمنیں بنیں آپ ہی تقریباً ہر دفعہ اس کے صدر الصدور قرار پائے۔ اب جولائی ۱۹۸۳ء کو دیوبند میں وفات پائی۔ دہلی کے بعد ہندوستان
کا دینی مرکز دیوبند رہا لہٰذا دہلی کے بعد علماء، مشائخ اور اولیائے کرام کی ابدی آرام گاہوں کا سب سے بڑا مرکز بھی دیوبند ہی ہے۔ دہلی
کا ذکر کیا کہنا اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کے ثلث آخر میں سب سے زیادہ اولیائے کرام نے دہلی کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر
ان صالحین اور اہل اللہ کی صرف فہرست بنائی جائے جو دہلی میں مدفون ہیں تو اس کے لیے اس صفحہ جیسے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ میرے دہلی
میں قیام کی منجملہ اور اہم وجوہ کے ایک اہم وجہ مولانا ابوالکلام آزاد کی قبر پر دعا کرنا تھی۔ تمام احباب جب موقع ملا ہو آئے لیکن میں ذہنی یکسوئی
کی تلاش میں رہا اور جب وہ میسر آئی تو مولانا کی قبر کے احاطے کا دروازہ بند تھا جو خاص اوقات میں کھلتا ہے۔ آپ کی قبر جامع مسجد دہلی کے
سامنے ہے۔ بقول شورش مرحوم مولانا آزاد اور علامہ اقبال دونوں اس دور کے عبقری تھے۔ ایک کو شاہی مسجد لاہور کے پہلو میں جگہ ملی اور
دوسرے کو شاہی مسجد دہلی کے سامنے ـــــ ایک خاص راستہ ڈھونڈا اور مزار پر فاتحہ خوانی کی۔

میرے حالات مشاہدات کا روپ دھارتے چلے جارہے ہیں جو کسی ضخیم کتاب کے متقاضی ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کی باری آئے
گی۔ خیال ہے کہ جو کچھ پڑھا، سنا، دیکھا اور سوچا اس کو قلمبند کر دیا جائے۔ شاید اس میں کوئی کام کی بات ایسی آجائے جو اوروں کے لیے
مفید ہو۔ میری ذہنی ساخت پرداخت میں اساتذہ، شیوخ، بڑے بھائی کی وقتاً فوقتاً عمدہ نصائح حضرت والد صاحب کے خطوط، دعاؤں،
ہمہ قسم کے مطالعے کے علاوہ دو شخصیتوں کا ہاتھ ہے۔ پہلے ماسٹر عبداللطیف صاحب لوگرڈھی جو ہمارے گاؤں میں میرے پرائمری پاس
کرنے کے بعد تعینات ہوئے لیکن ان کی نیکی اور مذہبی و سیاسی مطالعہ میرے بہت کام آیا۔ میاں چنوں آکر مولانا غلام حیدر صاحب سے
تا قیام میاں چنوں استفادہ کرتا رہا۔ افسوس کہ پہلے سولہ سترہ سال پہلے اوکاڑہ اور مولانا غلام حیدر صاحب یکم اگست کو فوت ہوگئے۔ اللھم اغفرلھما
وارحمھما۔ دوست احباب، بزرگ رشتہ دار اور اساتذہ و شیوخ سبھی الحمدللہ اپنی اپنی جگہ مہربان اور کرم فرما رہے لیکن اپنا حال یہ ہے کہ
پچاس سے اُوپر عمر ہو چکی ہے لیکن اب تک اپنے پاس عقل ہے نہ علم، عمل ہے نہ کوئی خوبی۔ جذبات و احساسات ضرور ہیں لیکن ان کو
بروئے کار لانے کے لیے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا فقدان ہے البتہ اپنے زمانے کے جن لوگوں کو اسلام کا شیدائی و فدائی
دیکھا ان سے محبت ضرور ہے اور اسی محبت کے طفیل اگر اللہ تعالیٰ کوئی کام لے لیں تو وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ چنانچہ اب کئی سالوں کی
سوچ اور فکر کے بعد اپنے خدا پر اعتماد کرتے ہوئے ایک کثیر المقاصد منصوبہ بنام ادارہ قاسم المعارف کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ تعالےٰ
اس میں کامیابی عنایت فرمائے کہ فردائے قیامت میں محبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمساری نہ ہو۔

استغفر اللہ واتوب الیہ افوض امری الی اللہ وھو المستعان وعلیہ التکلان

عبدالستار

۲۱ ذوقعدہ ۱۴۰۳ھ ۳۱ اگست ۱۹۸۳ء

علامہ خالد محمود
ایم - اے - پی - ایچ - ڈی
برمنگھم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

جس قوم کا تہذیبی ورثہ لٹ جائے اور حال ماضی سے کٹ جائے۔ وہ قوم گو نام سے باقی رہے۔ مگر حقیقت میں اس کی نبضیں خاموش ہوتی ہیں۔ وہ کسی دوسری قوم کے قالب میں جلوہ گر ہو تو یہ زندگی کی علامت نہیں اپنی اصل کے لحاظ سے موت کی آغوش میں ہے۔

اسلام اگر ایک زندہ مذہب ہے۔ تو تاریخ اسلام کے ہر دور میں اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ زندگی تسلسل کے بغیر زندگی نہیں اور اس کے تمام دور آپس میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط و منظم ہونے چاہئیں۔ اسلام تاریخ کے مختلف دوروں میں خواہ کسی پیمانے میں رہا اور ناسازگار حالات میں سے اسے کیسے ہی کیوں نہ گزرنا پڑا۔ اسلام کی شاہراہ حیات ہر دور میں موجود رہی اور اس پر کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا کہ اس کی اساسی حیثیت کلیۃً مٹ چکی ہو اور آئندہ پھر نئے سرے سے طلوعِ اسلام ہوا ہو۔

دین کی غایت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی رضا جوئی اور اس کے احکام کی تعمیل ہے۔ وہی ذات واجب الوجود اس شاہراہِ مسلسل کی آخری منزل ہے۔ سب پیغمبر اسی ایک کی طرف دعوت دیتے رہے اور اسی کی تلاش ہر دینی کاوش کا منتہیٰ رہی۔ جس نے اسے پالیا، اس نے سب کچھ پالیا۔ اس کی طرف لوٹنا نجات، اور اس سے ٹوٹنا اشتیاق و اضطراب کی آگ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے من انصاری الی اللہ کہہ کر بتلایا کہ میں خدا کی طرف بلانے والا ہوں تو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی منزل کی نشاندہی فرمائی اور اللہ کی طرف بلانا اپنا رستہ بتلایا: قل ھذہ سبیلی ادعوکم الی اللہ علی البصیرۃ انا ومن اتبعنی

یہ شاہراہِ مسلسل اسی ذات واجب سے چلتی اور اسی کی طرف لوٹتی ہے، تمام پیغمبرانہ دعوت کا اجتماعی نقطہ وہی ایک ذات ہے۔ جہاں تمام دینی محنتیں منتہیٰ اور سب مذہبی کاوشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہی منزل حقیقی ہے۔ جو اسے پالے، پھر اس کا انتقال بھی وصال ہو جاتا ہے۔

یہ دستہ ابتداء میں بالکل بے ضرر تھا۔ لیکن مغربی فکرونظر سے سمجھوتہ کرتے ہوئے انجام کار اپنے دین سے کٹنا لازمی تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقائد افکار میں ڈھیلے گئے اور اعمال وسعت قلب BROADMINDEDNESS کی بھینٹ چڑھنے لگے۔ اسی دور کے قریب سرسید نے علیگڑھ سکول کی بنیاد رکھی (جو بعد میں کالج اور یونیورسٹی تک پہنچ گیا)، اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان اس نظریئے کے گرد جمع ہوگئے۔ یہ ایک اچھی تحریک تھی، مگر وقتی تدبیر تھی، جس کا متوارث اسلام سے کوئی اسنادی تعلق نہ تھا۔

۱۔ محدثین دہلی کے پیرو اس بات کے حامی تھے کہ گو جنگِ آزادی میں ہم ناکام ہوچکے ہیں، مگر مغربی فکرونظر سے سمجھوتہ نہ ہونا چاہیئے۔ انگریزی زبان بے شک سیکھ لی جائے۔ مگر انگریزی تہذیب و تمدن کو نہ اپنایا جائے اور درس و تدریس اور تزکیہ و تعلیم کے ذریعے اسلام کی علمی اور عملی قوت کو محفوظ رکھا جائے، جس سے پھر کسی وقت راہِ عمل کے چراغ روشن ہوسکیں۔ یہ حضرات اپنی فکرونظر کے موجب تھے علم نبوت کے ترجمان اور متوارث اسلام کے داعی تھے اور اسی راہ سے وہ ملت اسلامیہ کی راہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اسنادی سلسلہ صحابہ کرامؓ، بزرگان اسلام اور محدثینِ دہلی سے مربوط تھا۔ اسی دور کے قریب اہلسنت والجماعت کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند قائم ہوئی۔

۲۔ مسلمانانِ ہند میں ایک خیال یہ بھی کام کر رہا تھا کہ نماز روزہ جیسے چند اعمالِ اسلام کو باقی رکھ کر انگریزی عملداری کو خلوصِ قلب سے اپنا لیا جائے اور انگریزوں کو اپنے اولی الامر داخل سمجھا جائے۔ یہ لوگ دین اور دنیا کی تقسیم کے حامی تھے اور دنیوی مراعات حاصل کرنے کے سوا ان کا کوئی مطمح نظر نہ تھا۔ انگریزوں سے کامل وفاداری کے اظہار کے لیے یہ لوگ محدثینِ دہلی کے خلاف بھی دم مارتے ہے اور ان کی دینی راہنمائی انہیں بہت کھٹکتی تھی۔ اس دور کے قریب کئی دنیا دار مشائخ کو استحکام ملا اور ان کی گدیوں نے باقاعدہ شکل اختیار کی، مگر انگریزوں کو اولی الامر میں داخل کرنے کے لیے ان کی آواز پھر بھی کافی نہ تھی۔ کیونکہ ابھی تک سب علمی چراغ محدثینِ دہلی کے چراغوں سے روشن تھے۔ اس کام کے لیے نبوت کی ہدایت درکار تھی۔ انگریزوں نے ضرورت محسوس کی کہ غلام ہندوستان میں ایک نبوت بھی قائم کی جائے، جو انہیں اپنے اولی الامر میں داخل کرے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں انگریزوں نے ایک کمیشن لندن سے ہندوستان بھیجا تاکہ وہ انگریز کے متعلق مسلمانوں کا مزاج معلوم کرے اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کو رام کرنے کی تجاویز مرتب کرے۔ اس کمیشن نے ایک سال ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کے حالات معلوم کئے۔

۱۸۷۰ء وائٹ ہاؤس لندن میں کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں کمیشن مذکور کے نمائندگان کے علاوہ ہندوستان میں متعین مشنری کے پادری بھی دعوتِ خاص پر شریک ہوئے۔ اس میں دونوں نے علیحدہ علیحدہ رپورٹ پیش کی جو کہ "دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا" کے نام سے شائع کی گئی، جس کے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

رپورٹ سربراہ کمیشن سر ولیم ہنٹر

"مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی غیرملکی حکومت کے زیرِ سایہ نہیں رہ سکتے اور ان کے لیے غیرملکی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے، جہاد کے اس تصور سے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ ہے اور وہ جہاد کے لیے ہر لمحہ تیار ہیں۔ ان کی کیفیت کسی وقت بھی انہیں حکومت کے خلاف ابھار سکتی ہے۔"

(مرزائیت نئے زاویوں سے ص ۳۹۷)

رپورٹ پادری صاحبان

یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجائیں، جو ظلی نبوت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہوجائے تو اس کے حلقۂ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہوجائیں گے۔ لیکن مسلمانوں میں سے اس قسم کے دعوے کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی۔ لیکن اب جب کہ ہم برصغیر کے چپے چپے پر حکمران ہوچکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہوگیا ہے، تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے، جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔

اقتباس از مطبوعہ رپورٹ کانفرنس وائٹ ہاؤس لندن۔ منعقدہ ۱۸۷۰ء

(دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا) (ماخوذ)

ان تینوں ذہنوں میں نمایاں فرق یہ تھا کہ پہلا ذہن دنیوی تقاضوں کے ضمن میں دین کو باقی رکھنا چاہتا تھا۔ دوسرا طبقہ دین کے ضمن میں دنیوی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا حامی تھا اور تیسرا ذہن دین اور دنیا کی پوری تقسیم کا ہموا تھا۔ ان تینوں طبقوں میں اسنادی امتیاز صرف دوسرے طبقے کو حاصل تھا۔ یہ حضرات درس و تدریس میں باقاعدہ اسناد اور تزکیہ و تعلیم میں باقاعدہ سلسلوں کے حامی تھے۔

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند، محدثینِ دہلی کے نظر و فکر کی نشاۃ ثانیہ تھی اس کے بانی اور پہلے سرپرست حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں باقاعدہ شریک تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پہلے اور دوسرے ذہن کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے لیے صحتِ عقائد پر سرسید سے خط و کتابت کی، جو انہی دنوں "تصفیۃ العقائد" کے نام سے شائع ہوگئی، پھر ان حضرات کے ارشد تلامذہ اور دیوبند کے پرنسپل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ خود علیگڑھ تشریف لائے۔ حضرت مرحوم اور ان کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمدؒ عثمانی کی تقریروں سے نہ صرف دونوں ذہن ایک دوسرے کے قریب ہوئے بلکہ پہلے طبقے کی کافی حد تک دینی اصلاح بھی ہوگئی، علامہ شبلیؒ اور ندوۃ العلماء کے ذریعہ جو جدید نظریات اسلام کے نام سے سامنے آرہے تھے۔ ان کی اصلاح کے لیے دارالعلوم دیوبند نے خاصی سعی فرمائی، جو تاریخ دیوبند کا بہترین سرمایہ ہے... حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے بلکہ ان کے ارشد خلفاء میں شمار ہوئے۔ مولانا عبدالباری ندوی اور عبدالماجد دریابادی جیسے مغربی علوم کے شناور اکابر دیوبند پر اپنی نظر نچھاور کرنے لگے اور اس کا اثر پھیلتا گیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی جو ندوۃ العلماء کے ناظم، جامعہ اسلامیہ مدینہ (مدینہ یونیورسٹی) کے رکن اور مجلس تاسیسی رابطہ اسلامی کے رکن رکین ہیں، اور آج دنیائے اسلام کے جانے پہچانے مفکر اور اپنی خاص صلاحیتوں کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، وہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ اور قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علیؒ سے خلیفہ مجاز ہوئے۔ علمائے دیوبند کی ان کوششوں

قائل اور پابند ہیں، جو قرآن و حدیث کے سرچشمہ سے فقہ اسلام کے نام پر چلی آئی ہے۔ قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اسی بنا پر مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل و اہتداء کے نور سے خالی ہوں۔

اولو کان آباء ھم لا یعقلون شیئاً و لا یھتدون (پ ۲) ترجمہ: بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ کو جانتے ہوں"

اور سلف اور فقہائے اسلام جو علم و اہتداء کے نور سے منور تھے۔ ان کی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف پیغمبروں ہی کی نہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے رستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں۔ کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم ، صراط الذین انعمت علیھم (پ۱) ترجمہ: اے اللہ! چلا ہمیں سیدھی راہ پر..... راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا"

اس مسلک اعتدال کی وجہ سے علمائے دیوبند دینی بے قیدی اور خود رائی سے بھی محفوظ رہے اور شرک و بدعت کے ابھرے بھی انہیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے۔ ان کے اعمال و افکار سے اسلام کا تسلسل بھی قائم رہا اور کوئی غیر مسلسل نظریہ و عمل دین کے نام سے اسلام میں داخل بھی نہ ہونے پایا۔ یہ حضرات علم و عمل کے تسلسل سے اسلام کے چراغ روشن کرتے گئے اور تاریخ دیوبند پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام واقعی ایک زندہ دین ہے، جو ان حضرات سے لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد سعادت مہد تک مسلسل ہے۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا علامہ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

" اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ علمائے دیوبند کی رو سے امت کے لیے رُوح رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے۔ اس لیے علمائے دیوبند ان کی محبت و عظمت کو تحفظ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، مگر غلو کے ساتھ اس محبت و عقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے۔ ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے۔ کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و رکوع یا طواف و نذر یا منت و قربانی کا محل بنا لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت سید احمد کبیر رفاعی، حضرت شیخ علی ہجویری، حضرت شیخ معین الدین چشتی، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی، اور حضرت الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلوی کے صحیح جانشین اور ان کے فیوض سے زندگی کے خاکوں میں اتباع سنت کا رنگ بھرنے والے یہی بزرگان کرام ہیں ان حضرات کا فیض روحانی اعمال تسخیر سے نہیں، اعمال سنت سے قائم ہے اور یہ حضرات باقاعدہ چشتی، سہروردی، نقشبندی اور قادری نسبتوں سے انتساب رکھتے ہیں۔ بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو حکمت اور تزکیہ نفس کا یہ رستہ اب صرف اسی مسلک کے لوگوں سے آباد ہے۔ یہ حضرات علم و عمل ہر دو ابواب میں اسنادی پہلو قائم رکھتے ہیں۔ بدعات کی روک تھام میں بھی یہ حضرات اسی لیے پیش پیش رہے کہ ان کے

اسنادِ سلف کے اثرات

جن حضرات نے علم و عمل کے چراغ سلف کے اسناد سے روشن کیے ہوں ان کے ذمے سلف کا دفاع لازمی ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کے مکلف ہیں کہ اپنے اسلاف کے عمومی کردار کو ہر دور میں بے داغ اور آئندہ نسلوں کے لیے بمنزلہ چراغ ثابت کرتے چلے آئیں۔ اس کے بغیر اسلام ایک مسلسل حقیقت نہیں رہتا۔ اور نہ اسے ایک زندہ مذہب کہا جا سکتا ہے۔

اسلام کے اس تسلسل کا آغاز صحابہ کرامؓ سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پاک و ہند کی علمی و عملی فضا میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ ہمارے بعض دوست اس زنجیر کی پہلی کڑی کو کمزور بتاتے ہیں اور جن چند نفوس کا اقرار کرتے ہیں انہیں بھی حکمت عملی (یا تقیہ) اور خاموشی کی چادر اوڑھا دیتے ہیں اور دوسرے بعض حضرات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان مثل شاہ اسماعیل شہیدؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ محدثین دہلی پر اعتراض کرتے ہیں اور گو ان کے ایک بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ علمائے متاخرین شاہ اسماعیلؒ کو کافر نہ کہیں اسی میں سلامتی ہے مگر ان کی اس خاندان سے مخالفت پھر بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ محدثین دہلی کے پیرو تحریک خلافت میں ترکوں کے ساتھ تھے لیکن یہ بزرگ اور ان کے ساتھی ترکوں کی مخالفت میں کام کرتے رہے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ علمائے حق اسناد دین کے دفاع میں صحابہؓ پر تنقید اور مخالفت بھی روکیں اور محدثین دہلی کی بھی عمومی صفائی پیش کریں کیونکہ اسناد کی یہی کڑیاں انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتی تھیں۔ اور اسلام کا تسلسل انہی حضرات سے قائم تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو صحیح اسلام کے اسناد سے یوں بے نیاز ہوگئے کہ انہوں نے اس لڑی کے اعلیٰ ترین افراد صحابہ کرامؓ سے بھی ایک بڑا منصب (نبوت) اپنے گھر میں تجویز کر لیا، اور مرزا صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ ہر حدیث جو میری وحی کے خلاف ہو قابل قبول نہیں۔ چودھری غلام احمد پرویز نے پرانے اسلام سے بغاوت کر کے نیا "طلوع اسلام" جاری کر لیا۔ دینی نظریات کی اس کش مکش میں علمائے دیوبند مکمل طور پر صحابہ کرامؓ سے لے کر محدثین دہلی تک اسناد اسلام کی ہر کڑی سے پورے وفادار رہے اور سلف صالحین کی اتباع کی یہاں تک پابندی کی کہ چھوٹی سے چھوٹی بدعت کو بھی دین نہ بننے دیا۔

دنیا نے اپنے آپ کو بدلا گھڑی گھڑی

اک اہلِ عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

تسلسل اسلام اور اسناد دین کو کمزور کرنے والے ان مختلف طبقوں سے ان اکابر نے اگر کوئی اختلاف کیا تو یہ اس لیے نہیں کہ وہ اختلاف پسند تھے یا انہیں کسی طبقے سے کوئی ذاتی بغض تھا بلکہ محض اس لیے کہ اسلام جس مبارک سلسلے سے ہم تک پہنچا ہے اس سے پوری وفا کی جائے۔ ان کے الحادی یا بدعی نظریات کی تخریب و تردید اس لیے ضروری تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی تعمیر اور بقا کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن ان کی یہ تردید بھی اصولی رہی اور اسکا انداز جدل احسن رہا جس کی تعلیم

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز مولانا قاضی مظہر حسین صاحب امیر انجمن خدام اہل السنۃ جو اپنے والد ماجد مولانا کرم دین دبیر مصنف آفتاب ہدایت کی نسبت سے بھی دفاع صحابہ میں پورے مجاہد ہیں۔ اس میدان میں ربع صدی سے خدمات جلیلہ سر انجام دے رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو خاصی شہرت رکھتی ہیں۔

حضرت مدنیؒ کے شاگرد مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری اور مولانا عبدالستار تونسوی اس وقت پوری قوم کو اسلام کی شاہراہ مسلسل کی دعوت دے رہے ہیں اور اس شاہراہ کے پہلے تلنگے کا پورا دفاع کر رہے ہیں مولانا نور الحسن شاہ بخاری تنظیم اہل السنۃ کے قیام میں سردار احمد خاں پتافی رئیس اعظم جام پور ضلع ڈیرہ غازیخاں کے دائیں بازو تھے سالہا سال یک ہفت روزہ دعوت لاہور کے مدیر رہے اور دفاع صحابہ پر عظیم اور تاریخی خدمات سرانجام دیں مولانا تونسوی دفاع صحابہ پر صف اول کے مناظر ہیں اور رب العزت نے انہیں ہر میدان میں عجیب فتح و نصرت سے نوازا ہے حضرت مدنیؒ نے اپنے تلامذہ میں عظمت صحابہ اور دفاع صحابہ کی وہ روح پھونک رکھی ہے کہ جو بھی جہاں کہیں ہے شاہراہ اسلام کے اس ہراول دستے کی مدح میں مصروف ہے اور قوم کو اسی کے نقش قدم پر آنے اور چلنے کی دعوت دے رہا ہے۔

عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ

اس عظیم شاہراہ اسلام پر ایک اور یلغار ہوئی ایک بڑا فتنہ انکار ختم نبوت پیدا ہوگیا اور انگریز کی خانہ ساز نبوت کے داعی یورپ اور بلاد افریقہ میں تبلیغی مشن کے حسین عنوان سے مسلمانوں کو ارتداد کی دعوت دینے لگے علماء حق نے مسلمانوں کو اس فتنے سے خبردار کیا سرخیل اکابر دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے خلفاء حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کو اس طرف متوجہ فرمایا پیر صاحب حجاز ہجرت کے ارادہ سے آئے تھے۔ حضرت حاجی صاحب مرحوم کی نظر بھانپ رہی تھی کہ حضرت گولڑوی کو مرزا غلام احمد کے مقابلہ میں کام کرنا ہے۔ آپنے پیر صاحب کو واپس ہندوستان جانے کا امر فرمایا شیخ الہند کے شاگرد امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مناظر اسلام مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا محمد عالم آسی امرتسری اور مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ میدان میں نکلے اور ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں عربی اور فارسی میں کتابیں لکھ کر دوسرے ممالک کو بھی اس فتنے سے خبردار کیا اور پھر شاہ صاحب کے شاگرد حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری نے پوری قوت سے فتنہ انکار ختم نبوت کا مقابلہ کیا اور عقائد اسلام کے تحفظ کے لیے مسلمانان ہند اور دیگر مسلم ممالک کو وہ علمی اور تحقیقی مواد مہیا کیا کہ منکرین ختم نبوت دم بخود رہ گئے مولانا مناظر احسن گیلانی کے شاگرد رشید پروفیسر الیاس برنی کی کتاب قادیانی مذہب اب بھی قادیانی نظریات کا انسائیکلو پیڈیا سمجھی جاتی ہے۔

شیخ الہند کے شاگردوں میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ مسائل فقہیہ میں شیخ کے مسلک پر نہ تھے لیکن ختم نبوت کے لیے آپ کے ارشاد پر جان چھڑکتے تھے حضرت شیخ الہند نے مولانا امرتسری کے ذریعہ اہل حدیث کے پورے حلقے میں مرزائیت کے خلاف بیداری پیدا کر دی اور مولانا امرتسری نے مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ اور مولانا محمد داؤد غزنویؒ کو بھی اس پلیٹ فارم پر لاکھڑا کیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء

میدان تبلیغ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شعلہ نوائی سے نصف صدی کے قریب گرم رہا شاہ صاحب آخر دم تک مرزائیت کے خلاف نبرد آزما رہے اور ان کے سروں پر تیغ براں بن کر لٹکتے رہے آپ کے بعد مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا محمد علی جالندھری نے اس مورچے کو سنبھالا اور اپنی زندگی اس محاذ پر لگا دی ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں صدر مولانا ابوالحسنات خطیب جامع مسجد وزیر خاں لاہور تھے مگر موصوف میں ولولہ پیدا کرنے والے اور انہیں اس صدارت کے لیے تیار کرنے والے خود مولانا عطاءاللہ شاہ بخاریؒ تھے اور تحریک کی زمام کار حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھی جب وہ وقت قریب آیا کہ مرزائیت قانونی طور پر بھی غیر مسلم اقلیت قرار پائے تو اللہ رب العزت نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر کے طور پر محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا انتخاب فرما لیا۔ پھر ۱۹۷۴ء میں تمام مسلم جماعتوں نے حضرت مولانا بنوری کو مجلس عمل کا صدر منتخب کیا ملک میں ہمہ گیر تحریک چلی۔ پاکستانی قومی اسمبلی نے مرزائیوں کو قانونی طور پر مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا ..... اور تحفظ ختم نبوت کا جو کام حاجی امداد اللہ اور علامہ انور شاہ کے الف سے شروع ہوا مولانا یوسف بنوری کی یا پر پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب خدام دیوبند مختلف ممالک میں ختم نبوت کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

علمائے دیوبند نے اس محاذ پر نہ صرف عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ کیا بلکہ اسلام کے جملہ وہ مسائل جن پر قادیانی الحاد کا آرہ چل رہا تھا ان کا پورا دفاع کیا حرمت جہاد، مسیح ہندوستان میں، وفات مسیح اور منبع خوارق عادات کے خلاف کام کیا مسلمانوں کو اسلام کی شاہراہ مسلسل سے جوڑا اور یہ ان کی قربانیوں اور محنتوں کا فیضان ہے کہ امت ان مسائل میں ابھی تک شاہراہ اسلام پر گامزن ہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اہل باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ تیغ بے نیام رہے اور انہیں جہاں اور جب کہیں پتہ چلا کہ کوئی اسلام میں رخنہ اندازی کر رہا ہے اور ملت اسلامیہ کو سلف صالحین کے ساتھ جوڑے رکھنے کی بجائے توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایسا کرنے والے بزعم خود و مریداں امت کی ایسی رہبری کر رہے ہیں کہ پوری تاریخ میں ملت کو ایسا عالی دماغ قائد و رہنما میسر نہیں آیا تو حضرت مولانا اس کے سامنے بلا خوف و لومۃ لائم سینہ سپر ہوگئے۔ اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ فتنۂ انکار حدیث پر ضرب کلیمی کی ضرورت ہے تو انہوں نے صاف اور واشگاف الفاظ میں ایک جلسہ عام میں اعلان فرمایا کہ جو حدیث کا منکر ہے وہ قرآن کا منکر

ہے اور قرآن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی علمائے ربانی خاموش نہیں تھے۔ حضرت لاہوری کے اس نعرہ رستاخیز کے بعد ملک اور بیرون ملک کے ہر فرقہ و خیال کے علماءؒ کے دستخطوں سے ایک ضخیم جلد شائع ہوئی جس میں حضرت مولانا کے اس خیال کی مکمل تائید کی گئی اور اس پر اجماع امت ہوگیا کہ حدیث کے منکر کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور اب اس سلسلے میں مولانا سرفراز احمد خان صاحب صفدر شیخ الحدیث مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ردِ بدعت و شرک

اتباع سنت اور حدیث کا انکار کرنے والا گروہ "مرکز ملت" کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کرکے قرآن کی تعبیر و تشریح کا اختیار اسے سونپ دیتا ہے کہ یہ نام نہاد مرکز ملت زمانے کے تقاضوں اور امنگوں کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات۔ صحابہؓ کے فیصلوں اور اجماع امت کے مسائل سے قطع نظر کرکے جو چاہے فیصلہ کر دے ایک دوسرا گروہ ایسا ہے جو زبانی کلامی محبت وعشق رسول کا بہت دعویدار ہے اور اپنے سوا تمام طبقات امت کو قابل گردن زدنی اور دنیا کے ہر کافر و مشرک سے بدتر سمجھتا ہے لیکن عملاً اس کا حال یہ ہے کہ شریعت کے پُرنور چہرے کو مسخ کرکے دین میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے اور جب ٹوکا جاتا ہے تو "ثواب کا کام ہے، کیا حرج ہے"۔ ان جیسی باتیں کہہ کر اپنی وضع کردہ رسوم و بدعات کو اسلام میں داخل کرتا اور من گھڑت افکار کو شریعت قرار دیتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں اپنے ان رسوم و رواج کو دین و شریعت کا جزو بنانے کے لیے بے معنی دلائل کا انبار لگا دیتا ہے ایسے رسوم و رواج کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعت قرار دیا ہے اور بدعت ایسی برائی ہے کہ جس کا چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی کے لیے نیا دین اختیار کرنا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر خطبہ میں بدعت کی برائی بیان فرمایا کرتے تھے آپؐ کے بعد صحابہؓ سے لے کر آج تک علمائے حقانی نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ رد بدعت پر مرکوز رکھا کیونکہ اسی سے شرک کی راہ نکلتی تھی۔ جانشینان محدثین دہلی نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہید بریلویؒ نے اس بارے میں بہت مضبوط موقف اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بدعتیوں کی نظر میں سب سے زیادہ یہی دو افراد کھٹکتے ہیں۔ ان حضرات کے بعد اکابر دیوبند کی باری آئی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمدؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے شرک و بدعت کے رد میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔ ماضی قریب میں مولانا حسین علی (واں بھچراں) اور مولانا مرتضےٰ حسن چاندپوری نے اس فریضہ کو بطریق احسن ادا کیا۔ مولانا محمد منظور نعمانی سالہا سال اس میدان میں کام کرتے رہے اور آج کل ان سب کی جانشینی کا حق تحریری طور پر سرفراز احمد خان شیخ الحدیث مدرسہ عربی نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سرانجام دے رہے ہیں اور حق یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر انہوں نے قابل قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے کتاب و سنت کی راہیں واضح اور کشادہ نظر آتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم میں اثر رکھا ہے چنانچہ تھوڑے عرصہ میں ان کی اکثر کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

قافلہ اسلام کے ان کارکنوں کی نظر مخالفین کی مخالفت کی بجائے اصل اسلام کی اشاعت پر مرکوز رہتی ہے مخالفت یہ صرف رستے کی چھیڑ ہے جسے خدام دیوبند پسند نہیں کرتے۔ ہاں گلے پڑ جائے تو پھر اس سے گریز بھی نہیں کرتے پھر یہ حضرات ایسے کج رو انسانوں کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دیتے ہیں اور صدق کی تلوار حق کا جلال بن کر چمکتی ہے اس کا مقصد بھی مخالف کی تذلیل نہیں متوارث اسلام کی دفاع ہے کیونکہ اسناد اسلام کی کڑیاں اپنی اپنی جگہ لائق تحفظ ہیں۔

رد بدعت میں داعیہ اہتمام

بدعت کو لفظ سنت کے مقابلہ میں ہے جس طرح سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک مسلسل پہنچتی ہے بدعت اس سے پہچانی جاتی ہے کہ اس میں تسلسل نہیں ہوتا اہل بدعت سے جب کسی عمل پر اس کے تسلسل کا حوالہ پوچھا جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر جان چھڑاتے ہیں کہ اس میں حرج کیا ہے؟ اہل بدعت کا نظریہ یہ ہے کہ اعمال سلامی میں تسلسل ضروری نہیں اسلام میں نئے طریقے داخل کرنے کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔

مولانا احمد رضا خان نے فتاوے افریقہ صہ۱۱۲ میں تصریح کی ہے کہ باب احداث کشادہ ہے ظاہر ہے کہ وہ بزرگ جو مسلسل اسلام پر رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہ مسلسل اسلام کی تعلیم دینے کے حامی ہیں وہ مولانا احمد رضا خان کا ساتھ نہ دے سکتے تھے انہیں سنت اسلام ہر مصلحت سے زیادہ پیاری تھی۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بتلاتی ہے کہ یہ حضرات اسلام کی سنت قائمہ کے حامی اور بدعت سے بہت دور تھے۔ اور وہ اپنے کسی عمل کو جو شاہراہ مسلسل سے نہ آئے وہ اسلام کا نام دینے کے لیے تیار نہ تھے پس رد بدعت میں ان حضرات کا موقف اسلام کی سنت قائمہ سے وفاداری تھی اہل السنۃ والجماعۃ وہ حضرات ہیں جو اسلام کی سنت قائمہ سے وابستہ اور جماعت صحابہؓ کے نقش پا سے دین کی راہیں تلاش کرنے والے ہوں اور احداث کشادہ (بدعت کا دروازہ کھلا ہے) کہہ کر بدعت کو فروغ نہ دیں۔ بدعت کا دروازہ کھلا رکھنے سے تفریق بین المسلمین لازمی ہوگی کیونکہ بدعات ہر ایک گروہ کی اپنی اپنی ہوں گی یہ فقط سنت ہے جو تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے اور ملت واحدہ بنا کر رکھ سکتی ہے۔ پس بدعت کے رد میں مذکور الصدور حضرات کا اہتمام کوئی منفی داعیہ نہ تھا بلکہ اسلام کی شاہراہ سے مخلصانہ عقیدت تھی۔

عصری تقاضوں میں احساس ذمہ داری

علم و تحقیق اور تزکیہ و تدریس تک ہی نہیں اکابر دیوبند نے نئے نئے پیش آمدہ حالات میں ملت کی ہر قدم پر راہنمائی کی ہے۔ جس طرح فروعی مسائل میں ائمہ مجتہدین میں اختلاف ہوا اسی طرح خالصتہً سیاسی مسائل میں ہر دور میں نظریاتی اختلاف پایا گیا ہے برصغیر میں بھی یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہوا اکابر دیوبند کا ایک وقیع گروہ اگر کانگریس کے ساتھ اتحاد و اشتراک کو ملک و ملت کیلئے مفید خیال کرتا تھا تو دوسرا وقیع گروہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم اور کانگریس سے عدم اشتراک و اتحاد کا مؤید تھا پہلے گروہ کے قائد حضرت مولانا

سید حسین احمد مدنی اور دوسرے کے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تھے اور دونوں گروہوں کا یہ اختلاف مبنی بردیانت تھا اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے دلائل تھے۔ کتنا تاریخی حقائق کا منہ چڑاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تمام خدام یا متعلقین کانگریس کے مؤید تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی علی الاعلان حمایت کی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کے لیے مفید اور بہتر قرار دیا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے پاکستان کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قائد اعظم کے بعد تصور پاکستان کے خاکہ میں رنگ بھرنے کا سب سے مؤثر عمل حضرت علامہ ہی کا تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ نے قرار داد پاکستان میں بیان جاری فرمائے۔ جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد رکھی، مضامین لکھے، پرزور تقاریر کیں۔ پیرانہ سالی میں ہمت کو جوان کرکے قائد اعظم کا پورا پورا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی فضائیں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر آفرین خطابت کا جواب مسلم لیگ کے پاس شیخ الاسلام کی وجد آفرین زبان تھی۔ اور یہ سابق صوبہ سرحد اور سلہٹ (مشرقی پاکستان) کا ریفرنڈم تو شیخ الاسلام نے جیتا تھا۔ حضرت علامہ پاکستان کی حمایت میں نہ نکلتے تو آج یہ علاقے بھی ہندوستان کے پاس ہوتے۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ کی پاکستان میں شمولیت محدث دیوبند کا پاکستان پر احسان عظیم ہے۔ حلقہ دیوبند سے حضرت علامہ ہی پاکستان کی حمایت میں نہیں نکلے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی، حکیم الامت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ اور حکیم الامت کے دوسرے سب خلفاء پاکستان کے حامی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے چار بڑے عہدیداروں (سرپرست، صدر مہتمم، صدر مدرس، مہتمم) میں سے تین مسلم لیگ کے ہم خیال تھے۔ سرپرست حکیم الامت حضرت تھانوی تھے۔ صدر مہتمم شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانی تھے اور مہتمم حکیم الاسلام قاری محمد طیب دامت برکاتہم تھے صدر مدرس شیخ الحدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کانگریس میں تھے۔

ہمیں ان دوستوں پر بہت افسوس ہے جو پاکستان کی مخالفت میں تو دیوبند کا ذکر کرتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں اکابر دیوبند کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا حالانکہ ان اکابر کی خدمات کے بغیر پاکستان کی تعمیر کسی طرح ممکن نہ تھی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا اختلاف بھی مسلمانوں کے سودے پر نہیں دیانت پر مبنی تھا۔ انکا خیال تھا کہ مسلمان وہ قوت ایمان اور ہمت عمل رکھتے ہیں کہ متحدہ ہندوستان میں کبھی مغلوب نہ رہیں گے ایک تہائی کے قریب تعداد اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر یہ خدا کے ہوکر رہیں اور محمد بن قاسم، سلطان محمودؒ غزنوی وغیرہم حضرات کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرلیں تو ہندو کثرت انکا کچھ نہ بگاڑ سکے گی اور اگر ایمانی جذبہ مفقود رہا، بے عملی و الحاد نے راہ پکڑ لی تو پھر ایک علیحدہ ملک لے کر بھی ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ حضرت مولانا مدنی مسلمانوں کو اپنے آئینہ میں دیکھتے تھے مگر حضرت تھانوی انہیں حالات کے آئینہ میں اور ان کی عملی کوتاہیوں کو دیکھ رہے تھے بہرحال

اس سے انکار نہیں کہ حضرت مدنیؒ کا اختلاف کسی غرض پر نہیں دیانت و خلوص پر مبنی تھا چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم لیگ کے جلسوں میں فرمایا کہ مجھے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پورا سیاسی اختلاف ہے مگر مجھے ان کی دیانت پر کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا۔ واقعی بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں یہ حقیقت ہے کہ دیوبند کے ایک حلقے میں اگر کانگریس کی حمایت تھی تو دوسرا حلقہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں علی الاعلان مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے تمام خلفا بھی پاکستان کے حامی تھے۔

اس تفصیل سے یہ بات مکمل کر سامنے آجاتی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی مخالفت میں حضرت مولانا مدنیؒ کے اسم گرامی کو اچھالتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ انہیں اصولاً اس وقت کے سیاسی اختلافات سے دلچسپی نہیں بلکہ علماً کے خلاف ایک اندرونی بغض ہے جس کو یہ لوگ وقتاً فوقتاً اُگلتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے بے رحم اندازِ گفتگو سے محتاط رہنا چاہیے۔ علمائے دین کے خلاف اس قسم کے خیالات دین سے بیزاری کا ایک نیا عنوان ہے۔

قراردادِ مقاصد

پاکستان بننے کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلمانوں سے کئے گئے اس وعدے کو پورا کیا کہ پاکستان کا دستور قرآن و سنت پر مبنی ہوگا اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے قراردادِ مقاصد پاس کرائی جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہوگا اور اس کے قوانین شریعت اسلامیہ پر مبنی ہوں گے۔ شیخ الاسلامؒ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور بڑی محنت سے قرارداد مقاصد پاس کرائی مگر افسوس کہ مولانا کی وفات کے بعد ملکی قیادت کے مدوجزر نے اس قرارداد کو بھی ایک یادگار ماضی بنا کر رکھ دیا حالانکہ یہ قرارداد پاکستان کی روح تھی اور اسی مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

تعلیماتِ اسلامی بورڈ اور شریعت کی قانونی دفعات

خان لیاقت علی خان مرحوم نے شیخ الاسلام کے ارشاد کے مطابق تعلیمات اسلامیہ کا ایک بورڈ قائم کیا جو شریعت کی روشنی میں پاکستان کی قانون سازی کرے اور پھر یہ سفارشات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوں۔ بعض اعیان حکومت کا خیال تھا کہ علمائے اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانونی جزئیات مرتب نہ کر سکیں گے اور روایات کے اختلاف میں اُلجھ کر رہ جائیں گے مگر علمائے دیوبند نے وقت کے اس چیلنج کو بھی قبول کر لیا اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت علامہ سید محمد سلیمان ندویؒ خلیفہ خاص حضرت حکیم الامت تھانویؒ جو اس بورڈ کے ممبران میں سے تھے۔ انہوں نے اس بیدار مغزی، روشن خیالی اور وسعت نظر سے اسلام کی قانونی جزئیات مرتب کیں کہ حکمران طبقے کے لیے اعتراض کا کوئی موقع نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ قانونی مسوّدات کو سرخ فیتے سے باندھ رکھیں اور دستور ساز اسمبلی تک پہنچنے ہی نہ دیں ہمیں اس وقت اس کی علت و غایت سے بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتلانا ہے کہ علمائے دیوبند نے وقت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہر مرحلہ پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکابر علمائے اسلام نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی بھی

پوری صلاحیت رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ اجتہاد آزاد نہ ہو پچھلے مجتہدین کرام کے بیان کردہ اصولوں کے ماتحت ہو اور اس کا مقصد بھی نئے مسائل کا حل ہو، پہلے فیصلوں کی تردید وتنقیص نہ ہو۔ اس قسم کے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ نئے اجتہاد کا مطلب پچھلے مجتہدین کی تغلیط نہیں۔ پچھلے ذخیرۂ اجتہاد پر ایک ضروری اضافہ ہے۔ علمائے دیوبند نے اس قسم کے اجتہاد کو کبھی منع نہیں کیا ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی اجازت انہی لوگوں کو ہو جو اس کے اہل ہوں اور پچھلے فقہاء و مجتہدین کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں۔

اسلامی دستور مملکت کی مساعی

پاکستان ایک مسلم جمہوری مملکت ہے۔ یہاں ہر مکتبِ فکر کے مسلمان رہتے ہیں۔ ہر ایک کی فکر اور فقہ جدا ہے۔ شیعہ لوگوں میں اکثریت اثنا عشری فرقے کی ہے۔ اہل سنت کے بڑے بڑے گروہ دیوبندی اور بریلوی ہیں۔ اہل حدیث کے ہم خیال بھی کافی موجود ہیں۔ مولانا مودودی کے ہم مسلک بھی کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں۔ ان تمام مکاتبِ فکر میں کوئی ایسا مکتب نہیں جس پر دوسرے سب مکاتب جمع ہو جائیں۔ ہر ایک کے اپنے اصول ہیں اور اپنے مسائل ہیں۔ ان میں سے جو جماعت بھی نفاذِ شریعت کے لیے آگے بڑھے گی دوسری جماعتیں اسے اپنے مسلک کے لیے خطرہ سمجھیں گی۔ گو وہ جماعت دوسرے مکاتبِ فکر کو کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائے کہ اسلامی قانون سازی کے وقت ہر مکتبِ فکر کی فقہ کا پورا احترام کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی اسی قسم کی ہوگی جیسے کانگریس مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان آزاد ہونے پر ہر بسنے والے کے حقوق پورے رہیں گے۔ لیکن مسلم لیگ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اقتدار پر قبضہ ہونے کے بعد مسلمان انہی کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اسی طرح مسلمانوں کا ہر مکتبِ فکر نظامِ اسلامی کے قیام کی باگ کسی ایک مکتبِ فکر کے ہاتھ میں دینا اپنے لیے خطرناک سمجھتا ہے۔ مبادہ وہ لوگ اقتدار پر آکر ان کی فکر و فقہ کو نظرانداز کر دیں۔ جماعت اسلامی اگرچہ اپنے آپ کو تمام فرقوں سے بالا سمجھتی ہے اور گروہی تعصبات سے دور رہنے کا اعلان کرتی ہے۔ لیکن عملاً وہ مولانا مودودی کی مساعی سے ایک ایسا فرقہ بن چکی ہے جس کو ہر فرقے سے تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ جماعت کی اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے ارکان اور متفقین وغیرہ زیادہ تر مولانا مودودی کا مسلک رکھتے ہیں مگر اس ایک مکتبِ فکر کے ساتھ وہ تمام مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب یہ بات سامنے آتی ہے تو مولانا مودودی کی یقین دہانی پھر وہی رنگ اختیار کرتی ہے جو کانگریس کے لیڈر اختیار کرتے تھے۔ ان حالات میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور مملکت اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے یہاں کے رہنے والے تمام مکاتبِ فکر مشترکہ کمان سے نہ چلیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان علیحدہ علیحدہ ہر مکتبِ فکر کے افراد کو اپنے ساتھ کھینچتے ہیں لیکن ان کے مکاتبِ فکر کو ان کی نمائندہ حیثیت میں کبھی انہوں نے دعوت نہیں دی اور نہ انہوں نے دوسرے تمام مکاتبِ فکر کی کبھی کوئی مشترکہ میٹنگ بلائی ہے۔ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے لیے وہ کسی مشترکہ قیادت کے قائل نہیں۔[1]

---

[1] امیر جماعت اس دور میں داعی اسلام کہلاتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ داعی اسلام بنے جا رہے گا کہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں

باقی صفحہ ۲۱ پر

علمائے دیوبند اس اصول ضرورت سے پوری طرح باخبر تھے۔ نظام اسلامی سے گریزپائی کرنے والے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو نظام اسلام کے نفاذ کا ایک بہانہ بنا رہے تھے۔ علمائے دیوبند نے اس مغرب زدہ طبقے کا چیلنج بھی قبول کیا اور کراچی میں مختلف مکاتب فکر کے علما کی ایک مشترکہ میٹنگ بلائی۔ جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ تمام مکاتب فکر کے اکابر شامل ہوئے مولانا مودودی نے اپنے مکتب فکر کی نمائندگی خود کی۔ اکتیس علما کی یہ نمائندہ میٹنگ بلانے کا سہرا علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کے سر بندھا۔ کافی بحث وتمحیص اور محنت و عرق ریزی کے بعد وہ مشترکہ دستوری خاکہ تیار ہوا۔ جس پر تمام مکاتب فکر متفق ہوئے۔ یہ اکتیس علما کا تاریخی فیصلہ کہلاتا ہے اور بارہا چھپ چکا ہے اور ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے جو فرقہ وارانہ اختلاف کی آڑ میں اسلامی نظام زندگی سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ علمائے دیوبند کا یہ تاریخی کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک مثال رہے گا۔ ہمیں اس وقت اس کی تفصیلات سے بحث نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرزمین پاک وہند میں مسلک دیوبند ہی ایسا معتدل مسلک ہے جس کے علما نے باہمی اختلاف کو کم کرنے اور مشترکہ ملی ضروریات کے موقعہ پر مختلف مکاتب فکر کو جوڑنے کی پوری مخلصانہ کوشش کی ہے۔

عائلی قوانین اور علمائے حق

عائلی اختلافات و مسائل پر حکومت پاکستان نے ایک عائلی کمیشن مقرر کیا جو یہ رپورٹ پیش کرے کہ عائلی قوانین کو کس طرح کتاب وسنت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ اس کمیشن میں مولانا احتشام الحق تھانوی بھی ایک رکن تھے، لیکن اس کے باقی ارکان مغرب زدہ تھے۔ انہوں نے اپنی جو رپورٹ مرتب کی اس میں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کے عنوان سے ایسی تجاویز پیش کی گئیں جو سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی تھیں۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس پر اختلاف کیا اور اپنا ایک مفصل اختلافی نوٹ لکھا جو کتاب وسنت کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔ خود اعیانِ حکومت میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو اسلام کے نام سے غیر اسلامی قانون کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس اختلاف کو اہمیت نہ دی۔ عائلی سفارشات جو منظوری کے درجہ میں تھیں، لیکن ان کا نفاذ نہ ہوا تھا کہ مارشل لا کا نفاذ ہوگیا۔ اور مارشل لا کے سائے میں ان سفارشات کو ایک آرڈی نینس کے ذریعہ قانون کی شکل دے دی گئی اور اس کی دفعات قوم کے سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ بعض امور میں صریحاً قرآن وسنت

بقیہ ص ۲

نے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف مسلم فرقوں کو یکجا کرنے کے سلسلے میں آج تک کیا کیا۔ تحریری طور پر تو وہ سبق دیتے ہیں کہ میں امت مسلمہ کو یکجا کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں اور اسی نعرے کی بدولت شروع شروع میں ہندوستان کے بعض بڑے علمانے اس آواز پر لبیک کہی اور کئی اکابر نے ان کی تحسین بھی کی جس کو آج بھی جماعتِ اسلامی اچھالتی ہے، لیکن علاوہ بعض اجتہادی مسائل اور بعض دوسرے امور میں پوری اُمت کے مجددوں پر تنقید کر کے اہل سنت والجماعت کے تمام فرقوں سے ایک علیحدہ فرقہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اسلامی نظام جو اصل مقصد ہے اس کے لیے تو وہ مشترکہ قیادت کے قائل نہیں لیکن جمہوریت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی بھی قیادت قبول کرتے ہیں اور نوابزادہ نصر اللہ خاں کی بھی۔ ع این چہ بوالعجبی است (ارشد)

از حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند۔

مختصر تاریخ

دار العُلوم دیوبند

تیرھویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل ہو چکا تھا، صرف اُٹھتا ہوا دھواں رہ گیا تھا جو چراغ بُجھ جانے کا اعلان کر رہا تھا۔ دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا۔ صرف ڈھول کی منادی میں "ملک بادشاہ کا" رہ گیا تھا۔ اسلامی شعائر رفتہ رفتہ روبہ زوال تھے۔ دینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو رہی تھیں۔ علمی خانوادوں کو بیخ دین سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ دینی شعور رخصت ہو رہا تھا اور جہل و ضلال مسلم قلوب پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ مسلمانوں میں پیغمبری سُنتوں کی بجائے جاہلانہ رسوم و رواج، شرک و بدعت اور ہوا پرستی وغیرہ زور پکڑتے جا رہے تھے۔ مشرقی روشنی چھپتی جا رہی تھی اور مغربی تہذیب و تمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا ــــــ جس سے دہریت و الحاد، فطرت پرستی اور بے قیدیٔ نفس، آزادیٔ فکر اور بے باکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جس سے نگاہیں خیرہ ہو چلی تھیں۔ اسلام کی جیتی جاگتی تصویر بیمار آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی تھی اور اتنی دھندلی کہ اسلامی خد و خال کا پہچاننا بھی مشکل ہو چکا تھا، چمن اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ خوش آواز اور شیریں ادا پرندوں کے زمزمے مدھم ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ زاغ و زغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی اور اسی قسم کے اور ہزارہا حوادث اور المناک واقعات کے چند اجمالی عنوانات ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی سموم فضا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

اندکے با تو بگفتیم و بدل ترسیدیم ۔۔۔ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی، اسپین کی تاریخ دہرانے کے لئے کمربستہ ہو چکا ہے کہ اچانک چند نفوسِ قدسیہ نے بالہام خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستہ سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم و تربیت کے راستہ سے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کر کے اُن کی بقاء کا سامان کیا جائے اور اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے جس میں علوم نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے جس سے ایک طرف تو مسلمانوں

کی داخلی راہ نمائی ہو اور دوسری طرف خارجی مدافعت۔ نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایمان دارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ ان مقاصد کے لئے کمر باندھ کر اٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے راہنما اور لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے اور ان کی یہ باہمی گفت وشنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلۂ خیال نہ تھا بلکہ تبادلۂ الہامات تھا۔ جیسا کہ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند سے سُنا کہ وقت کے ان تمام اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ وبقاء کی واحد صورت قیام مدرسہ ہے چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظ دین ومسلمین کے لئے اب ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ کا قیام ضروری ہے۔ کسی نے بہت صریح لفظوں میں کہا کہ مجھے منجانب اللہ الہام کیا گیا ہے کہ ان حالات میں تعلیم دین کا ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلۂ واردات کے بعد قیام مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالم غیب کا ایک مرکب اجماع تھا جو قیام مدرسہ کے بارہ میں منجانب اللہ واقع ہوا۔

اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی۔ وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی۔ جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا جس کے تدارک کی فکر تھی وہ پورے ملک پر پڑ رہا تھا اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ کی تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی بلکہ اس میں عالمگیری پنہاں تھی۔ گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی، مگر اس وقت اس میں ایک تناور شجرۂ طیبہ لپٹا ہوا تھا جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں ان نفوس قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ تھے جنہوں نے اس غیبی اشارہ کو سمجھا اور اُسے ایک تجویز کی صورت دی۔

بنائے دارالعلوم

کچھ وقت گذرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۲ھ

مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دارالعلوم کی بناء رکھ دی گئی

بناء رکھنے کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی۔ اس بناء میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ قابلِ ذکر ہیں جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تاسیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے دست و بازو رہے ہیں اور بناء کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رکین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔ بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلسِ خیر کے رکن رکین ہوئے اور بالآخر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد و ایماء پر دارالعلوم کے عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے اور آپ کا عہدِ اہتمام خیر و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ دارالعلوم کی معنوی بناء کے لئے تو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے آٹھ اصول تحریر فرمائے۔ جو اس ادارہ میں تمام قوانین کے لئے اساس و بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ اصول عملی تجویز فرمائے جو اس ادارہ کے نظم و انتظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ دونوں بزرگوں کے اصولِ ہشتگانہ درج ذیل ہیں جو اس دارالعلوم کی حکمتِ عملی اور نظم و انتظام کی اساس ہیں۔

دارُالعُلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں ایک انار کا درخت ہے۔ اسی درخت کے نیچے سے آبِ حیات کا یہ چشمہ پھوٹا اور اسی چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کردی اور دوسری طرف اس کی تیز و تند رَو نے شرک، بدعت، فطرت پرستی، الحاد و دہریت اور آزادیٔ فکر کے ان خس و خاشاک کو بھی بہانا اور راستہ سے ہٹانا شروع کردیا جنہوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جڑ پکڑ کر انہیں یہ روزِ بد دکھایا تھا۔ بانیٔ دارالعلوم کا یہ خواب کہ "میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطرافِ عالم میں پھیل رہی ہیں" پورا ہوا اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ کا یہ خواب کہ "علوم دینیہ کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں"، خواب ہی نہ رہا بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہوگیا۔

اور اس مدرسہ کے ذریعہ ان چابیوں نے ان قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے جن سے علم کے سوتے ہر طرف سے پھوٹنے لگے اور چند نفوس قدسیہ کا علم آن کی آن میں ہزارہا علماء کا علم ہوگیا۔ حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ دیوبند سے گذرتے ہوئے جب اس مقام پر پہونچے تھے جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ مجھے اس جگہ سے علم کی بُو آتی ہے"۔ پس وہ خوشبو جس کو سید صاحب کی روحانی قوتِ شامہ نے سونگھا تھا ایک سدابہار گلاب کے پھول، بلکہ گلاب آفریں درخت کی شکل میں آگئی جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اُجڑا ہوا چمن تختہ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بنے گی، بیج سے کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گی، پھول سے گلدستہ بنے گی اور اس گلدستہ کی خوشبو سے سارا عالمِ انسانی مہک اُٹھے گا اور کسے پتہ تھا کہ ایشیا کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو جراثیم پھیلے ہوئے ہیں وہ اس کی جراثیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرنے شروع ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس وقت کے برطانوی ہند میں نئی فاتح قوم (انگریز) کو فکر تھی کہ ہندوستان کے دل و دماغ کو یورپین سانچوں میں کس طرح ڈھالا جائے جس سے برطانویت اس ملک میں جڑ پکڑ سکے۔ ظاہر ہے کہ دل و دماغ کے بدل دینے کا واحد ذریعہ تعلیم ہو سکتی تھی جس نے ہمیشہ ان سانچوں میں دلوں اور دماغوں کو ڈھالا ہے جن کو لے کر تعلیم آگے آتی ہے اس لئے ہندوستان کو فرنگی رنگ میں ڈھالنے کے لئے لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی اور وہ اسکولی اور کالجی تعلیم کا نقشہ لے کر یورپ سے ہندوستان پہنچا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں"۔ یقیناً یہ آواز جب کہ ایک فاتح اور برسرِاقتدار قوم کی طرف سے اٹھا اور تھا بھی وہ تعلیم کا ——— جو بذاتِ خود ایک انقلاب آفریں حربہ ہے تو اس

جیتا جاگتا مسلمان

نے ملک پر ذہنی انقلاب کا خاطر خواہ اثر ڈالا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں ابھرنی شروع ہو گئیں جو اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں لیکن اپنے طرز فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کے اعتبار سے انگریزی جامہ میں نمایاں ہونے لگیں۔ اس ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کر کے اپنے قول سے یہ نعرہ بلند کیا کہ ——

"ہماری تعلیم و تعلّم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں —— جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین و سیاست کے لحاظ سے اُن میں اسلامی شعور زندہ ہو۔ اس کا ثمرہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر بریک لگ گیا اور بات یک طرفہ نہ رہی بلکہ ایک طرف اگر مغربیت شعار افراد نے جنم لینا شروع کر دیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز جذبہ بھی برابر کے درجہ میں سامنے آنا شروع ہو گیا جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک و تر کو بہالے جائے گا اگر اس کی رو کا ریلا بہاؤ پر آئیگا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے گئے ہیں جو اُسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔ بہر حال وہ ساعت محمود آگئی کہ مدرسہ کا آغاز ہوا اور اس کی یہ تعمیر و دفاع کی ملی جلی تعلیم عملاً ساعت وجود پر آگئی۔ ملا محمودؒ دیوبندی نے (جو حضرت بانیٔ دارالعلوم کے امر پر مدرسہ دیوبند کا یہ تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کے لئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے) اپنے ایک شاگرد کو (کہ ان کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے) بٹھا کر کسی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہور عالم درس گاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کر دیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا نہ شہرت پسندی کا رد کار اور جذبہ، نہ نام و نمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر و اشتہارات کی بھرمار۔ بس ایک شاگرد اور ایک اُستاد، شاگرد بھی محمود اور استاد بھی محمود۔ دو افراد سے یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آگئی۔ سادگی اور ندرت ایمان کا دور دورہ شروع ہو گیا جو سنّت نبوی اور اتباع سلف کی رُوح ہے۔ مقصد نہ ترفہ تھا نہ تنعّم، نہ تعیش نہ تزیین نہ تفاخر نہ تکاثر بلکہ صرف "ما انا علیہ و اصحابی" کا مرقع بنانا اور "عَلَیْکُم بِسُنَّتِی الخ" و "وَاتَّبِع سَبِیلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچنی تھی اور اس تصویر کشی میں کمال احتیاط و اعتدال بھی پیش نظر تھا کہ صراط مستقیم کے یہ خطوط کہیں اُن بہتر ۷۲ فرقوں کے خطوط سے نہ مل جائیں جنہیں شریعت کی اصطلاح میں سُبُل متفرقہ کہا گیا ہے۔

ہفتاد و دو طریق خجستہ کے عمدے ہیں — اپنا ہے وہ طریق کہ باعمدے ہے

اس لئے جامعیت و اعتدال اور دین و دانش کے ملے جلے اندازوں کے ساتھ اس درس گاہ میں تعلیم و تربیت کا خطِ مستقیم کھینچا گیا۔

دارالعلوم کا سلسلۂ سند و استناد

دارالعلوم دیوبند کا سلسلۂ سند حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہُ العزیز سے گزرتا ہوا،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب اس جماعت دیوبند کے مورثِ اعلیٰ ہیں جن کے مکتبِ فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی۔ حضرت ممدوح نے اولاً اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا۔ پھر علومِ شریعت کو ایک مخصوص جامع عقل و نقل طرز میں پیش فرمایا۔ جس میں نقل کو عقل کے جامہ میں ملبوس کر کے نمایاں کرنے کا ایک خاص انداز پنہاں تھا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی دار العلوم دیوبند نے ولی اللّٰہی سلسلہ کے تلمذ سے اس رنگ کو نہ صرف اپنایا جو انہیں ولی اللّٰہی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا بلکہ مزید تنور کے ساتھ اس کے نقش و نگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمت ولی اللّٰہی میں معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے، حکمتِ قاسمیہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہو گئے۔ پھر آپ کے سہل ممتنع اندازِ بیان نے دین کی انتہائی گہری حقیقتوں کو بلاشبہ علم لدنی کے خزانے سے ان پر بالہام غیب منکشف ہوئیں، استدلالی اور لمیاتی رنگ میں آج کی خوگرِ محسوس یا حس پرست دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور ساتھ ہی اس خاص مکتبِ فکر کو جو ایک خاص طبقہ کا سرمایہ اور خاص حلقہ تک محدود تھا، دار العلوم دیوبند جیسے ہمہ گیر ادارہ کے ذریعہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیوبندیت، درحقیقت قاسمیت یا قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد اس دار العلوم کے سرپرستِ ثانی قطبِ ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے قاسمی طرزِ فکر کے ساتھ دار العلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروعِ فقہیہ اور جزئیاتی تربیت کا توام بھی پیدا ہوا اور اس طرح فقہ اور فقہاء کے سرمایہ کا بھی اس میراث میں اضافہ ہو گیا۔

ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد دار العلوم کے اولین صدر مدرس جامع العلوم اور شاہ عبد العزیزؒ ثانی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے جو حضرت بانیٔ دار العلوم سے سلسلۂ تلمذ بھی رکھتے تھے دار العلوم کی تعلیمات میں عاشقانہ، والہانہ اور مجذوبانہ جذبات کا رنگ بھرا جس سے یہ صہبائے دیانت سہ آتشہ ہو گئی۔

آپ کے وصال کے بعد دار العلوم دیوبند کے سرپرستِ ثالث شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند جو حضرت بانیٔ دار العلوم قدس سرہٗ کے تلمیذِ خاص بلکہ علم و عمل میں نمونۂ خاص تھے ان تمام الوانِ علوم کے محافظ ہوئے اور انہوں نے چالیس سال دار العلوم کی صدارتِ تدریس کی لائن سے علوم و فنون کو تمام منطقہ ہائے اسلامی میں پھیلایا اور ہزارہا تشنگانِ علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہو کر اطراف میں پھیل گئے۔ اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہیئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ جماعت دار العلوم کے جدِ امجد ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہٗ جدِ قریب، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اخ الجد اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بمنزلہ پدرِ بزرگوار ہیں۔

دار العلوم کا مسلک

علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت مسلکاً اہلِ سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب و سنت اور اجماع

وقیاس پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل و روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے جس پر پورے
دین کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے یہاں کتاب و سنت کی مرادات اقوال سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں
محدود رہ کر محض قوتِ مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہو
سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ عقل و درایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب و سنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے۔
وہ روایات کے مجموعہ سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض و غایت سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے
ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں۔
اس لئے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص اصول ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف
سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا جب تک کہ وہ قابل احتجاج ہو۔ اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ
میں نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں محسوس ہوتا۔ بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرّا رہ کر
ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقعہ پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ
بطریق اہل سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال و قال سے بیزار اور بری ہے۔ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے
مسلک میں ضروری ہے۔ اس لئے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدیت و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی
مزین کیا اور اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغنا، (علمی حیثیت سے) اور غنائے نفس (اخلاقی حیثیت سے)
کی بلندیوں پر فائز ہوئے، وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھرپور ہوئے۔ نہ رعونت
اور کبر و نخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذلتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار۔ وہ جہاں علم و اخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے
دکھائی دینے لگے وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور لاامتیازی کے جوہروں سے مزین ہو کر عوام میں ملے جلے اور "کاحدٍ
من الناس" بھی رہے۔ جہاں مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوئے وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ سپرٹ نیز قومی خدمت کے
جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے۔ غرض علم و اخلاق، خلوت و جلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات و دواعی سے
ہر دائرہ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی۔ جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے
اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث سے بیزار
ہو جانے یا نسبتِ احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علمِ کلام کی حذاقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں۔ بلکہ
اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فارغ درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی (محسن)
اور حکیم و مربی ثابت ہوا جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدم تقشف، حیا و انکسار کے ساتھ عدم مداہنت، رأفت و رحمت
کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت در انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہو
گئے۔ ادھر علم و فن اور تمام ارباب علوم و فنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حقوق شناسی نیز ادائیگی حقوق کے جذبات
ان میں بطور جوہر نفس پیوست ہو گئے۔ بنا بریں دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں
یا فقہاء، صوفیاء ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولیین، امرائے اسلام ہوں یا خلفاء اس کے نزدیک سب واجب الاحترام

اور واجب العقیدت ہیں۔ اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح و ذم میں حدود شرعیہ سے بے پروا ہو جانا اس کا مسلک نہیں۔ اس جامع طریق سے دار العلوم نے اپنی علمی خدمات سے (شمال میں) سائبیریا سے لے کر (جنوب میں) سماٹرا اور جاوا تک اور مشرق میں برہا سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علوم نبویہ کی روشنی پھیلا دی۔ جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔ دوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلاء نے کسی وقت پہلو تہی نہیں کی حتیٰ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ بالخصوص تیرھویں صدی کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی سرپرستی میں ان کے ان دو مریدانِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے منتسبین اور متوسلین کی مساعی انقلاب جہادی اقدامات اور حریت و استقلال ملی کی فداکارانہ جد و جہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر ان کی قید و بند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائی جا سکتی ہیں نہ بھلائی جا سکتی ہیں۔ جو لوگ ان حالات پر محض اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہِ سرفروشی میں قبول نہیں کئے گئے تو اس سے خود ان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہو گا۔ اس بارہ میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو لا یعبأ بہ اور قطعاً ناقابلِ التفات ہیں۔ اگر حسنِ ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جا سکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوب کن عوامل کے نتیجہ میں محض ذاتی حد تک حزم و احتیاط کا مظاہرہ ہیں۔ ورنہ تاریخی اور واقعاتی شواہد کے پیش نظر نہ ان کی کوئی اہمیت ہے نہ وہ قابلِ التفات ہیں۔ ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور انہیں متوارث جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلافِ رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلہ میں آگے آتے رہے (خواہ وہ تحریکِ خلافت ہو یا استخلاصِ وطن) اور بروقت انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔ مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور وسعتِ نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی ہے۔ جب کہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آ سکتے تھے اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا۔ اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جامع علم و معرفت، جامع عقل و عشق، جامع عمل و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع حکم و حکمت، جامع ظاہر و باطن، جامع حال و قال ہے۔ اس مسلک کو جو سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے۔ اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دار العلوم دیناً مسلم، فرقۃً اہل السنت والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً اشعری، سلوکاً چشتی بلکہ جامع سلاسل، فکراً ولی اللّٰہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

نمبر شمار	نام مصنف	مصنّف کا رنگ
۶	حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ	مناظرانہ
۷	حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ صاحب کشمیری	فقیہانہ و مناظرانہ
۸	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ	سیاسی و فقیہانہ
۹	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ	مؤرخانہ
۱۰	حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ	فقیہانہ و مؤرخانہ
۱۱	حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ	محدثانہ، فقیہانہ اور ادیبانہ
۱۲	حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ	فلسفیانہ و متکلمانہ
۱۳	حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	مؤرخانہ و محققانہ
۱۴	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ	فقیہانہ
۱۵	حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہ	محدثانہ و متکلمانہ
۱۶	حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدنی	محدثانہ
۱۷	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ	سیاسی و مؤرخانہ
۱۸	حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ	مؤرخانہ
۱۹	حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدظلہ	ادیبانہ و مؤرخانہ
۲۰	حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ	محدثانہ
۲۱	حضرت مولانا عبدالصمد صاحب صارم سیوہاری مدظلہ	محققانہ

۲۲ احقر کو اس فہرست میں اپنا نام شمار کراتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ تاہم تحدیثاً للنعمت اظہار نعمت بھی شکر نعمت ہے کہ اس ناکارہ کی تالیفات کا عدد بھی جو مختلف موضوعات پر ہیں تقریباً سوا سو (۱۲۵) ہے جن کا رنگ ان کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔

مشاہیر دارالعلوم

علمائے دیو بند میں ایسے مشاہیر بھی ہوئے جو اپنے اپنے وقت کے امامِ ملّت، علم و عمل کا نمونہ، خواص و عوام کی رشد و ہدایت کا مرکز، روایت حدیث، رنگِ تفسیر، فقہ و درایت میں راسخ اور ذاتی خدا پرستی کے ساتھ مخلوق کے حق میں مربّیِ اخلاق و مصلحِ دین اور دوسرے قومی و ملکی امور میں مسلمہ طور پر قائد تسلیم کئے گئے ہیں۔ مثلاً

۱: حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی بانی دارالعلوم دیو بند

آپ بانی دارالعلوم ہیں مگر جماعت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے نیز اس حیثیت سے کہ تاسیس و بناء دارالعلوم بھی

دارالعلوم کی بھی ایک نسبت ہے اس موقعہ پر بھی آپ کا تذکرہ کر دیا گیا۔

مذہبی خدمات متعدد مناظرے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے کئے۔ تصانیف اور تقریروں کے ذریعہ ولی اللّٰہی مسلک کی وضاحت اور اشاعت کی متکلمانہ اور عارفانہ انداز سے اصول اسلامیہ اور اساسی عقائد دین کو عقلی دلائل سے مستحکم اور مضبوط کیا، اور دین اسلام کی سرحدات کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اغیار کے حملے ان پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

سیاسی خدمات ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں عملی اور قائدانہ حصہ لیا۔ جنگ شاملی میں خود سپاہیانہ جنگ کی۔

سماجی اصلاحات معاشرہ (سوسائٹی) میں غلط قسم کی رسوم سے جو ابتری پھیلی ہوئی تھی اسے پہلے اپنے گھر سے ختم کیا۔ اس کے بعد دوسروں کو اس کے ترک پر آمادہ کر کے معاشرہ کو صاف کیا جس کی تفصیل کتاب "مسلکِ دارالعلوم" میں بقدر ضرورت کر دی گئی ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے کتاب "سوانح قاسمی" ملاحظہ ہو۔

۲۔ قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

آپ بھی دارالعلوم کے طالب علم نہیں بلکہ بانیوں میں سے ہیں اور سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر چونکہ یہ بھی دارالعلوم ہی کی ایک نسبت ہے اس لئے اس موقعہ پر بھی آپ کا تذکرہ کیا گیا۔

دینی خدمات علم حدیث، فقہ اور تصوف سے بہت زیادہ شغف رہا۔ ہزارہا انسانوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ آپ نے علماء کی دینی تربیت فرمائی اور انہیں دین کے بارے میں اتنا راسخ اور مستحکم بنا دیا کہ ان افراد پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہ ہو سکا۔

سیاسی خدمات ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حضرت نانوتویؒ کے دوش بدوش قائدانہ حصہ لیا اور نو ماہ تک اسیر فرنگ رہے۔ جن لوگوں نے ان کی سیاسی اور جہادی خدمات پر پردہ ڈالنا چاہا ہے، خواہ اپنی لاعلمی اور معاملات سے بے خبری کی بناء پر یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے، ان کی مصلحت اندیشی لایعبأ بہ اور باخبر لوگوں کے نزدیک لغو ہے۔

۳۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ

دینی خدمات آپ حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حضرت کے بعد قاسمی علوم کا جو فیضان عالم میں آپ کی ذات سے ہوا اس کی نظیر دوسرے تلامذہ میں نہیں ملتی۔ اپنے استاد میں فانی اور استاد کے علم میں غرق تھے۔ دین کے ہر دائرے میں آپ کی خدمات نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ درس، تصنیف، ارشاد و تلقین اور جذبۂ جہاد وغیرہ میں آپ کی خاموش خدمتیں زبانِ حال سے گویا ہیں۔ آپ اپنے استاد حضرت نانوتویؒ کے علوم کے امین اور خزینہ دار تھے۔ آپ نے ان علوم کی ایضاح و تفصیل و تفہیم و تیسیر میں نمایاں حصہ لیا اور عظیم خدمت انجام دی۔ حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کی اعلیٰ ترین طباعت بہ تزئین حواشی و عنوانات آپ ہی نے شروع فرمائی اور حجۃ الاسلام پر آپ ہی نے سب سے پہلے عنوانات قائم کئے اور قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا۔ بخاری کے ابواب و تراجم پر ایک جامع اور دبیز رسالہ تصنیف فرمایا۔ متعدد مناظرانہ تصانیف بھی فرمائیں اور مناظرے بھی کئے۔ دارالعلوم دیوبند میں چالیس برس تک مسلسل درسِ حدیث دے کر آٹھ سو ساٹھ ۸۶۰ اعلیٰ استعداد کے صاحب طرز عالم دین، فاضل علوم اور ماہرین فنون پیدا کئے۔ آپ کا درسِ حدیث اُس دور میں امتیازی شان رکھتا تھا اور مرجع علماء تھا۔ آپ کو علماء عصر نے محدث عصر تسلیم کیا۔ بیعت و ارشاد کے راستہ سے ہزارہا تشنگانِ

لئے ہوئے تھا۔ آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم وفنون بنا دیا تھا۔ آپ کے درس نے نقل وروایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ آج بھی نمایاں علماء اور صاحب طرز فضلاء زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ ہیں جو ہند وپاک میں علمی مسندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ کے یہاں ردِ قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لاکر سناتا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرما کر دعائیں دیتے تھے۔ تقریباً ۱۳۲۷ھ سے آپ نے دارالعلوم میں درس کا آغاز فرمایا۔ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔ اس دوران تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپ کے دور صدر مدرسی میں ۸۰۹ طلبہ نے درس حدیث لیا اور اس فن پاک کو تقریراً وتحریراً اور درساً وتدریساً دُور دُور تک پھیلایا۔

۱۹۔ حضرت مولانا شاہ وارث حسنؒ صاحب لکھنوی

آپ مشہور صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی دان طبقہ بالخصوص گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدے دار آپ سے زیادہ مستفید ہوئے۔ ابتدائی عہد میں آپ سے بعض خوارق کا ظہور بھی ہوا ہے۔ ریاضت کافی کی اور آپ پر اس کے اثرات نمایاں تھے۔

۲۰۔ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ

محدث مدرسہ امینیہ دہلی، مفتیٔ اعظم ہندوستان۔ اپنے زمانہ کے مشہور ومسلم مفتی اور فقیہ تھے۔ حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نکتہ رس علماء میں سے تھے۔ تدریس وافتاء کے علاوہ سیاسی لائن میں بھی نمایاں کام انجام دیا۔ آپ ہی جمعیۃ العلماء ہند کے سب سے پہلے صدر ہوئے اور عرصہ دراز تک صدر رہے۔ جمعیۃ العلماء اور کانگرس کی تحریکوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ کئی مرتبہ جیل گئے۔ آپ کا علم وفہم علماء میں تسلیم شدہ تھا۔ حضرت تھانویؒ جیسی مردم شناس ہستی نے فرمایا کہ "میں مفتی کفایت اللہ کے تدبر اور مولوی حسین احمد کے جوشِ عمل کا معتقد ہوں"۔ مجموعی طور پر آپ فقیہ، محدث، مفتی، مجاہد، اور نکتہ سنج علماء دیوبند میں سے تھے۔

۲۱۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ دارالعلوم دیوبند کے پانچویں صدر المدرسین تھے۔ حضرت شیخ الہند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ علم وفضل کے ساتھ غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء مجازین میں سے تھے۔ علم سے فراغت کے بعد اپنے والد مرحوم کے ساتھ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ طیبہ پہنچے اور اٹھارہ ۱۸ سال مدینہ منورہ میں رہ کر مختلف علوم وفنون بالخصوص حدیث شریف کا درس دیا۔ زندگی کمال زہد وقناعت کی تھی جو کمال صبر وتحمل سے اس مدت میں بسر ہوئی۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے پھر ۱۳۲۰ھ میں واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۳۲۹ھ تک درس دیا۔ پھر اسی سال مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۱ھ میں پھر ہندوستان واپس تشریف لائے

بیس بڑے مسلمان

گئے۔ ۱۳۳۸ھ میں مالٹا سے رہا ہو کر حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ حجاز ہی میں اسیر کر کے مالٹا بھیج دیئے
اور اسی سال مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اور اسی سال اکابر کے حکم سے جامعہ
اسلامیہ امروہہ میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ پھر ۱۳۳۹ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس رہے مگر تھوڑے
ہی عرصہ کے بعد ۱۳۳۹ھ میں ہی جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا۔ سلہٹ میں آپ
۱۳۴۵ھ تک قیام پذیر رہے۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے ڈابھیل تشریف لے جانے پر آپ شوال
۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بنائے گئے۔ آپ بڑے درجہ کے محدث تھے۔ حدیث کے مشہور اسکالر تھے۔
آپ کا درس حدیث بہت مقبول تھا کئی تصانیف فرمائیں جو سیاست اور تصوف پر ہیں۔ ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۷۷ھ تک بتیس ۳۲
برس دارالعلوم میں صدر مدرس اور ناظم تعلیمات رہے۔ اس دوران میں ۴۴۸۳ طلبہ نے آپ سے بخاری اور ترمذی پڑھ کر دورہ
حدیث سے فراغت حاصل کی۔ آپ ان تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت مردانہ سے سیاسی کام بھی پوری تن دہی سے
انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں آپ جمعیۃ العلماء ہند کے بار بار صدر بنائے گئے۔ آپ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے قائدین
میں سے تھے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ کئی مرتبہ جیل گئے اور آخر کار ملک
کو آزاد کرایا۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے آپ عالم، فاضل، شیخ وقت، مجاہد، جفاکش، جری اور اولوالعزم فضلاء دارالعلوم
دیوبند میں سے تھے۔

۲۲۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ

سابق ناظم جمعیۃ الانصار دارالعلوم دیوبند۔ سکھ مت سے آپ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آپ دارالعلوم
دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذکاوت، ذہانت اور حافظہ کے مالک تھے۔
ذہن خلقی طور پر سیاسی تھا۔ سیاست میں گہری نظر تھی ابتداءً طبعی اور علمی انداز میں اور بعد میں مشاہداتی انداز میں۔ یورپ اور
اور ایشیا کے بہت سے انقلابات آپ کے سامنے گذرے اس لئے سیاسی اسکیموں کی ساخت و پرداخت میں آپ کو خاص
ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں سرگرم حصہ لیا۔ افغانستان کی آزادی کی اسکیم آپ ہی نے
مرتب فرمائی تھی۔ ۲۵ سال تک جلاوطن رہے۔ واپس تشریف لا کر فلسفہ ولی اللہی سے ملک کو روشناس کرایا۔ سندھ ساگر
اکاڈیمی اور محمد قاسم ولی اللہی سوسائٹی قائم کی۔ جس نے حضرت نانوتویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم کی کافی خدمت
کی۔ افغانستان میں آپ نے انڈین نیشنل کانگرس کی ایک باضابطہ شاخ قائم کر کے افغانستان کے حق میں ہندوستان کی ہمدردیاں
حاصل کیں۔ آپ کانگریس میں شرکت کے حامی تھے مگر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ من حیث القوم۔ دارالعلوم میں آپ نے
جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے بڑے بڑے دو اجلاس مراد آباد اور میرٹھ میں ہوئے۔ اور اس کے حلقۂ اثر میں وسعت اور قوت
پیدا ہوئی۔ آپ دارالعلوم کو ایک علمی انداز سے ملی تنظیم کا ایک مرکز بنانا چاہتے تھے۔ جس کا نقش اول جمعیۃ الانصار
کا قیام تھا۔

مبارک کتاب کی تین ضخیم جلدیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہیں۔ جو خواص و عوام میں مقبول ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں انتقال فرمایا۔

۴۶۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہٗ

آپ حضرت مفتی اعظم الشیخ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کے فرزند رشید اور دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہٗ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ درسیات سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے درس و تدریس کے سلسلے میں لے گئے۔ پھر دارالافتاء میں اپنے والد بزرگوار کی زیر تربیت افتاء نویسی کی مشق کی۔ اور دارالافتاء میں بحیثیت نائب مفتی کام شروع کیا اور فتویٰ نویسی میں مہارت حاصل کی۔ ایک عرصہ تک حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ایک عرصہ دراز تک کلکتہ میں مقیم رہے اور وہاں کے لوگوں کو علم اور دین سے مستفید کیا۔ اس کے بعد دہلی آکر ادارہ ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ جو وقت کا ایک بہترین معیاری ادارہ ہے جس نے اسلامی علوم و فنون کی بہت سی قابلِ قدر تصانیف ملک کے سامنے پیش کیں آپ اس وقت دہلی کے مشاہیر علم و فضل شمار کئے جاتے ہیں۔ بہت سے علمی اور دینی اداروں کے ممبر ہیں اور مرکزی حج کمیٹی کے صدر ہیں۔ گورنمنٹ بھی آپ کی بات کا اثر لیتی ہے۔ قومی کاموں میں آپ کا خاص حصہ ہے۔ تحریکِ آزادیٔ ہند کے سپاہیوں میں سے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے کاموں میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے دستِ راست رہے ہیں اور ان کے وصال کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے صدر عامل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے مؤثر ممبروں میں سے ہیں۔ جری اور شیر دل مقرر ہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی آپ کی آمد و رفت رہی ہے۔ حال ہی میں آپ نے روس کے بعض دینی اداروں کی دعوت پر روس کا سفر کیا تھا مجموعی حیثیت سے دارالعلوم کے ممتاز فضلاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

۴۷۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ

آپ سید علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اعلیٰ ترین علمی استعداد کے مالک، نہایت درجہ کے ذکی اور طباع فضلاء میں سے تھے۔ ابتداءً دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ پھر دارالعلوم کی طرف سے مدراس بھیجے گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مدرس رہے۔ تصنیف و تالیف کی مخصوص صلاحیتیں رکھتے تھے۔ متعدد اعلیٰ ترین کتابوں کے مصنف تھے۔ ہندوستان کے بڑے بلند پایہ مقرر اور خطیب تھے۔ بہترین سیاستداں تھے۔ ندوۃ المصنفین کے مخصوص کارپردازوں میں سے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے صف اوّل کے لیڈروں میں سے تھے۔ کئی بار جیل گئے۔ طویل عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ رہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلابی ہنگاموں میں اپنی جان پر کھیل کر ہزاروں کی جانیں بچائیں۔ پارلیمنٹ کے بے لوث اور نڈر ممبر تھے فرقہ پرست بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔ گورنمنٹ بھی انہیں مانتی تھی اور ان کے اثرات قبول کرتی تھی۔ غرض ان کی شخصیت ایک جامع اور مؤثر شخصیت تھی جس کا ہندوستان کے تمام علمی اور سیاسی طبقات پر اثر تھا۔ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور اس کے کاموں میں دخیل تھے۔

۴۸۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی مدظلہ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ فراغت کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے ذمہ دار کارکنوں میں سے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے حکم پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم بنے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی وفات کے بعد ایک سال تک ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کے عہدہ پر فائز رہے۔ جمعیۃ اور کانگرس کے بڑے مخلص سپاہی اور صف اوّل کے لیڈروں میں سے ہیں۔ کئی بار جیل گئے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ علماء ہند کا شاندار ماضی کئی جلدوں میں اور تاریخ اسلام آپ کی شاہکار تصانیف ہیں۔ بچوں کی اسلامی تعلیم سے بہت زیادہ شغف ہے۔ چنانچہ دینی تعلیم کے متعدد رسائل تصنیف فرمائے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ تعلیم کے ہر شعبہ میں اور ہر مضمون میں اسلامی رنگ دیکھنے کی تڑپ ہے اور اس تڑپ کا مظاہرہ تصنیف کردہ کتابوں اور چارٹوں سے ہوتا ہے۔ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے کارگزار ممبر ہیں۔ مجموعی حیثیت سے علم و عمل میں دستگاہ اور صلاح و تقویٰ حاصل ہے۔

۴۹۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدظلہ

آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ایم اے کیا۔ دلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے۔ آج کل علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں سُنّی دینیات کے شعبہ کے انچارج ہیں۔ رسالہ برہان کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی قابلیت اپنی جماعت میں مسلّم ہے۔ کناڈا، انگلینڈ وغیرہ میں آپ کے لکچر بہت مقبول ہوئے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور ادارہ مجلسِ معارف القرآن (اکاڈمی قرآن عظیم) کی مجلسِ شوریٰ کے رکن رکین ہیں۔ آپ بھی حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس وقت آپ کی شخصیت ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ مصر، شام، حجاز، کویت، لبنان، کناڈا، انگلستان وغیرہ کے آپ نے قومی طور پر سفر کئے اور اپنی قابلیت سے ادبی اور علمی حلقوں میں ممتاز رہے۔ مصر کی عالمی مؤتمر میں احقر کی معیت میں آپ کا خصوصی سفر ہوا اور عالمی مؤتمر میں آپ کے خطاب کو سُنا گیا۔

۵۰۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ

آپ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ رحمۃ اللہ علیہ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے علوم کے امین ہیں جن کی ذات سے حضرت کے علوم کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی۔ علمی دنیا میں آپ کا ایک خاص درجہ اور مقام ہے۔ ادبیت اور عربی و فارسی کی ادبی قوت بے مثال ہے۔ عربی زبان میں بے تکان اور بے تکلف بولتے ہیں جس میں برجستگی اور روانی ہوتی ہے۔ عربی تحریر اور انشاء پردازی میں ایک بے نظیر صاحب طرز ہیں۔ متعدد اعلیٰ کتب کے مصنف ہیں۔ ترمذی شریف کی نہایت ہی جامع اور بلیغ شرح لکھی ہے جس میں محدثانہ اور فقیہانہ انداز سے کلام کیا گیا ہے۔ اس کی عربیت اور طرز ادا معیاری ہے اور ذخیرہ معلومات بہت کافی ہے۔ اس سے تبحر اور تفقہ دونوں نمایاں ہیں۔ آپ نے مصر، بیروت، شام، حجاز، عراق اور افغانستان وغیرہ کے سفر کئے۔ مصر میں علماء دیوبند کا سب سے پہلے آپ نے تعارف کرایا اور وہاں کے اخبارات اور رسائل نے آپ کے بلیغ مضامین نہایت ذوق و شوق سے شائع کئے۔ جس سے مصر و شام میں آپ کی علمیت کا چرچا ہی

دارالعلوم کے سرپرست

دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز تھے۔ جن کا پُرامن و بابرکت عہد آج تک احاطہ دارالعلوم میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۷۹ء تک سرپرست رہے۔ حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دوسرے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے۔ آپ کے عہد کی برکات دارالعلوم پر نور آفتاب کی طرح چھائی رہیں جن سے ظلمتوں کو قرار پکڑنے کا موقع نہ مل سکا۔ آپ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء سے ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں باجماع اہل دارالعلوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ سرپرست تسلیم کئے گئے۔ جن کے نورانی آثار سے آج تک دارالعلوم کا احاطہ چمک رہا ہے۔ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو حضرت اقدس مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہ کو سرپرست تسلیم کر لیا گیا۔ آپ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء سے ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء تک سرپرست رہے۔ ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا سے رہا ہو کر واپس تشریف لائے۔ تو پھر آپ ہی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز سرپرست ہوئے۔ آپ نے اپنی باطنی توجہات اور صرفِ ہمت کے ذریعہ دارالعلوم کے جہاز کو فتن و حوادث کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھا۔ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں اپنی گوناگوں مشغولیات کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد سے آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔

دارالعلوم کے مہتمم

اہتمام کے عہدہ پر بھی ہمیشہ اپنے وقت کے منتخب مخصوص افراد کا انتخاب ہوتا رہا۔ سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی تھے جو طریقۂ چشتیہ صابریہ کے ایک معروف صاحب سلسلہ بزرگ تھے اور زہد و ریاضت کا پیکر تھے۔ آپ کا حلقۂ اثر دیوبند اور اطراف و جوانب میں بہت وسیع تھا۔ آپ اولاً محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے رجب ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء تک مہتمم رہے۔ ثانیاً ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء تا ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء اور ثالثاً ربیع الاول ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء تا شعبان ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء مہتمم رہے۔

آپ کے اہتمام اول کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندیؒ عہدہ اہتمام پر فائز ہوئے۔ آپ طریقت و حقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہ کے ارشد خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ صاحب ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ موصوف بہت سے اکابر دارالعلوم مثل حضرت مفتی مولانا عزیز الرحمٰن صاحب

میں کہہ سکتا ہوں کہ جدید طرز کی بہت سی یونیورسٹیاں اس قدیم طرز کی یونیورسٹی سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔

جناب انوار السادات (وزیر حکومت مصر و جنرل سیکرٹری موتمر اسلامی) (بعد ازاں صدر مصر)

اس عظیم تاریخی یونیورسٹی کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں خلوص دل سے اپنے ان بھائیوں کو مبارک باد پیش کروں۔ جو اس کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ نفع پہنچے اور یہ علم و معرفت کا ایک منارہ ثابت ہو۔

رئیس روسی وفد (برائے ہندوستان)

"میں نے یونیورسٹی (دارالعلوم دیوبند) کو دلچسپی سے دیکھا۔ بر اعظم کے اس حصہ میں یہ مذہب اسلام کا ایک مرکز ہے۔ میں اپنے میزبانوں کی دریا دلی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ امن اور فیاضی کا جذبہ جو مذہب اسلام کی رڈیہ کی ڈی ہے۔ ہندوستانی عوام اور سوویٹ یونین کے عوام کے درمیان ہمیشہ ترقی پذیر رہے۔"

امریکی وفد برائے ہندوستان

"ہماری امریکی جماعت کو ایک دن یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) قیام کرنے کا موقعہ نصیب ہوا۔ ہم نے مشہور علماء اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں۔ درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ روح کو زندگی بخشتا ہے اور یہ نور یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) ضو فشاں ہے۔

(ممتاز حسن، عمر حسن احمد، امیر رشید، سعید احمد، امیر حسین، محمد احمد امریکی)

جناب علی اصغر حکمت (سفیر ایران برائے ہندوستان)

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عبد ضعیف کو اس عظیم الشان دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی نعمت سے نوازا۔ اور یہاں کے مایۂ ناز اساتذہ کرام اور علمائے عظام کی مصاحبت کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے کلمات طیبات سے اس عبد ضعیف کے دل و جان بہرہ ور ہوئے۔ ان کے باقی رہنے والے آثار و تالیفات سے میں محظوظ ہوا جو کہ بقول "مداد العلماء افضل من دماء الشہداء" (علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے افضل ہے) اپنے دامن میں ربانی برکات اور آسمانی فضیلتیں لئے ہوئے ہیں"

صد سالہ تقریب ۱۹۸۰ء کے بعد دارالعلوم دیوبند میں اختلاف ہو گیا۔ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو مجلس شوریٰ کے فیصلے کی بنا پر اہتمام چھوڑنا پڑا۔ اب آپ کے گرامی قدر صاحبزادے حضرت مولانا قاری محمد سالم صاحب کے اہتمام میں دارالعلوم وقف کے نام سے علیحدہ دارالعلوم قائم ہے جس میں ایک ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور کئی ایکڑ زمین اس دارالعلوم کیلئے لے لی گئی ہے۔ جبکہ پہلے دارالعلوم میں تین ہزار سے اوپر طالب علم اور سالانہ میزانیہ ایک کروڑ سے زائد ہے گویا ایک چھوٹے سے قصبے میں چار ہزار سے زائد طلبہ دین حاصل کر رہے ہیں آجکل دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن مدظلہ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد اور مفتی نظام الدین صاحب ہیں (ارشد)

ہیں غیب مسلمان

عبدالرشید ارشد

شیخ المشائخ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

انیسویں صدی عیسوی میں ملک و ملت جن ممتاز ترین اور عظیم المرتبت شخصیتوں پر فخر کر سکتی ہے ان ہی میں سے ایک مایۂ ناز اور عہد آفریں شخصیت شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ کی ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کا نہایت پُرآشوب دور تھا چھ سو سال کی حکومت پر انگریز رفتہ رفتہ قابض ہوتے جا رہے تھے اس میں بہادری و جاں بازی کا دخل کم اور فریب کاری و حیلہ سازی کا دخل زیادہ تھا۔

حضرت شیخ المشائخ نے ان حالات سے متاثر ہو کر روحانیت اور سیاست کے امتزاج سے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایک طرف بزمِ علم و عرفان اور رشد و ہدایت کی روشن شمع تھی اور دوسری طرف جنگ و پیکار اور میدانِ سیاست کی شہسوار تھی گزشتہ پوری ایک صدی میں اس جماعت نے اپنے حلقۂ عمل اصلاح و ہدایت کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کے معرکۂ جہاد شاملی سے لیکر ۱۹۴۷ء تک حصولِ آزادی کیلئے ملک و ملت کی جو زبردست خدمت انجام دیں اور سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی آزادی کو جسطرح برقرار رکھنے کی کامیاب جد و جہد کی ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی وغیرہم حضرات کے اسماء گرامی اور ان کی خدمات جو سینکڑوں میں چند مثالیں ہیں اسی "سلسلۃ الذہب" کی نامور ترین کڑیاں ہیں۔

خاندان

حضرت شیخ المشائخ نسباً فاروقی تھے آپکا سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے سلسلۂ تصوف کے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے اس سے اوپر اختلاف ہے بعض لوگوں نے حضرت ابراہیم بن ادہم کا امام زین العابدین بن امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے ہونا بیان کیا ہے مگر یہی صحیح ہے کہ وہ فاروقی النسب تھے آپکے والد ماجد کا اسم گرامی حافظ محمد امین ہے مولانا

شیخ محمد محدث تھانویؒ آپ کے ہم جد تھے جن کے اجداد اورنگ زیب سے لیکر انقلاب ۱۸۵۷ء تک تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں برسر اقتدار رہے۔ قاضی القضاۃ کا منصب بھی اسی خاندان میں تھا اس سلسلے کی آخری کڑی قاضی عنایت علی خاں تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں شاملی کے معرکے میں انگریزی فوج سے مردانہ وار جنگ کی اور اسی کی پاداش میں اس خاندان کو نہ صرف دینوی وجاہت سے محروم ہونا پڑا بلکہ تمام خاندان منتشر ہوکر تباہی کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔

مولانا غلام رسول مہر اپنے مضمون "بزرگان دیوبند" میں لکھتے ہیں۔

"بزرگان دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ کا احترام و اعزاز حاصل ہے۔ وہ حضرات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ان کے اسماء گرامی۔ اس سرزمین کے آسمان پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستہ بتاتے ہیں وہ اپنی زندگیوں میں علم وہدایت کے مشعل بردار تھے جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے جو دلوں اور روحوں میں برابر دین حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار دارالعلوم دیوبند ایسی ہے جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین پر دینی علوم کے قیام وبقاء کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے اسکی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی ہے جن کے کارنامے دین وسیاست دونوں کے دوائر میں قابل فخر ہیں"۔

تاریخ مشائخ چشت میں جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ "حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ ۱۲۳۳ھ میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حجاز چلے گئے انھوں نے صابریہ سلسلہ کو عروج کی انتہائی منزل پر پہنچایا۔ اور ان کے فیوض ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی ان کے اثرات پہنچے۔ حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی (المتوفی ۱۲۵۹ھ) کے خلیفہ تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حجاز سے واپس آئے تو ارشاد و تلقین کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندوستان کو منور کردیا اللہ تعالےٰ نے انہیں دل ودماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے۔ (۱) مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کیلئے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی۔ جس نے بالآخر دیوبند کی شکل اختیار کی ان ہی کے خلفاء و مریدین کی پرخلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتوی حاجی محمد عابد دیوبندی حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔ ان ہی بزرگوں کی کوشش سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا۔

(۲) باطنی اصلاح و تربیت کے لیے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ تھے۔ نصف صدی سے زیادہ انھوں نے ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے گوشے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا۔ لیکن مولانا تھانویؒ کی تحریک میں وہ وسعت اور گہرائی پیدا نہ ہوسکی جو مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دینی تحریک کو حاصل ہوئی۔

مولانا محمد الیاسؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ تعالےٰ نے انھیں عنایت فرمایا تھا۔ اس کی مثال اس عہد میں مشکل سے ملے گی گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس نے کیا۔

(۳) انیسویں صدی کی تیسری اہم تحریک آزادی وطن کی تھی اس سلسلہ میں خود حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متعلقین کے

جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں جنگ آزادی کے زمانہ میں تھانہ بھون کا انتظام حاجی صاحب نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور خود دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل فرماتے تھے۔ آزادی وطن کے جس جذبہ نے حاجی صاحب کے قلب و جگر کو گرمایا تھا۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے پہلو میں ایک شعلہ بن گیا انھوں نے اور ان کے رفقاء نے اور تلامذہ نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لیے جن مصائب کا سامنا کیا تاریخ ہند کا کوئی دیانتدار مورخ انکو بھلا نہ سکے گا۔
(تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۳۔۲۲۴)

پیدائش

حضرت شیخ المشائخ کی والدہ ماجدہ شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی کی صاحبزادی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خاندان سے تھیں آپ اپنی ننھیال نانوتہ میں دوشنبہ کے دن ۲۲ صفر المظفر ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) کو پیدا ہوئے والد ماجد نے امداد حسین نام رکھا تاریخی نام ظفر احمد (۱۲۳۳ھ) ہے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا نام بجائے امداد حسین کے امداد اللہ تجویز فرمایا اور پھر یہی نام زبان زد عام ہو گیا۔ پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی لکھتے ہیں:

مزید تفصیل

آپ کا نام نامی آپ کے والد مرحوم نے امداد حسین رکھا تھا۔ لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نبیرۂ شاہ عبد العزیز صاحب نے امداد اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا۔ شاید ان کو امداد حسین نام پسند نہ آیا کہ اس میں شرک کی بو آتی ہے چنانچہ یہ نام خود حاجی صاحب نے بھی ترک کر دیا، اور کتابوں نیز خطوط میں ہمیشہ امداد اللہ ہی لکھا گئے۔

راقم الحروف کو گلزار معرفت سے جو آپ کی غزلیات وغیرہ کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے ایک اور نام کا بھی پتہ چلا ہے اور وہ نام خدا بخش ہے یہ نام کس نے رکھا معلوم نہ ہو سکا۔ لکھتے ہیں ؎

ہم نہ شاعر ہیں نہ ملا ہیں نہ عالم ہیں ولے — رکھتے ہیں ہر باب میں اللہ سے امداد ہم
اے خدا بخش اس زمیں میں لکھ غزل اک اور تو — تاکہ جانیں شعر گوئی میں تجھے استاد ہم

لیکن اس قافیہ اور ردیف میں دوسری غزل لکھنے کا مذکورہ بالا شعر میں جو پتہ دیا ہے اس میں آپ لکھتے ہیں ؎

ہے نہ یہ شعر و غزل، ہے اپنی مجذوبانہ بڑ — بڑ نہیں یہ مشق کو کرتے ہیں کچھ ارشاد ہم
ڈر ہے کیا فوج گنہ سے، ہے خدا بخش اپنا نام — اور تس پر رکھتے ہیں اللہ کی امداد ہم

ان اشعار میں بھی خدا بخش اور امداد اللہ دونوں ناموں کا اظہار صاف ہے آپ نے اپنے مختلف خطوط میں اپنا ایک اور نام عبد الکریم بھی ظاہر فرمایا ہے چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھتے ہیں،

"از فقیر عبد الکریم عزیز الصمد حالی مرتبت مولوی محمد قاسم زاد شوقہ و ذوقہ باللہ تعالیٰ" (امداد المشتاق کا حصہ مرقومات امدادیہ) ایک اور خط میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب کو لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں،

"از فقیر حقیر عبد الکریم عفی عنہ" (مرقومات امدادیہ ص ۲۲)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام حاجی صاحب نے کسی مصلحت کی وجہ سے رکھا تھا آپ کا تاریخی نام ظفر احمد تھا اور والد صاحب کا نام حافظ محمد امین بن شیخ بڈھا بن شیخ بلاقی تھا (شمائم امدادیہ ص ۶)[1]

[1] حیات امدادیہ ص ۵۳۔۵۴

تعلیم

والدہ ماجدہ کو آپ سے بے انتہا محبت تھی اگرچہ آپ کے تین بھائی اور ایک بہن تھی مگر والدہ کو جو تعلق آپ سے تھا، وہ دوسروں سے نہ تھا۔ اسی لاڈ پیار کی وجہ سے آپ ابتدائی تعلیم سے بھی محروم رہے ابھی عمر کی ساتویں منزل ہی میں قدم رکھا تھا کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے انتقال کے وقت خاص طور پر وصیت کی کہ کوئی میرے بعد اس بچے کو ہاتھ نہ لگائے۔ اس وصیت کی تعمیل میں یہاں تک مبالغہ کیا گیا کہ کسی کو آپ کی تعلیم کی جانب توجہ نہ ہوئی بالآخر آپ خود ہی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ مگر ہر مرتبہ کچھ ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ اس وقت حفظ کی تکمیل نہ ہو سکی اس زمانہ میں استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتوی جن سے آپ کو خیالی تعلق تھا، دہلی کے عربک کالج میں مدرس تھے۔ آپ انکے ہمراہ تحصیل علوم کیلئے دہلی تشریف لے گئے "شمائم امدادیہ" میں لکھا ہے:

"سولہ سال کے سن میں وطن شریف سے ہمراہی حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانے میں چند مختصرات فارسی تحصیل فرمائے اور کچھ صرف و نحو اساتذہ عصر کی خدمت میں حاصل کی، اور مولانا رحمت علی تھانوی سے تکمیل الایمان شیخ عبدالحق دہلوی کی قرأت اخذ فرمائی:-

آگے چل کر لکھا ہے کہ:

"بالمرتبی و بجہ بہ لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع قرأۃً حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گزرانا، اور حصن حصین و فقہ اکبر امام ابوحنیفہؒ قرأۃً مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے اخذ کیا۔ یہ ہر دو بزرگوار ارشد تلامذہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے تھے۔ اور مفتی صاحب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے" (شمائم امدادیہ ص۔ الغائیہ ص ۱۲)

مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ آپ نے شیخ عبدالرزاقؒ سے پڑھی جو مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے ایک واسطے سے شاگرد تھے۔ مثنوی مولانا روم سے آپ کو تمام عمر بڑا شغف رہا۔

بیعت

دہلی اس زمانہ میں علماء و مشائخ کا مرکز تھی۔ مولانا نصیر الدین دہلوی طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کے مسند نشین تھے۔ دہلی کے زمانہ قیام میں آپ کو ان سے عقیدت ہوگئی اور آپ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی "شمائم امدادیہ" میں ہے کہ چند دن تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر اجازت و خرقہ سے مشرف ہوئے اور اذکار طریقہ نقشبندیہ اخذ فرمائے۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس آراستہ ہے شیخ المشائخ مجلس نبوی میں حاضر ہونا چاہتے تھے غایت ادب کی وجہ سے قدم آگے نہیں پڑتا تھا۔ اچانک آپ کے جد امجد حافظ بلاقی تشریف لائے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بارگاہ نبوی میں پہنچا دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں آپ کا ہاتھ لے کر حضرت میاں نور محمد جھنجھانوی کے حوالے فرما دیا۔

حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت اور شجرہ نسب

جھنجھانہ حضرت میاں جیؒ کا مولد پاک ہے اور آپ شاہ العلمین کی اولاد امجاد میں سے ہیں حضرت کا شجرہ نسب نویں پشت میں شاہ عبدالرزاق صاحب (شاہ العلمین) سے مل جاتا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

حضرت میاں جیوؒ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ کیا تمہیں اپنے خواب ——

ہوا۔ دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی صورت ہے جو خواب میں دکھلائی گئی تھی

(بقیہ حاشیہ) حضرت شاہ عبدالرحیمؒ اور سید صاحب کے ساتھ تھے اور جہاد میں شریک ہوئے۔ مگر بعد میں کسی مآل اندیشی اور مصلحت کے پیش نظر خود آپ کے ہمراہ رشید دن نے واپسی وطن کا حکم دیا اور آپ لوہاری تشریف لے آئے اور ان سرفروشوں کی آخری جماعت نے بالاکوٹ کی تنگ اور سنگلاخ گھاٹی میں ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان جن میں مسافروں کا چلنا بھی آسان نہیں اپنے سے دس گنا حریف کے مقابلے میں جان دی۔

قصبہ لوہاری میں ایک معلم کی حیثیت سے آپ کام کرتے رہے اور مستور الاحوال رہے۔ آخر شیخ العرب والعجم حضرت

حیات باکرامات

حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی و مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک عجیب طریقہ سے آپ کے مرید ہوئے اور آپ کے جلوس کو عام کرنے کا باعث بنے۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ میاں جیوؒ سے بشارت غیبی پاکر مرید ہو گئے تو انھوں نے اپنے مرید ہونے کا واقعہ حضرت ضامن صاحبؒ سے بیان کیا چنانچہ حافظ ضامن صاحب جیسے شوخ طبع بھی حضرت کے نادیدہ عاشق زار پرستار بن گئے اور حضرت سے ملاقات کرنے کا جوش اور ولولہ ان کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ حضرت حاجی صاحب سے آپ کی جائے قیام معلوم کی انھوں نے بتلایا کہ وہ لوہاری کی جامع مسجد میں بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے ہیں یا اصل وطن جھنجھانہ ہے جھنجھانہ کا پتہ یہ ہے محلہ پیرزادگان یعنی متصل مسجد چشتی صاحبؒ مسجد کے پاس دھوبی رہتے ہیں ان سے معلوم کر لینا۔ آپ لوہاری تشریف لے گئے معلوم ہوا کہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ جھنجھانہ تشریف لے گئے ہیں حافظ صاحب نے جھنجھانہ کا رخ کیا۔ جب دھوبیوں کے محلہ میں پہنچے تو حضرت میاں جیو مسجد چشتی کے سامنے ایک مزار کے قریب جو چشتی صاحب کے نام سے مشہور ہے تشریف فرما تھے حافظ صاحب نے کہا ارے دھوبی میاں جیو کا مکان کہاں ہے آپ نے فرمایا کہ میں کپڑوں کا دھونے والا نہیں دل کے دھونے والا دھوبی ہوں حضرت حافظ صاحب سمجھ گئے کہ یہی حضرت میاں جیوؒ ہیں فوراً قدم بوس ہوئے اس کے بعد آپ کا معمول ہو گیا کہ اگر ہفتہ میں دو تین یوم تھانہ بھون میں قیام فرماتے تو تین چار روز حضرت کی خدمت میں آخر پورے ساڑھے تین سال کے بعد حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو شرف مریدی بخشا۔

حضرت میاں جیوؒ کی عظمت کا احساس ان واقعات سے ہوتا ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ صحرا میں پھر رہا تھا ایک جگہ کچھ آثار آدمی کے معلوم ہوئے غور کرنے سے معلوم ہوا کہ حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب پانی پتی ہیں مجھ کو دیکھ کر بیٹھ گئے میں بھی بیٹھ گیا۔ مجھ پر توجہ جذب کی دینا شروع کی جب مجھے آثار جذب معلوم ہونے لگے میں نے حضرت پیر و مرشد کا تصور کیا اس وقت میرے اور ان کے درمیان حضرت پیر و مرشد حائل ہو گئے مجذوب صاحب تبسم کرنے لگے میں نے عرض کیا مجھ کو آپ کی طرح دیوانگی پسند نہیں ہے

اسی طرح حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حافظ محمد احمد تھانویؒ داماد مولانا مملوک علیؒ صاحب نانوتوی ایک مرتبہ حضرت میاں جیوؒ کی خدمت میں بعد بیعت کے حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ حضرت مجھے تصور شیخ کی اجازت دے دیجیے تاکہ تصور شیخ کیا کروں حضرت نے فرمایا کہ جب محبت غلبہ کرتی ہے تب تصور شیخ کون کرتا ہے۔ غلبہ محبت سے تصور شیخ خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ حضرت کے فرمانے سے ایسا تصور شیخ ان پر غالب ہوا کہ ہر جگہ صورت شیخ کی نظر آتی تھی۔ چلتے پھرتے حیران ہو کر کھڑے ہو جاتے کہ صورت شیخ کی سامنے کھڑی ہے۔ جہاں قدم رکھتے ہیں وہاں بھی صورت شیخ موجود۔ نماز میں سجدہ کی جگہ صورت شیخ دیکھ کر نماز کی نیت توڑ دیتے تھے حضرت سے عرض کیا کہ اب تو نماز پڑھنی بھی مشکل ہو گئی کس کی نماز پڑھیں جس طرح حضرت کی ادنیٰ توجہ سے یہ حالت پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح جاتی رہی اور ایک نظر میں صحیح حالت ہو گئی۔

حضرت میاں جیوؒ کی اس کیفیت باطنی کا حال مولانا شبیر احمد عثمانی دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کیفیت حضرت منصورؒ پر صرف چند گھنٹہ بلکہ چند منٹ طاری رہی تھی اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور انا الحق کہہ دیا۔ وہی کیفیت حضرت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پر کامل یقین ہے۔ یہ پہلی کرامت تھی جو مشاہدہ میں آئی میرا دل بکمال استحکام حضرت میاں جیو کی جانب مائل ہو گیا۔ ایک مدت پیر و مرشد کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میاں جیو پر برابر تیس سال تک مسلسل طاری رہی مگر اس قدر اعلیٰ ظرف رکھتے تھے کہ اف تک نہ کی۔ یہ ہی آپ کا ظرف تھا کہ آپ اپنے زمانے کے قطب الاقطاب تھے اور بقول مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے زمانہ میں ہندوستان کا دنیاوی پایہ تخت دہلی تھا اور روحانی پایہ تخت لوہاری تھا۔ اب جس کو روحانی دنیا کی بادشاہت مل گئی اور جو قبلہ روحانیاں بن گئے اس کے ہاتھ میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ مگر آپ نے اس کا اظہار بہت کم ہونے دیا اور کبھی کہیں ہو گیا تو ایسا بغیر ارادہ کے ہوا جیسے کہا جاتا ہے کہ حضرت میاں جیو کسی بات پر لوہاری کے خوانین (پٹھانوں) سے ناراض ہو کر جھنجھانہ تشریف لے گئے۔
حضرت کے لوہاری سے تشریف لے جانے کے بعد لوہاری کے اکثر محلوں میں آگ لگ جاتی تھی جس سے وہاں کے خوانین کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آگ کا لگنا حضرت میاں جیو کی خفگی کا باعث ہے چنانچہ وہ لوگ جھنجھانہ پہنچے۔ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور حضرت کی خوشامد کر کے لوہاری واپس لے آئے حضرت کی مراجعت کے بعد پھر کبھی آگ نہیں لگی خوانین نے حضرت کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ حضرت جب آپ لوہاری والوں سے خفا ہو کر جھنجھانہ تشریف لے گئے تھے تو یہاں مختلف محلوں میں آگ لگ جاتی تھی اس کا کیا سبب ہے۔ حضرت نے جواب دیا مجھے اور کچھ تو معلوم نہیں صرف لوہاری سے محبت کے باعث مجھے اس کا ماحول اور محلے یاد آتے تھے۔
حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کے یہاں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میاں جیو نور محمد ملری کی بعض بعض کرامتیں بھی عجیب و غریب ہیں فرمایا جی ہاں ایک مرتبہ کسی کے کھیت میں آگ لگ گئی کھیت والے نے آکر حضرت سے شکایت کی آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر دے دی کہ جلدی سے جا کر آگ میں ڈال دو وہ لے جا کر آگ میں ڈال دی گئی اور آگ فوراً بجھ گئی۔
مولوی محمد میاں مرحوم سے جو حضرت میاں جیو کے حقیقی بھتیجے اور غلام حیدر صاحب کے فرزند تھے، روایت ہے کہ حضرت میاں جیو کے زمانہ میں ایک مرتبہ بارش کی دقت کھینچ ہوئی چند حضرات میاں جیو کی خدمت میں بغرض دعا حاضر ہوئے حضرت اس وقت گنا چوس رہے تھے جب حضرت سے بارش نہ ہونے کی شکایت اور دعا کی درخواست کی آنے والوں سے جو صاحب حضرت سے انتہائی بے تکلف تھے آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم میرے گنے کے چھلکے چوس لو تو انشاء اللہ بارش ہو جائے گی ان صاحب کو پہلے تو گنے کے چھلکے چوسنے سے کچھ ذلت سی ہوئی۔ مگر آنے والوں کے اصرار پر ان صاحب نے حضرت کے چوسے ہوئے چھلکوں کو چوس لیا بس پھر ابر رحمت اٹھا اور خوب زور سے بارش ہوئی۔
حصول دعا و استمداد و ہمت کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس وقت تھانہ بھون کی مسجد پیر محمد صاحب والی میں قیام فرمایا جو اب خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نام سے موسوم ہے اس وقت یہاں سہ دری نہ تھی کچھ قبریں تھیں کچھ درخت تھے اور اس جگہ ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے جن کا نام حسن علی شاہ تھا صاحب سماع تھے مگر دنیادار نہ تھے جب حضرت حاجی صاحب یہاں تشریف لائے تو انہوں نے اتنا ادب کیا کہ خود اٹھ کر شاہ ولایت میں چلے گئے حالانکہ اس وقت حضرت حاجی صاحب جوان تھے اور یہ بوڑھے ان کے چلے جانے کے بعد حاجی صاحب یہاں رہنے لگے۔ حضرت میاں جیو بھی یہاں تشریف لایا کرتے تھے یہاں ایک خاندان تھا ان کی زمین ضبط ہو گئی تھی اور وہ کوشش کر رہے تھے۔ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی وہ لوگ دعا کے واسطے حاضر ہوئے حضرت نے فرمایا کہ میرے حاجی کو بیٹھنے کی تکلیف ہے یہاں ان کے لیے ایک سہ دری بنوا دو میں دعا کروں گا انہوں نے سہ دری بنوانے کا وعدہ کیا انہوں نے دعا کی وہ مقدمہ الہ آباد جا کر موافق ہو گیا جس کی اطلاع ایک خاص خط سے ہوئی۔ حضرت میاں جیو سے تذکرہ کیا گیا تو حضرت نے فرمایا وعدہ بھی یاد ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت پوری سہ دری بنوانے کی طاقت تو نہیں ابھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

بیس بڑے مسلمان

خدمت میں حاضر رہ کر ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل فرمائی اور خرقۂ خلافت سے مشرف ہوئے۔ پھر ضبط انھوں نے اگر حضرت میاں

(بقیہ حاشیہ) بنادیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا آدمی ہے سہی۔ پھر الٓہ آباد سے باضابطہ حکم آیا کہ تاحیات تو معاف تمہارے بعد پھر

جیو سے عرض کیا حضرت نے فرمایا تم نے آدھا ہی وعدہ پورا کیا۔ پھر میں کیا کروں

کرامات ایک ہلکی سی جھلک ہیں، ایک دھندلا سا پرتو ہے اس جلوہ طور اور مینارہ نور کا جس کا ذکر حاجی امداد اللہ ؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے میں ایک بار حضرت

قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد انور پر تین روز تک مقیم (حالت مراقبہ میں) رہا، میں نے دیکھا کہ حضرت قطب نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا دلی مقصد تم کو

تمہارے مرشد سے ملے گا۔

یک دن کرنال کے ایک عالم نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت بزرگوں کے قصے سنتے ہیں کہ لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں سر دھڑ کر الگ الگ پارہ

پارہ دیکھا۔ آپ نے فرمایا میرے ماموں صاحب تذکرہ کر رہے تھے کہ میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں ایک دن دوپہر کے وقت گیا۔ حجرہ شریف بند تھا مگر

کواڑ بھی طرح لگے ہوئے نہ تھے۔ کواڑ جو کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت میاں صاحب کا دھڑ بیلا الگ الگ ہے۔ مجھے دیکھتے ہی سب اعضاء باہم مل گئے اور حضرت میاں

جی اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے کسی سے نہ کہنا۔

یک طرف تو اہل وطن کی دنیا میں آپ کے مراتب و مدارج یہ تھے۔ دوسری طرف اہل حاضر کی نگاہوں میں آپ کے زہد و ورع اور پابند شرع ہونے کی کیفیت یہ

تھی کہ تیس برس تک کبھی حضرت کی تکبیر اولیٰ قضا نہیں ہوئی۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی فرماتے ہیں کہ مولوی محمد صدیق صاحب بیان کرتے تھے کہ

میری تیس سال سے حضرت میاں جیو سے ملاقات ہے۔ اس تیس سال میں کبھی آپ کی تکبیر اولیٰ قضا نہیں ہوئی معاملات و مسائل مذہبی میں بڑی احتیاط برتتے تھے

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی یا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ایک شخص نہایت ہی خوش گلو تھا اور نعت وغیرہ پڑھتا تھا

کسی نے حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا یہ شخص خوش گلو ہے اور نعت پڑھتا ہے آپ بھی سن لیں آپ نے فرمایا لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں

اور غنا بلا مزامیر میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ اس کا سننا خلاف احتیاط ہے۔ لہٰذا میں اس کے سننے سے معذور ہوں اللہ اللہ کس قدر ادب ہے

منصب امامت کا۔

ایک اور واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ ایک بڑا پہنچا ہوا سادھو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت کا مہمان رہا جب جانے لگا۔ تو بولا میاں ہماری زنبیل

میں تھوڑی سی اکسیر ہے۔ یہ لے لے تیرے پاس دھن کی کمی معلوم پڑتی ہے۔ اپنے کام میں لا۔ حضرت نے فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اپنے پاس ہی رہنے

دو۔ اس نے پھر کہا۔ حضرت نے اس بار بھی انکار فرمادیا جب اس نے تیسری بار یہی کہا تو حضرت نے ایک ڈھیلا اٹھا کر سامنے دیوار پر مار دیا اور فرمایا یہ دیکھو سادھو

نے اس طرف دیکھا تو ساری دیوار سونے کی ہوگئی تھی یہ دیکھ کر وہ بولا تب تو میاں جی تجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس سادہ وضعی اور منکسر المزاجی کے باوصف کہ آپ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے سلف الصالحین کا بہترین نمونہ تھے۔ آپ کے چہرہ انور کے رعب و داب کا یہ عالم

تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو آپ سے اس قدر قربت و نزدیکی کے باوجود یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ آپ کی شان میں لکھی ہوئی اپنی ایک نظم آپ کے سامنے پڑھ سکیں

ناجاتا ہے کہ جب کبھی حضرت میاں جی نور محمد صاحب بازار کی طرف نکلتے تو سب دکاندار تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور سلام کرتے ایک دفعہ باہر کے ایک غیر مسلم نے اس

پر اعتراض کیا کہ لوگ کیوں کھڑے ہوتے ہو۔ ہرگز مت کھڑے ہوا کرو ان دکانداروں نے کہا اچھا آئندہ سے ہم ادب و تعظیم کے طور پر کھڑے نہ ہوا کریں گے

یک مرتبہ اتفاقاً حضرت میاں جیو صاحب بازار کی طرف تشریف لے گئے وہ شخص بھی آیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ معترض شخص ہی حضرت کی تعظیم کے لیے کھڑا

ہوا اور اس کے ساتھ ہی سب دکاندار

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سفر حج

۱۲۶۰ھ میں آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو طلب فرما رہے ہیں۔ فرط شوق میں زاد راہ کا بندوبست بھی نہ کر سکے اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے بھائیوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے پیچھے سے مصارف بھجوائے ۵ ذی الحجہ کو آپ کا جہاز جدہ کی بندرگاہ کے نزدیک لنگر انداز ہوا آپ جہاز سے اتر کر فی الفور عرفات کے لیے روانہ ہو گئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ معظمہ میں آپ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کی خدمت میں کچھ عرصہ قیام فرما کر فیوض و برکات حاصل کیے اور بعد ازاں مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سوز دروں کو تسکین بہم پہنچائی۔ واپسی میں پھر چند دن مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں وطن مراجعت فرمائی۔

(بقیہ حاشیہ) بھی حسب عادت کھڑے ہو گئے حضرت کے گزر جانے کے بعد ان دکانداروں نے پوچھا تم تو اعتراض کیا کرتے تھے اور حضرت کی آمد پر سب سے پہلے ہی تم کھڑے ہو گئے۔ وہ شخص کہنے لگا میں مجبور تھا کیونکہ جس وقت حضرت تشریف لائے تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی شخص میرا کان پکڑ کر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت کو لباس فقیری تو عطا کیا ہی گیا تھا مگر ساتھ ہی رعب شاہانہ بھی بخشا گیا تھا۔

انتقال

یہ تھے آپ کی زندگی کے چند اوراق لیکن بالآخر وہ وقت موعود آگیا جو ازل سے ہی ہر ذی روح و ذی حیات کا مقدر ہو چکا ہے اور آپ نے ۵۵ برس اس دار فانی کی سیر کر کے سفر آخرت اختیار کیا۔ آپ کی وفات حسرت آیات کی تاریخ ۴ رمضان المبارک ۱۲۵۹ھ بروز جمعہ ہے

تجہیز و تکفین

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں میرے حضرت پیر و مرشد کا مزار شریف ہے۔ وہاں ایک احاطہ امام سید محمود شہید سبزواری کا مشہور ہے اس احاطہ میں کسی نئی قبر بنانے کا حکم نہ تھا۔ آپ وہاں اکثر جایا کرتے تھے اور دیر تک مشغول رہتے تھے۔ انتقال کے وقت وصیت فرمائی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے اسی جگہ جہاں میں اکثر جایا کرتا ہوں دفن کرنا وہاں سے مجھے بڑے انس آتی ہے چنانچہ آپ وہیں دفن کیے گئے۔

حضرت نے مرنے سے پہلے فرمایا تھا فقیر مرتا نہیں صرف ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتا ہے چنانچہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کی روح پرفتوح سے وہی فیضان و عرفان کا سرچشمہ جاری ہے۔ آپ کے ارشاد عالی کے مطابق آپ کے مزار مقدس سے دینی فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں جو آپ کی ذات بابرکات سے ہوتے تھے

حضرت کے مرید و خلفا

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی تھانویؒ مہاجر مکی و مدنیؒ (خلیفہ) حضرت حافظ ضامن شہید فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ محدث فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت شیر محمد خاں صاحبؒ لوہاری (خلیفہ) حضرت شیخ امام الدین صاحبؒ تھانوی (مرید) حضرت حافظ محمود صاحبؒ تھانوی (مرید) حضرت حافظ نور صاحب جھنجھانوی (مرید)

(تلخیص نور محمدی)

[1] حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی۔

مریدین

حج سے واپسی کے بعد دن بدن لوگوں کا رجوع بڑھتا جاتا تھا اور کثرت سے آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے مشتاق تھے۔ مگر آپ کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے بالآخر حافظ محمد ضامن صاحبؒ کے شدید اصرار پر جو آپ کے پیر بھائی تھے بیعت کرنا شروع کیا علماء میں سب سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے عوام الناس کے علاوہ علمائے عصر کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھی۔ چند مشہور علمائے کرام کے اسماء گرامی ذیل میں درج ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف عوام بلکہ خواص اہل علم و فضل بھی آپ کے روحانی کمالات کے معترف تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولوی صفات احمد غازی پوری، مولوی محی الدین میسوری، مولوی حافظ یوسف تھانویؒ، حکیم ضیاء الدین رام پوری، نواب مولوی محی الدین خاں مرادآبادی، مولوی محمد شفیع، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا سید فدا حسین رضوی، مولانا محمد افضل ولایتی، مولانا عبدالسمیع بیدل رامپوری، مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم

جماعت علماء میں شیخ المشائخ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے خاص تعلق تھا۔ حضرت نانوتوی کی نسبت آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح مولانا روم شمس تبریز کی زبان ہیں اسی طرح حق تعالیٰ نے مولوی محمد قاسم کو میری زبان بنایا ہے جو میرے قلب میں آتا ہے مولوی صاحب اس کو بیان کر دیتے ہیں میں علمی اصطلاحات نہ جاننے کی وجہ سے اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ (کرامات امدادیہ ص ۱۰)

انقلاب ۱۸۵۷ء

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دور میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے بجائے جبر و استبداد لوٹ کھسوٹ کا عام دور دورہ تھا مسلمان چھ سو برس سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے مگر انہوں نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ ہندو مسلمان باہم دگر شیر و شکر کی طرح رہتے تھے مگر انگریزی عمل داری میں ہندوستان کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ پادریوں کو نہ صرف تبلیغ کی عام اجازت تھی بلکہ انگریزی حکام ان کی پشت پناہی کرتے اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے۔ انجیل کا درس ضروری کر دیا گیا تھا۔ پادری عام مجمعوں میں نہ صرف عیسائیت کی تبلیغ ہی کرتے بلکہ ہندو اور مسلمانوں پر بے تحاشا جارحانہ حملے کیے جاتے چونکہ انگریز کی نظر میں اس کا اصلی مد مقابل مسلمان تھا اور اسی کو وہ اپنا سیاسی حریف سمجھتا تھا۔ اس لیے انگریزوں کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کو پست اور ناکارہ نہ بنا دیا جائے گا۔ اس وقت تک حکومت اور سربلندی کا نشان ان کے دماغوں سے نہیں نکلے گا اس لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ظلم و جور اور تبلیغ عیسائیت کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اپنے زمانہ اسیری جزیرہ انڈمان کی تصنیف الثورۃ الہندیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

انگریزوں نے تمام باشندگان ہند کو عیسائی بنانے کی اسکیم بنائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا اس لیے انقیاد و اطاعت سے سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضے کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اس لیے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا انہوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی اور اپنی زبان و دین کی تعلیم کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

الثورۃ الہندیہ ص ۳۵۰، ۳۵۷

زبردست عالم تھے۔ آپ سے ملنے کے لیے تشریف لائے اس وقت مثنوی شریف کا درس ہو رہا تھا۔ حضرت شیخ المشائخ بڑے جوش کے ساتھ حقائق و معارف بیان فرما رہے تھے۔ درس اردو میں ہو رہا تھا۔ آپ کے ایک خادم مولوی نیاز احمد حیدرآبادی نے عرض کیا کہ اگر شیخ اسعد اردو سمجھتے تو بہت محظوظ ہوتے۔ شیخ المشائخ نے فرمایا کہ "حظ و لطف کے لیے زبان جاننے کی کیا ضرورت ہے" یہ فرما کر مثنوی شریف کے چند اشعار ایک خاص انداز سے پڑھے۔ جن کو سن کر شیخ اسعد آفندی پر حال طاری ہو گیا۔ جب افاقہ ہوا تو انہوں نے آپ سے استعمال کی اجازت لی اور اپنی قبا پیش کر کے درخواست کی کہ "آپ اس کو پہن کر تبرکاً مجھے عنایت فرما دیجئے"۔ (کمالات امدادیہ ص ۴۴)

حاجی صاحب کے علوم

جیسا کہ تعلیم کے باب میں گذرا۔ حاجی صاحب نے باقاعدہ تعلیم و تدریس کم حاصل کی تھی۔ لیکن عشق و محبتِ الٰہی اور سوز دروں نے آپ کا سینہ کھول دیا تھا۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام کا سارا علم وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں۔ اسی طرح امتوں میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو بظاہر تو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن اتباعِ سنت اور اپنی عملی زندگی کی وجہ سے ایسا روحانی مقام حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے تربیتِ روحانی حاصل کرتے ہیں۔ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے سینکڑوں افراد گذرے ہیں لیکن آفاقی شہرت کی حامل شخصیتیں دو ہی ہوئی ہیں ایک مولانا جلال الدین رومیؒ کے مرشد حضرت شمس تبریزؒ اور دوسرے ہمارے ممدوح شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ۔ ○

شیخ المشائخ

اور یہ اسی خداداد دولت کی وجہ سے تھا کہ اپنے زمانہ کے بہترین علماء آپ کے گرد جمع ہو گئے اور ان سب نے آپ سے صفائی باطن اور تزکیۂ قلب حاصل کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ "کیا حاجی صاحب عالم بھی تھے۔ آپ نے فرمایا "عالم ہونا کیا معنی اللہ کی ذات پاک نے آپ کو عالم گر فرمایا ہے"۔ امداد المشتاق (صـ۱۰)

اسی کتاب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں :-

گو ظاہری علم شریعت میں علامۂ دوراں اور مشہور زماں مولوی نہ تھے مگر علم لدنی کے جامۂ عنبر شمامہ سے آراستہ اور نور عرفان و ایقان کے زیورات سے سرتاپا پیراستہ (امداد المشتاق صـ۱۵)

امدادِ ثلاثہ میں حکیم الامت کا ایک قول یوں درج ہے :-

حضرت حاجی صاحب نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافیہ لکھ دیں مگر حضرت کے علوم ایسے تھے کہ آپ کے سامنے علماء کی کوئی حقیقت نہ تھی ہاں اصطلاحات تو ضرور نہیں بولتے تھے (صـ۱۸۶)

شیخ المشائخ "مرشدوں کے مرشد" کا لقب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صحیح طور پر صادق آتا ہے بھلا جس آستانہ سے یکتائے روزگار انسانوں نے (جو اپنی اپنی جگہ علم کے دریا اور فضل و کمال کے سرچشمے ہوں) کسبِ فیض کیا ہو۔ اور اس آستانہ کی غلامی پر نہیں فخر و ناز ہو اس کو شیخ مشائخ نہ کہا جائے تو اور اس کو کیا کہا جائے گا۔ گذشتہ کسی صفحے میں چند نامور ترین علماء و مشائخ کی ایک فہرست گذر چکی ہے جو حضرت

○۔ پھر یہ بات بھی عجیب مماثلت رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا رومؒ جیسے انسان کو شمس تبریزؒ کی زبان بنا دیا اسی طرح حضرت مولانا نانوتویؒ کو حضرت حاجی صاحب کی زبان بنا دیا بقول حکیم الامتؒ مولف لعینی مولانا اشرف علی تھانویؒ) نے اکثر زبانِ حق ترجمان حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا جیسے مولانا رومؒ کو حضرت شمس تبریز قدس سرہ کی زبان بنایا تھا۔ (امداد المشتاق صـ۱۱)

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور ان کو خلافت سے سرفراز کیا گیا ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ کوہ گراں، کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ ان علماء کی فہرست سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے جو حاجی صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ پوری امت میں کسی شیخ سے علماء کی اس قدر کثرت نے بیعت نہیں کی تو بے جا نہ ہوگا۔ صاحب تذکرۃ الرشید نے ان کی تعداد سات آٹھ سو بتائی ہے۔ اور اس کی خوشخبری کہ د علماء آپ کے مہمان ہوں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب میں آپ کو دی تھی۔

ایک کشف

خواجہ پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی بھی مکہ معظمہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ خواجہ صاحب حج پر گئے اور وہیں رہنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حاجی صاحب نے آپ کو اس سے منع فرمایا۔ اس کا تذکرہ خود پیر صاحب مرحوم نے کیا ہے۔ "تاریخ مشائخ چشت" میں ہے،

مکہ معظمہ میں ایک دن وہ (خواجہ مہر علی صاحب گولڑوی) حاجی امداد اللہ مہاجر کیؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حاجی صاحب نے نہایت اصرار و تاکید سے ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا:-

در ہندوستان عنقریب یک فتنہ ظہور کند شما ضرور در ملک خود واپس بروید و اگر بالفرض شما در ہند خاموش نشستہ باشید تاہم آں فتنہ ترقی نہ کند و در ملک آرام ظاہر شود

ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نمودار ہوگا تم ضرور اپنے وطن واپس چلے جاؤ اگر بالفرض تم ہندوستان میں خاموش بھی بیٹھے رہو تو وہ فتنہ ترقی نہ کرے گا اور ملک میں سکون رہے گا۔

(ملفوظات طیبہ ص ۱۲۶)

پیر صاحبؒ حاجی صاحبؒ کے اس کشف کو فتنہ قادیانی سے تعبیر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ان کو اس فتنہ کی مخالفت کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنی زبان اور اپنے قلم دونوں سے قادیانیوں کے عقائدِ باطلہ کی پر زور تردید کی۔" ۱ه

خداداد علوم

جیسا کہ گذرا حاجی صاحب باقاعدہ عالم نہ تھے لیکن بمصداق "من عمل بما علم علمہ اللہ مالم یعلم" ۲ه بعض علمی اشکالات اور مسائل کو اس طرح حل کرتے تھے کہ اس کو دیکھ کر علماء حیران رہ جاتے تھے۔ اس کی دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

حسنات الابرار سیآت المقربین

مراتب یقین تین ہیں۔ علم الیقین مرتبہ ادنیٰ۔ عین الیقین مرتبہ وسطیٰ۔ حق الیقین مرتبہ اعلیٰ ہے۔ عین الیقین سے علم الیقین میں جانا۔ حسنات الابرار سیآت المقربین۔ حق الیقین مرتبۂ فنا و فنی الفنا ہے۔ مثال اس کی یوں ہے کہ علم حرارت آتش کا علم الیقین ہے اور جب اس پر انگلی رکھی جائے عین الیقین ہوا اور جب لوہے کو خوب آگ میں سرخ کیا جائے وہ اس وقت لوہا انا النار (میں آگ ہوں) کہے بجا ہے یہ مرتبہ حق الیقین ہے (امداد ص ۵۳)

دو حدیثوں کی مطابقت

"فرمایا ایک دن دو طالب علم آپس میں بحث کرتے تھے ایک کہتا تھا کہ نماز بدون حضور قلب درست نہیں ہے کیونکہ لاصلوٰۃ الا بحضور القلب (نماز دل کی حاضری کے بغیر نہیں ہوتی) اور دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کرتا تھا کہ آنحضرت فرماتے ہیں۔ انی اجھز الجیش و انا فی الصلوٰۃ (میں نماز پڑھنے کے دوران میں لشکر کا انتظام کرتا ہوں) اس سے زیادہ کون امر منافی نماز ہو سکتا ہے آخر الامر آپ (حضرت حاجی صاحب) سے محاکمہ چاہا ارشاد ہوا کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے مقربوں کو جب بادشاہوں کی حضوری ذاتی ہے امور لاحقہ پیش آمدہ عرض کرتے ہیں اور استمزاج چاہتے ہیں اور بجا آوری خدمت کی کوشش کرتے ہیں پس یہ عین حضوری ہے نہ منافی حضوری" (امداد ص ۵۰، ۵۱)

۱ه تاریخ مشائخ چشت ص ۱۳-۱۴

۲ه جو اپنے پڑھے پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم سکھاتے ہیں جن کو وہ کسی سے نہیں پڑھتا۔

خدا کو دنیا میں دیکھنا

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک دفعہ حضرت حاجی صاحبؒ سے سوال کیا کہ خدا کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے یا نہیں فرمایا:-

"ممکن ہے معنی آیۃ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ کے یہ ہیں کہ اس بصارت ظاہری سے رویت حق تعالیٰ کی ممکن نہیں ہے اور جب نظر بصیرت (باطنیہ) حاصل ہو جاتی ہے۔ بصارت (ظاہری) پر غالب آتی ہے پس عارف حقیقت میں نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اور اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس کی غلطی ہے دلیل اس بات کی کہ اس نظر سے نہیں دیکھتا ہے کہ آنکھ بند کرے رویت بدستور رہے دوسرے یہ کہ دیدہ آنکھوں کی عارضی نور آفتاب کی محتاج ہے بخلاف اس دید کے کہ محتاج نور بصیرت ہے بدون پر تو اس نور کے غیر ممکن و محال ہے پھر مولانا اشرف علی صاحبؒ نے کہ خطاب لَنْ تَرَانِیْ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیوں کہا گیا (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ اس میں نفی رویت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور یہ درست ہے کہ عارف (خدا کا پہچاننے والا) اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا ہے بلکہ دیدۂ حق سے دیکھتا ہے اور نیز اس میں نفی رویت ذات ہے کیونکہ فنائے عبد اس کو لازم ہے اور جب فنا ہوا پھر رویت کیا" (امداد ص۱۰)

الدعاء مخ العبادۃ

دعا کی چار قسمیں ہیں۔ اوّل دعائے فرض مثلاً نبی کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کے واسطے بلا کی دعا کرے پس اس پر یہ دعا کرنا فرض ہے دوئم دعائے واجب جیسے قنوت (وتر دن میں) سوئم دعائے سنت جیسے بعد تشہد التحیات پڑھنے کے بعد اور ادعیۂ ماثورہ چہارم دعائے عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں اور اس سے محض عبادت مقصود ہے کیونکہ دعا میں تذلل ہے اور تذلل (عاجزی) حق تعالیٰ کو محبوب ہے لہٰذا اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (دعا عبادت کا مغز ہے) وارد ہوا ہے (امداد ص۵۰ - ۵۱)

اتباع سنت وکرامت

اکابر دیوبند کے سلسلۃ الذہب میں اصل چیز اتباع سنت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مشرب کے تمام مشائخ شریعت کے سخت پابند اور متبع سنت تھے۔ اور اس سلسلہ کا ہر شیخ تقریباً ولی تھا۔ جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلے گا۔ کرامات کو برحق جانتے ہیں کہ ان کا صدور اہل کمال سے ہوتا ہے لیکن ولایت کا انحصار اس پر نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکثر حضرات صاحب کرامت ہونے کے باوجود اس قسم کی چیزوں کا بہت اخفاء کرتے تھے۔ کہ عوام اس طرح کے نفوس ہی کو بزرگی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ بلکہ اس سلسلہ میں تو کرامت کو ظاہر کرنا کم حوصلگی سمجھا جاتا ہے۔ ایک دفعہ حاجی صاحب کے بہت سے مہمان آگئے کھانا کم تھا حضرت حاجی صاحب نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو ڈھانک دو کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھالیا اور کھانا بچ رہا۔ حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کو خبر ہوئی تو حضرت شہیدؒ نے فرمایا کہ "حضرت آپ کا رومال سلامت چاہیئے اب تو قحط کیوں پڑے گا" حضرت حاجی صاحب شرمندہ ہوگئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہوگئی توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔ (بحوالہ امداد)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کرامت دکھا کر شرمندہ ہوئے اور ایسا کرنے کو اچھا نہ سمجھا

ایک اور کرامت

آپ کی ایک کرامت "تذکرۃ الرشید" اور دوسری کئی کتب میں موجود ہے کہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ حضرت کے بھی وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ کسی نے ضلع انبالہ کے کلکٹر کو اطلاع دی کہ حاجی صاحب راؤ عبداللہ رئیس پنجلاسہ ضلع انبالہ کے اصطبل میں مقیم ہیں۔ کلکٹر بذات خود اصطبل پر آموجود ہوا اور رئیس

صاحب سے کہنے لگا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس عمدہ گھوڑے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اصطبل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ معتقدین سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ انگریز کلکٹر جب اندر داخل ہوا بستر لگا ہوا اور مصلی بچھا ہوا تھا اور وضو کا لوٹا بھی موجود تھا اس کے پانی سے زمین تر تھی یہ سب کچھ تھا مگر حاجی صاحب غائب تھے لیکن جب وہ چلا گیا تو حاجی صاحب کو مصلے پر پایا گیا۔

قطب ارشاد

"نفحات مکیہ" کے مترجم شمائم امدادیہ" میں لکھتے ہیں :۔ اولیائے عصر آپ کی ولایت پر اجماع رکھتے ہیں اور علمائے زمان آپ کے علو منزل کا اعتراف کرتے ہیں حضرت حق سبحانہ نے علوم اسماء وصفات سے آپ کو مخصوص فرمایا ہے اور معارف خاص وخصوصیات علوم اعلیٰ سے مقامات مرحمت فرمائے ہیں۔ (شمائم ص۲۷)

آگے چل کر یہی مترجم لکھتے ہیں :۔

قطبوں کا ایک گروہ مامور بسکوت کلیہ نہیں ہوتا بلکہ اسرار معارف و دقائق تصوف و نکات حروف واسماء وغیرہا سے کہ بظاہر حقیقت شریعت سے مخالف معلوم ہوتے ہیں ممنوع ہوتے ہیں ایسے لوگ تعلیم وارشاد میں مشغول رہتے ہیں اور بندگان خدا کو منافع پہنچاتے رہتے ہیں اور داعی الخلق الی الحق رہتے ہیں اور حقیقت میں قطب ارشاد یہی ہیں حضرت (حاجی صاحب) اسی جماعت سے ہیں۔ (شمائم امدادیہ ص۳۰)

حضرت حاجی صاحب رح کے قطب ارشاد اور شیخ المشائخ ہونے میں کیا شبہ ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند رح۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رح۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح۔ حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری۔ حضرت مولانا احمد حسن امروہوی رح حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح جیسے اکابر علماء اور یگانۂ روزگار فضلاء جس کی غلامی پر فخر کرتے ہوں اس کی بندگی اور ولایت میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

وفات

مرض وفات میں استغراق کے ساتھ ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کروٹ تک بدلنا دشوار تھا، اشتہا بالکل جاتی رہی تھی۔ آخر ۱۳ جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء کو چہار شنبہ کے دن فجر کی اذان کے وقت چوراسی سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا جنت المعلیٰ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رح نے مادہ تاریخ وفات نکالا حبیبؒ دخل الخلد

۱۳۱۷

کراماتِ امدادیہ

کرامت ۔ حضرت حاجی صاحب یوں فرمایا کرتے تھے ۔ کہ بھائی ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستان کا اور ایک باب بوستان کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند اوراق زلیخا کے پڑھے تھے ۔ اور حصن حصین حضرت مولوی قلندر صاحب سے پڑھی بعد میں شوق ورد و وظائف کا ہوا ۔ اور دہلی میں آکر حضرت شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت کی لیکن ان کے وصال کے پھر کسی کامل کی جستجو ہوئی ۔ ایک روز خواب میں بشارت ہوئی ۔ اور آپ کا ہاتھ حضرت میاں جی صاحب (حضرت نور محمد جھنجھانویؒ) کے ہاتھ میں دے دیا گیا ۔ اور اس سے اور بھی بے قراری ہوئی ایک روز مولوی قلندر صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ کو بہت بیقراری ہے تو لوہاری جاکر حضرت میاں جی صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی تسکین کرو بموجب ارشاد مولوی صاحب کے آپ لوہاری پاپیادہ تشریف لے گئے ۔ حضرت ممدوح المناقب نے دیکھتے ہی فرمایا کہ میاں خواب و خیال کا کچھ اعتبار نہیں اس فرمانے سے دل بیقرار کو کچھ قرار ہوا اور اسی وقت حضرت میاں جی صاحب نے آپ کو سلسلۂ بیعت میں داخل کرلیا ۔

کرامت :۔ ایک روز موسم سرما میں حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب لنگوٹا کسے ہوئے اور کمبل سر پر ڈالے ہوئے آگے تو دلوں پیچھے قاضی نجابت علی خاں اور بہت سے ہمراہی پیر محمد والی مسجد کے روبرو گزرے اور شارع عام سے جانب شمال میں زمین پر بیٹھ گئے پاس ہی میں جناب حاجی صاحب مسجد سے باہر تشریف لائے اسی وقت حافظ صاحب نے تمام بدن اپنا کمبل ڈھانک لیا اور ستر کو چھپالیا ۔ اور وہاں سے اٹھ کر اپنی جگہ شمالی دروازہ تشریف لے گئے ۔

کرامت :۔ حضرت حاجی صاحب کبھی کبھی جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب موصوف کی ملاقات کے لیے جنگل میں تشریف لے جاتے اور پہلے سے بہت آدمی حافظ صاحب کی تلاش میں جمع ہوکر منتظر بیٹھے رہتے اور آپ کسی سے نہ ملتے جس وقت حاجی صاحب وہاں پہنچتے فوراً کسی جھاڑی میں سے نکل آتے اور ملاقات کرتے اور بہت نرمی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور پھر رخصت کردیتے ۔

کرامت :۔ ایک روز نصف شب کے وقت ایک سفید باف آیا اور آپ کو جگا کر عرض کیا کہ حضرت میری لڑکی کو آسیب کی خلش سے بہت تکلیف ہے ۔ آپ تشریف لے چلیں اور اس کا علاج فرمادیں اسی وقت آپ اس کے ہمراہ ہوئے ۔ وہاں جاکر دیکھا کہ میاں اللہ بخش اس کے سر پر موجود ہیں انہوں نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ آج اس نے اپنی زبان سے ایسے ایسے کلمات ہماری نسبت کہے تھے اس لیے ہم یہاں آگئے تھے ۔ آپ تشریف لے آئے ہم جاتے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہ آویں گے ۔ آئندہ آپ کسی کی درخواست پر ایسے وقت تشریف نہ لایا کریں ۔ صرف ایک تحریر اسکے ہاتھ بھیج دیا کریں موافق اس کے تعمیل کیا کروں گا ۔ مجھ سے آپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی ۔ پھر جب کہیں ایسی شکایت ہوتی آپ ایک پرچے پر اپنا نام نامی لکھ کر دے دیتے وہ شکایت رفع ہوجاتی ۔

کرامت :۔ بعض لڑکے بلا اطلاع کہیں چلے جاتے اور ان کے اقارب پریشان ہوتے ۔ حضرت کے روبرو جس وقت کسی لڑکے کے چلے جانے کا ذکر آتا حضرت اسی وقت دستک دے دیتے وہ لڑکا اس وقت جس جگہ ہوتا تھا اس سے آگے نہ بڑھتا وہاں ہی سے

بیس بڑے مسلمان

واپس اپنے گھر چلا آتا آپ فرمایا کرتے کہ جس وقت فرار کا حال معلوم ہو اگرے فوراً بیان کر دیا کریں جس قدر جلدی بیان کر دیا جائیگا اتنا ہی جلدی وہ لڑکا واپس آجاویگا اور جس قدر دیر کی جاوے گی اتنی ہی دیر سے واپس آوے گا۔

کرامت:۔ (بروایت حافظ قاری مولوی احمد مکی) ۱۳۰۸ھ میں احقر جب سفر ہند کے قصد سے آگبوٹ میں سوار ہوا اور بعد گزرنے عدن کے چھ روز گزرے آگبوٹ کا کوئلہ تمام ہوگیا۔ جس کے باعث انجینر مع کپتان و معلم کے بہت حیران و پریشان ہوئے حتی کہ رسیاں و تختے جلانے کی نوبت پہنچی۔ احقر نے انجینر سے پوچھا بھلا رسیوں اور تختوں کا جلانا کچھ مفید ہے۔ اور آگبوٹ موافق معمول کے چلتا ہے یا کم اس نے کہا موافق معمول چلتا تو درکنار پانی کے زور سے کسی قدر پیچھے ہٹ جاتا ہے تب احقر نے نہایت ملول ہو کر کہا پھر رسیوں کا جلانا کیا مفید ہے۔ کیا فقط انجن گرم رہنے کے لیے یہ گفتگو بعد الظہر ہوئی اور وہ باقی روز نہایت شدت سے گزرا شب کے وقت ایک بجے نیم خوابی کی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت اعلیٰ مدظلہ العالی رؤس المسترشدین احقر کو نہایت دلجوئی سے فرما رہے ہیں کہ تو کیوں گھبرا رہا ہے کل انشاء اللہ بندہ بمبئی ساتھ سلامتی کے پہنچے گا۔ اسی وقت بیدار ہوا اور اپنے وظیفہ و ورد میں مشغول رہا۔ اور انجینر پھرتے پھرتے میرے پاس آن پہنچا اور کہا کہ اس وقت آگبوٹ ان ہی رسیوں اور لکڑوں کے زور سے کچھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک آگبوٹ نظر آیا اور روشنی صبح کی ظاہر ہوئی اپنی اصطلاح خاص میں اس کو کچھ کہا کہ وہ آگبوٹ نزدیک آیا اور تھوڑے کوئلے ان سے لے کر کے لینے کی دیر تھی کہ آگبوٹ کی رفتار ایسی ہوئی کہ وہی انجینر کہتا تھا۔ کہ جب سے میں اس آگبوٹ کا ہوں ایسی چال کبھی نہیں چلا پھر میں نے پوچھا اب کب پہنچے گا۔ کہا کل صبح کو۔ احقر متحیر ہوا کہ حضرت نے فرمایا آج کے روز اور یہ کہتا ہے کہ کل۔ خیر اسی خیال میں ایک عرصہ گزر گیا باامداد اللہ تعالےٰ اسی روز مع الخیر والسلامۃ بمبئی پہنچے اور شہر میں اترے۔

کرامت:۔ اب بالفضل اسی ماہ میں مولوی محمد شفیع الدین صاحب واسطے نماز صبح کے غسل کے وقت جا رہے تھے راہ میں اتفاقاً گر گئے۔ اور پسلی میں کچھ تکلیف ہوئی حضرت اعلیٰ نے مکان پر صبح کے وقت چند بار فرمایا کہ مولوی شفیع الدین صاحب کو بہت تکلیف ہوئی اور ہنوز نہ کوئی آیا اور نہ کوئی گیا۔ جب مولوی صاحب تشریف لائے تب معلوم ہوا۔

(راوی حافظ قاری مولوی احمد مکیؒ) کرامات امدادیہ

کرامت:۔ ایک مرتبہ یہ ناچیز بقصد حرمین شریفین دہلی سے چلا بمبئی میں سوتا تھا خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت تشریف لائے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ تو ہم ہی ہندوستان میں آگئے تم مکے نہ جاؤ میں نے عرض کیا کہ حضور اب تو یہاں آگئے۔ اور جہاز کا کرایہ بھی کر دیا اور کل جہاز روانہ ہو جائیگا فرمایا نہیں، جانا مناسب نہیں میں عرض کرتا رہا۔ ارشاد ہوا کہ نہیں اس سال نہ جاؤ آنکھیں کھلیں فی الجملہ تردد رہا۔ مگر اس دن جہاز کی روانگی تھی میں اس بھید سے واقف نہ تھا سوار ہو لیا اور جہاز روانہ ہوا اسی دن ایسا طوفان آیا کہ جہاز میں نقصان آگیا۔ اور جہاز واپس آیا۔

(راوی مولانا شاہ محمد حسین صاحبؒ الہ آبادی) کرامات امدادیہ

کرامت:۔ ایک دن ظہر کے بعد میں اور مولوی منور علی صاحب اور ملا محب الدین صاحب کو ضروری بات عرض کرنے کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت حسب معمول اوپر جا چکے تھے۔ کوئی آدمی تھا نہیں کہ اطلاع کرائی جاتی آواز دینا ادب کے خلاف تھا۔ آپس میں شروع یہ کیا کہ حضرت کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائیں یا بات کا جواب مل جائیگا یا حضرت خود تشریف لاویں گے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ حضرت اوپر سے نیچے تشریف لائے ہم لوگوں نے معذرت کی کہ اس وقت حضرت لیٹے ہوئے تھے۔ ناحق

بلیس بڑے مسلمان

یہ امر مذموم اور ممنوع ہے قال اللہ تعالیٰ

کرامت :- فرمایا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے حالات کی چھان بین میں رہتے ہیں
بزرگوں کے حضور میں اپنے دل کی نگہداشت کرنا چاہیئے۔
لاتدخلو ابیوتا غیر بیوتکم

پیش اہل دل نگہدارید دل
ع

میں نے کہا کہ یہ امر بہت برا ہے
ایک دن ایک صاحب میرے پاس آئے اور اپنی نسبت سے میر تفتیش حال کرنے لگے
یہ سن کر میرے زانو پکڑ لیے اور عذر کرنے لگے۔
حامل نسبت اگر اپنی پونجی چھپانا چاہے تو پتہ بھی نہ لگنے دے

اور مجھ کو اوراد کا شائق پایا
کرامت :- فرمایا کہ میرے بڑے بھائی شیخ ذوالفقار علی صاحب جب ملک پنجاب سے واپس آئے
فرمانے لگے کہ مجھ کو ایک فقیر نے ایک عمل بتلایا ہے تم سیکھ لو میں نے اس کو ان سے لے لیا۔ ایک مرتبہ میرا دھلی جانا ہوا وہاں عبداللہ مسند نشیں درگاہ حضرت صابر بخش نے تقریب عرس میں مجھ کو بلوایا اور کسی اپنے مرید کا ہاتھی سواری کو بھیجا جب میں ان کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ لوگ بڑی شان و شوکت سے جمع ہیں میں فقیرانہ حالت سے گیا مجھ کو دیکھتے ہی تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور دست بوسی کرکے مسند خاص پر بٹھایا۔ مجھ کو بڑا تعجب تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جب رات کو وظیفہ پڑھنے لگا تو معلوم ہوا کہ سب اسی وظیفہ کا اثر ہے خواب میں حضرت پیر و مرشد نے فرمایا کہ اس اعزاز سے کیا حاصل مجھے معلوم ہوا کہ آپ اس عمل سے ناراض ہیں اسی وقت ترک کر دیا پھر نہیں پڑھا۔

کرامت :- فرمایا کہ حافظ غلام مرتضیٰ مجذوب مقیم پانی پت سالک مجذوب تھے حالت سلوک میں ان کو جذب ہو گیا تھا۔ ہماری بستی میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک بار غل ہوا کہ غلام مرتضیٰ پھتر مارتے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ مجھ کو دیکھ انہوں نے پھتر مارنا چھوڑ دیئے اور مجھے قریب بلایا میرے ہاتھ میں کوئی کتاب عشق تھی اس کے اوراق کھلوائے گئے جب یہ شعر نظر پڑا ؎

عشق اول عشق آخر عشق کل   عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل!

مجھ کو اشارہ کیا اور بشارت غلبۂ توحید کی دی فرمایا کہ جو اسرار توحید میری زبان سے بے ساختہ نکل جاتے ہیں یہ اسی بشارت کا ثمرہ ہے۔

کرامت :- فرمایا کہ ایک دفعہ میں صحرا میں پھر رہا تھا ایک جھاڑی میں کچھ آثار آدمی کے معلوم ہوئے غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہی مجذوب صاحب ہیں مجھ کو دیکھ کر بیٹھ گئے میں بھی بیٹھ گیا میری طرف توجہ جذب کر دینا شروع کی جب مجھے آثار جذب معلوم ہونے لگے میں نے حضرت پیر و مرشد کا تصور کیا اسی وقت حضرت میرے اور ان کے درمیان حائل ہو گئے مجذوب صاحب تبسم کرنے لگے میں نے عرض کیا کہ تمہاری طرح مجھ کو دیوانگی پسند نہیں ہے۔

کرامت :- پنبلاسر میں ایک بار آپ مکان میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک سکھ آپ کی خبر پا کر گرفتاری کے لیے آیا گھوڑے پر سے اتر کر دروازے پر کھڑے ہو کر مکان کے اندر جھانکا اور آپ پر نظر پڑتے ہی لوٹنا شروع کیا اور تھوڑی دیر کے بعد سوار ہو کر واپس چلا گیا۔ از حضرت گنگوہیؒ۔

۵۔ درد نامۂ غمناک

یہ آٹھ صفحوں پر ایک سو پچھتر اشعار کی کتاب ہے۔ شاعر نے عشقِ حقیقی اور جذبۂ بے خودی کی ترجمانی کی ہے۔ کتاب اتنی موثر اور دردناک ہے کہ پڑھ کر دل چوٹ کھاتا اور بے تاب ہو ہو جاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کی روایت کے مطابق ایک شخص یہ "درد نامۂ غمناک" پڑھ رہا تھا حاجی صاحب اس پر گذرے اور پوچھا کیا پڑھ رہے ہو وہ بے رخی سے پیش آیا۔ بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے ناظم یہی ہیں تو بہت شرمندہ ہوا اور نہایت تعظیم کی۔

۶۔ ارشادِ مرشد

اردو میں یہ سولہ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس میں نمازوں کے بعد وظائف۔ اوراد۔ مراقبات طریق اثبات مجرد۔ طریق اسم ذات۔ طریق ذکر پاس انفاس ذکر اسم ذات ربانی اور لطائف ستہ کا ذکر ہے آخر میں چاروں سلسلوں کے شجرے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ آخر میں مثلث نظم میں چشتی شجرہ ہے۔ سب سے آخر میں نصائح ہیں۔ ۲ ؍ جمادی الاول ۱۲۹۳ھ میں یہ رسالہ مکمل ہوا۔

۷۔ ضیاء القلوب

یہ کتاب حاجی صاحبؒ نے حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے صاحبزادہ حافظ محمد یوسف کی فرمائش پر مکہ مکرمہ میں ۱۲۸۲ھ میں فارسی میں تحریر فرمائی۔ اور اس کا تاریخی نام "مرغوبِ دل" ہے اس کتاب کے متعلق حاجی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

" از وفورِ التماس عزیزاں چارہ ندیدہ و ملتجی بجناب قدس حق تعالیٰ گردیدم پس بدلم القا شد کہ بنویس " دوستوں کی کثرت خواہش پر کوئی چارہ نہ دیکھ کر خدائے قدس کی بارگاہ میں ملتجی ہوا اور میرے دل میں القا ہوا کہ لکھ۔

یہ کتاب سلوک و تصوف کا جوہر اور خلاصہ ہے۔ اس میں ہر قسم کے وظائف، اشغال اور اذکار عبادات کے تحت بیان کئے گئے ہیں اپنے عنوان پر نہایت عمدہ کتاب ہے۔ نماز اور تلاوتِ قرآن مجید کے متعلق بیش بہا معارف بیان کئے گئے ہیں۔

۸۔ وحدۃ الوجود

سات صفحات پر فارسی زبان کا طویل مکتوب ہے۔ جس میں وحدۃ الوجود کے مسئلے پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

۹۔ فیصلہ ہفت مسئلہ

بارہ صفحات کے اس رسالے میں میلادؐ۔ فاتحہؒ۔ عرسؒ و سماعؒ۔ ندائے غیر اللہ۔ جماعت ثانیہ امکان نظیر اور امکانؒ کذب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رسالے کی ضرورت و اہمیت یوں پیدا ہوئی کہ حضرت حاجی صاحب کے متوسلین میں ان مسائل پر نزاع ہو رہا تھا آپ نے اس نزاع کو روکنے اور اختلاف سے بچنے کے لیے یہ رسالہ تحریر فرمایا۔ مندرجات سے آگاہ ہونے کے لیے قارئین اس کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۰۔ گلزار معرفت

یہ حاجی صاحب کا اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کو آپ کے مرید باصفا میاں نیاز احمد نے جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ حمد۔ نعت۔ عشقِ حقیقی کے متعلق غزلیات اور قیام مدینہ منورہ کے شوق وغیرہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ۳۱۹۔ اردو کے اور ۹۳۔ فارسی کے اشعار ہیں۔

۱۱۔ "مرقومات امدادیہ" اور "مکتوبات امدادیہ"

کے نام سے ایک سو گیارہ خطوط ہیں جو حضرت گنگوہیؒ۔ حضرت نانوتویؒ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب۔ مولانا حکیم ضیاء الدین اور حاجی عابد حسینؒ کے نام ہیں۔ "مکتوبات امدادیہ" میں حکیم الامت کے نام پچاس خطوط ہیں جو تمام کے تمام اردو میں۔ حضرت تھانویؒ کے نام آخری خط ...

ترتیب: عبدالرشید ارشد

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ پر یہ مضمون ۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی تالیف سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا محمد سرفراز صاحب صفدر گکھڑوی کی کتاب "بانیٔ دیوبند" مفتی عزیز الرحمٰن کی تالیف تذکرہ مشائخ دیوبند اور علمائے حق سے ماخوذ ہے ۔ ہمارا کام صرف ترتیب ہے (راشد)

نام ولادت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی نام خورشید حسن ہے۔ آپ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دوست حضرت مولانا محمد یعقوب مؤلف سوانح عمری مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں۔ مولانا صاحب کی پیدائش کا سن مجھے ان کے تاریخی نام سے معلوم تھا مہینہ یاد نہیں تھا۔ ربیع الثانی یا جمادی الثانی ذہن میں تھا۔ جن حضرات کے بارے میں خیال تھا کہ ان سے مہینہ اور تاریخ معلوم ہو جائیں گی۔ وہ بھی ناواقف نکلے۔ ایک صاحب نے پندرھویں شعبان کہا۔ مگر اعتبار نہ آیا۔ ایک نے ۱۹ رمضان المبارک اور ایک صاحب نے ۲۰ محرم تاریخ ولادت بتائی۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

نسب نامہ خاندان مولانا کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب تھے۔ جو بامروت و صاحب اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی و پرہیزگار تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کے ساتھ دہلی جا کر شاہنامہ وغیرہ بھی پڑھی تھیں۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ کھیتی باڑی میں گزرا۔ مولانا محمد قاسم کے دادا شیخ غلام شاہ تھے۔ ان کی بھی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ مگر بڑے ذاکر و شاغل بزرگ تھے۔ درویشوں کی خدمت کرتے تھے۔ خواب کی تعبیر دینے میں مشہور تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مختصر نسب نامہ یہ ہے۔ محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاؤ الدین بن فتح محمد بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی ہاشم نانوتوی[1]

ابتدائی تعلیم وغیرہ مولوی محمد ہاشم شاہجہان بادشاہ کے دور میں مقرب شاہی تھے۔ چند دیہات اور مکان جاگیر میں تھے۔ لیکن تغیرات زمانہ نے خاندان والوں کے پاس کچھ نہ چھوڑا۔ مولانا محمد قاسم بچپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز وسیع حوصلہ، جفاکش، جری اور چست تھے۔ مکتب میں اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ قرآن مجید بہت جلد ختم کر لیا تھا۔ خط بھی سب ساتھیوں میں اچھا تھا۔ شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اپنے کھیل اور بعض قصے نظم کر لیا کرتے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ننھیالی رشتہ مولانا محمد قاسم کے خاندان سے ملتا تھا اور حضرت کی بہن نانوتہ میں بیاہی ہوئی تھی۔ آپ اسی وجہ سے اکثر اپنی بہن سے ملنے نانوتہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے حضرت سے جلد سازی سیکھی تھی۔ اپنی اپنی کتابوں کی جلد خود باندھ لیا کرتے تھے۔ نانوتہ میں آپ کے خاندان میں ایک ایسا قضیہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو نانوتہ سے دیوبند بھیجا گیا۔ شیخ کرامت حسین کے گھر پر شیخ نہال احمد صاحب پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انہوں نے عربی پڑھائی۔ پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس آ گئے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۰

سے کچھ پڑھا۔ فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں حاصل کیں۔ اس کے بعد مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ ۲ محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے۔ مولانا نے کافیہ شروع کی۔ معقول کی مشکل کتابیں میرزاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسے پڑھا کرتے تھے۔ جیسے حافظ قرآن سناتا ہے۔ حدیث آپ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے تحصیل کی۔ اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے[1] مولوی مملوک علی صاحب نے آپکو مدرسہ عربی یعنی دہلی کالج میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال پر معترض نہ ہونا۔ میں ان کو پڑھا دونگا۔ اور مولانا نے فرمایا کہ تم اقلیدوں کو دیکھ لو اور حساب کے قواعد کی مشق کر لو۔ چند روز کے بعد مشہور ہوا کہ مولانا محمد قاسم نے حساب پورا کر لیا ہے۔ اور مقالے بھی دیکھ لیے۔ چنانچہ منشی ذکاء اللہ صاحب کسی ماسٹر کے بتائے ہوئے چند سوال لائے جو نہایت مشکل تھے۔ مولانا سے پوچھے تو آپ نے فوراً حل کر دیئے۔ اس سے آپ کی حساب دانی کی بڑی شہرت ہوئی۔ دہلی کالج سے امتحان دیئے بغیر علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور مطبع احمدی میں کتب کی تصحیح فرمانے لگے تھے۔ ۱۱ر ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو آپ کے استاذ مکرم مولانا مملوک علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو آپ اپنے استاذ زادہ مولانا محمد یعقوب رح کے پاس مقیم ہو گئے۔ مولانا مملوک علی صاحب کا مکان کوچہ چیلاں میں تھا

حاشیہ بخاری شریف

مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے والد کے بعد ایک سال دہلی میں رہے۔ جب اجمیر میں ملازمت مل گئی تو اجمیر چلے گئے۔ مولانا یعقوب صاحب کے اجمیر جانے کے کچھ دن بعد مولانا محمد قاسم نے مطبع احمدی میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر دار البقا میں چند روز رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رح نے تحشیہ بخاری کا کام شروع کر رکھا تھا۔ پانچ چھ سپارے آخر کے رہ گئے تھے۔ وہ مولانا قاسم نانوتوی کے سپرد کر دیئے۔ مولانا نے ان کو لکھا اور قابل رشک لکھا۔ لیکن بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور مولانا احمد علی صاحب سے کہا۔ آپ نے یہ کیا کام کیا۔ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کر دیا۔ اس پر مولانا احمد علی صاحب نے فرمایا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بغیر سمجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ انھیں دکھلایا۔ تب لوگوں نے مولانا محمد قاسم کی قابلیت کو سمجھا اور جانا۔ یہ سپارے بخاری میں اور سپاروں سے مشکل ہیں۔ خاص طور پر مذہب حنفیہ کا جو التزام ہے۔ اس جگہ پر امام بخاری نے حنفیہ پر اعتراض کئے ہیں۔ ان کے جواب لکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس حاشیہ میں یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی بات بلا سند کے نہ لکھی جائے۔[2]

بچپن کا ایک خواب

آپ نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں۔ تو ان کے دادا نے (جو تعبیر خواب میں مشہور تھے) یہ تعبیر بتائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہو گے۔[3]

حضرت مولانا جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے۔ ہر کھیل میں خواہ ذہانت کا ہو خواہ محنت کا۔ سب سے اول اور غالب رہتے تھے۔ خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل جوڑ توڑ نام ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولانا نے جب اس کا قاعدہ معلوم کر لیا۔ پھر یاد نہیں کسی سے مات کھائی ہو۔ بہت ہوا تو برابر رہے۔ بلکہ ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا۔ وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے تھے۔[4]

---

[1] سوانح عمری مولانا محمد قاسم صـ [2] آج تک برصغیر پاک و ہند میں بخاری شریف جتنی دفعہ جہاں کہیں چھپی ہے۔ اسی حاشیے کے ساتھ چھپی ہے۔ دار العلوم کے علاوہ یہ بھی مولانا کا صدقہ جاریہ ہے۔

[3] سوانحعمری مولانا محمد قاسم رح از مولانا محمد یعقوب نانوتوی صـ۳ [4] ایضاً صـ۵۔

طالب علمی میں خواب

۱؎ ایام طالب علمی میں آپ نے ایک اور خواب دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ اپنے استاد حضرت مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہو گا۔ اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ دارالعلوم دیوبند نے برصغیر پاک و ہند میں خصوصاً پورے عالم اسلام میں عموماً جو کتاب و سنت و فقہ کی اشاعت کی ہے اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ توحید و رسالت، خدا ترسی اور فکر آخرت پیدا کر کے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کو باخدا بنا دیا۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی حقوق العباد کا صحیح جذبہ پیدا کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کسی بھی حال میں اسلام کے تیرہ سو سالہ تسلسل اور اسلاف کی وابستگی میں سر مو فرق نہیں آنے دیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں سے کسب فیض کرنے والے علماء و فضلاء کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے لیے ایک ضخیم جلد درکار ہو گی۔ علم ظاہر اور باطن دونوں میں یکساں ماہر افراد تیار کیے۔ جن کے اجمالی تذکرہ کے لیے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ اسی چیز کو دیکھ کر اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے فرمایا تھا۔

ہے دل روشن مثال دیوبند اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

گر علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو اک معزز پیٹ بس اس کو کہو!

مرشد کی زبان

حضرت مولانا محمد قاسم کی علمی قابلیت اور تقویٰ بے مثل و بے نظیر تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد قاسم کے بارے میں فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے۔ اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت شمس تبریز کے واسطے مولانا رومؒ کو لسان بنایا تھا۔ اور مجھ کو مولانا محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے بیان کر دیتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے میرٹھ میں مثنوی مولانا رومؒ پڑھانی شروع کی جس سے سننے والوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کے سننے والوں میں ایک شخص ایسے بھی تھے جو رنگ باطنی رکھتے تھے۔ ان کی خواہش ہوئی کہ مولانا محمد قاسم کو فیض باطنی دیا جائے چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم سے درخواست کی کہ آپ کبھی تنہا ملیے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے چھاپہ خانہ کے کام اور طلبا کے پڑھانے سے فرصت نہیں ملتی۔ تنہائی کہاں میسر ہوتی ہے۔ آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔ ——— یہ بزرگ ایک روز مولانا صاحب کے پاس تشریف لائے اور آپ سے کہا کہ میری طرف متوجہ ہوں۔ آپ نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ یہ بزرگ آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے اور توجہ دینی شروع کی۔ ان بزرگ کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ کبھی گرنے کے قریب ہو جاتے تھے اور کبھی سنبھل کر بیٹھتے تھے۔ کچھ دیر یہ سلسلہ چلا۔ اس کے بعد یہ اٹھ کر اور نیچی نگاہ کر کے چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا سے معذرت کی۔

ایک اور خواب

ارواح ثلاثہ میں ہے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ ——— "میں خانہ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی جگہ پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور ادھر سے ایک نہر ہے جو

۱؎ مولانا مملوک علیؒ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے والد اور حضرت گنگوہی۔ حضرت نانوتوی اور سر سید احمد خاں مرحوم کے استاد تھے۔

۲؎ سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ۔

۳؎

میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے"۔

اس خواب کو انھوں نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۲ھ برادر شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے اس عنوان سے بیان فرمایا کہ حضرت ایک شخص نے اس قسم کا خواب دیکھا ہے تو انھوں نے یہ تعبیر دی کہ اس شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ہو گی اور وہ بہت پکا حنفی ہو گا اور اس کی خوب شہرت ہو گی۔ لیکن شہرت کے بعد اس کا جلد انتقال ہو جائے گا۔ اور اس خواب کی تعبیر پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے تلامذہ اور دارالعلوم دیوبند نے فقہ حنفی کی جو خدمت کی ہے۔ اسکا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض کتابیں فاتحہ خلف الامام پر توثیق الکلام اور الدلیل المحکم اور بیس رکعات تراویح پر مصباح التراویح وغیرہ اور اسی طرح دیگر مسائل مختلف فیہا پر جو مضامین اور دلائل لکھے ہیں۔ وہ علمی دنیا میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

سادگی و کسرِ نفسی

مولانا محمد یعقوب تحریر فرماتے ہیں:۔

بہت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے۔ مزاج تنہائی پسند تھا اور اول عمر سے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے۔ اس لیے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ ان کے حال سے بھلا ہو یا برا۔ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے۔ یہاں تک کہ اگر بیمار بھی ہوتے۔ تب بھی شدت کے وقت کسی نے جان لیا تو جان لیا۔ ورنہ خبر بھی نہ ہوتی۔ اور دوا کرنا تو کہاں۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے چھاپہ خانہ میں حسب کام کیا کرتے تھے۔ مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں کوئی نام لیکر پکارتا تو خوش ہوتے۔ تعظیم سے نہایت گھبراتے۔ بے تکلف ہر کسی سے رہتے۔ جو شاگرد یا مرید ہوتے ان سے دوستوں کی طرح رہتے۔ علماء کی وضع عمامہ یا کرتہ کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا۔ ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں۔ اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا۔ جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے۔ کیا ان میں سے ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ملا دیا۔ اپنا کہنا کر دکھلایا۔ مسئلہ کبھی نہ بتلاتے۔ کسی کے حوالے فرماتے۔ فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو در کنار۔ اول امامت سے بھی گھبراتے۔ آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ وعظ بھی نہ کہتے۔ جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی (جو اس آخری زمانہ میں قدماء کے نمونہ تھے) نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا۔ اور بہت خوش ہوئے [1]

والد کی شکایت

مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ ان کو رنج تھا کہ میرے بھائی پڑھ کر نوکر ہو گئے۔ کوئی پچاس کا، کوئی سو کا۔ کوئی زیادہ کوئی کم سب خوش و خرم ہیں۔ آپ نے حاجی امداد اللہ مکی رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا ہے اور مجھے اس سے کیا کچھ امیدیں تھیں۔ کچھ کماتا تو ہمارا یہ افلاس دُور ہوتا۔ تم نے اس پر خدا جانے کیا کر دیا نہ کچھ کماتا ہے اور نہ نوکری کرتا ہے۔ حضرت اس وقت تو ہنس کر چپ ہو گئے۔ پھر کہا کر بھیجا کہ قاسم کو وہ مرتبہ ملے گا کہ وہ سو پچاس والے سب اس کی خدمت کریں گے اور ایسی شہرت ہو گی کہ اس کا نام ہر طرف پکارا جائے گا اور تم تنگی معاش کی شکایت کرتے ہو۔ خدا تعالیٰ بے نوکری ہی ایسے آ تنا دیگا کہ ان نوکروں سے اچھا رہے گا۔ چنانچہ مولانا قاسم کے والد کی حیات میں مالی حالت ایسی ہو گئی کہ شکایت نہ رہی۔

---

[1] سوانح عمری مولانا محمد قاسم ص ۹۔ ۱۰ ملخصا۔

نکاح، سخاوت و مہمان نوازی

آپ کے والد ماجد کو بڑی فکر تھی کہ کچھ ذریعہ معاش اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں۔ بالآخر آپ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے ذکر کیا۔ حاجی صاحب نے حکم دیا تو ناچار نکاح پر راضی ہو گئے۔ مگر شرط یہ لگائی کہ میرے ساتھ جیسی حالت میں ہونگا۔ بیوی رہے گی۔ غربت ہو یا تنگدستی۔ سسرال نے یہ شرط قبول کی۔ ایک چھاپہ خانہ میں پانچ روپے ماہوار پر تصحیح کا کام کرنے لگے۔ مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت۔ بچے کیا؟ جب گھر آتے تو مہمان بہت آتے۔ بالآخر بیوی کی اجازت سے اس کا زیور فروخت کر دیا۔ وہ بھی نہایت تابعدار تھیں۔ پہلے والدین کی بے حد خدمت کی۔ بعد میں شوہر کی۔ آخر میں اللہ جل شانہ نے کشادگی عنایت فرمائی تو کچھ ہوتا۔ بیوی کو لا کر دیتے۔ اور بیوی بھی ایسی کشادہ دست کہ حضرت مولانا کے جب کوئی مہمان آیا۔ اسی وقت کھانا پکا کر کھلایا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مہمان آیا اور فوراً کھانا نہ ملا۔ خود فرمایا کرتے کہ ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔ جو میں قصد کرتا ہوں۔ وہ مہمان نوازی میں ٹھیک جاتی ہے۔ آپ نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ میں مر گیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کر آئے۔ تب قبر میں حضرت جبرائیل تشریف لائے اور کچھ نگین سامنے رکھے اور کہا یہ تمہارے اعمال ہیں۔ ان میں ایک نگین بہت خوشنما اور کلاں ہے۔ اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔ اس خواب کی تعبیر یہی سخاوت تھی [1]

جہادِ آزادی کا آغاز

انگریزوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد علماء کے طبقے یعنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھ کر کہ یہ دوسروں کے مذہبوں کو پامال کرنے اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لیے شرمناک ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے انسداد کی تدبیریں شروع کر دیں اور ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈال دی۔ چنانچہ اس جماعت کے تیسرے امام حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۲۶۲ھ میں انتقال کے بعد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ چوتھے امام مقرر ہوئے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتدا ہوئی۔ یہ حضرات بھی تیار تھے۔ حضرت حاجی صاحب کے شریک کار مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبدالغنیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا شیخ محمد تھانوی سے جہاد و حریت کے سلسلہ میں تبادلہ خیال ہوا۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد حریت کی مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ ہم اصحاب بدر سے بھی بے سروسامان زیادہ ہیں۔ حضرت امیر امداد اللہ نے طرفین کی گفتگو سنی۔ فرمایا کہ الحمد للہ انشراح ہو گیا۔ اور جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ امیر امداد اللہ نے امامت قبول کی اور مولانا نانوتوی سپہ سالار مقرر ہوئے۔ اور مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی مقرر ہوئے۔ اسی طرح قصبہ تھانہ بھون دارالاسلام قرار پایا۔

میرٹھ کے بعد دہلی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ آزادی چھڑ گئی تھی۔ ان حضرات نے بھی مورچہ لگا لیا۔ قاضی عنایت اللہ خاں اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم ان کے ساتھ سہارنپور پہنچے اور سرائے میں ٹھہرے۔ ایک بنیے نے ٹنکی صاحب سے جو انتظام سہارنپور پر مامور تھا۔ مخبری کی کہ تھانہ کا رئیس بھی کمپنی سے باغی ہو گیا ہے۔ اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کے لیے ہاتھی خریدنے آیا ہے اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک گارد بسمت سرائے روانہ کیا گیا اور عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو قید کر کے جیل خانہ بھیج دیا اور ان لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اگلے دن قاضی عنایت خاں کو اپنے بھائی کی پھانسی کی اطلاع ہوتی۔ یہ اپنے رفقاء۔ اور رعایا کو چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوس کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی وہ اپنے رفقاء اور رعایا کو ساتھ لیکر شیر علی باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جس وقت وہ سوار سامنے سے گزرے۔ ان پر حملہ کر کے میگزین چھین لیا۔ ایک سوار اس جنگ میں زخمی ہو کر بسمت جنگل بھاگا۔ مگر تھوڑے ہی فاصلہ پر گھوڑے سے

---

[1] سوانح عمری مولانا محمد قاسم ص ۱۰-۱۱ ملخصاً

گر مر گیا۔ اس واقعہ کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا جس پر عنایت علی خاں اور اس کے ساتھیوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ ایک معرکہ میں حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا قاسم اور حافظ ضامن ہمراہ تھے۔ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوا۔ یہ نبرد آزما جتھہ بھاگ جانے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے پہاڑ کی طرح جم کر مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ اور دوسرا گروہ ہاتھوں میں تلواریں لیے بندوقچیوں کے سامنے ایسے جا رہا تھا۔ گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے۔ چنانچہ ان حضرات پر فائر ہوئے اور حضرت ضامن رحمۃ اللہ علیہ نے زیر ناف گولی کھائی اور شہید ہوئے۔ حضرت مولانا قاسم یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی پر گولی لگی ہے اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ حضرت حاجی صاحب نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ کیا ہوا میاں۔ عمامہ اتار کر سر دیکھا۔ کہیں گولی کا نشان تک نہیں۔ تعجب یہ تھا کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے۔ معرکہ جنگ جاری ہے۔ اسی گھمسان کے میدان میں حضرت حافظ ضامن شہید نے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو پاس بلایا اور فرمایا کہ میاں رشید! میرا دم نکلے تو میرے پاس ضرور رہنا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حافظ ضامن صاحب دھم سے زمین پر گر پڑے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہو گیا۔ حافظ صاحب زخمی ہو کر گرے کہ حضرت مولانا گنگوہی نے لپک کر نعش کو کندھے پر اٹھا لیا اور قریب کی مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہو گئے۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہاں تک کہ حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے زانو پر وصال ہو گیا۔ اہل کاران تحصیل اس جنگ میں کام آئے اور خزانہ پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا۔ جب کچھ سکون ہوا تو تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھیر لیا اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع کی۔ دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہو گئی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیئے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی گئی۔ اس کس مپرسی کے عالم میں لوٹ مار خوب ہوئی۔ غرض یہ کہ رات کی تاریکی ختم ہونے سے پہلے تھانہ بھون مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا۔

گرفتاری کے وارنٹ

ان تینوں حضرات۔ حضرت حاجی صاحبؒ مولانا محمد قاسمؒ۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے کہ تھانہ بھون کے فساد میں شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والے یہی لوگ تھے۔ تھانہ کی بستی کی دکانوں کے چھپرتیوں نے تحصیل کے دروازے پر چھپر جمع کیے اور ان پر آگ لگا دی۔ یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے نہ پائی تھی۔ ان مٹھی بھر دلیروں نے جلتی آگ میں گھس کر خزانہ لوٹ لیا۔

حضرت حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قصبہ میں مولانا محمد قاسم۔ مولانا گنگوہی کو الوداع کہا اور حجاز جانے کیلئے روانہ ہو گئے۔ ان ایام میں مولانا محمد قاسم مرحوم احباب کے اصرار پر تین دن تک روپوش رہے۔

اتباعِ سنت در روپوشی

تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں چلنے پھرنے لگے۔ لوگوں نے پھر روپوشی کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زائد روپوش رہنا سنت کے خلاف ہے کیونکہ جناب نبی کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین ہی دن تک روپوش رہے۔

(سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۶۲ ، ۱۶۳) مناظر احسن گیلانی)

قیامِ دارالعلوم دیوبند کے اسباب

دنیا کا کوئی کام بغیر کسی سبب، داعیہ اور محرک کے معرض وجود اور منصۂ شہود پر نہیں آتا۔ ہم جب ٹھنڈے دل کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں برٹش گورنمنٹ کی مسخ شدہ تاریخ سے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کسی اور صورت میں نظر آتی ہے۔ سیاست کی باتیں تو سیاسی حضرات بہتر جانتے ہیں کیونکہ "لِکُلٍّ فَنٍّ رِجَالٌ" ہم صرف مذہبی نقطۂ نظر سے یہ دیکھتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت اور دور

میں بڑے مسلمان اقتدار رہا ہے جس میں نہایت فراخدلی سے (بلکہ بعض بادشاہوں کی طرف سے نرے ملحدانہ انداز میں) ہر فرقہ اور اہل مذہب کو اپنے مذہب پر پابند رہنے اور مذہبی رسوم بجالانے کی مکمل آزادی تھی۔ جب گردش زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہوگیا اور راجاؤں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ظالم اور جابر انگریز قہر الٰہی کی صورت میں ہندوستان پر آچکا۔ تو اس کے مقابلہ کے لیے ہندوستان کی دیگر اقوام عموماً اور مسلمان خصوصاً میدان میں نکلے اور عملی طور پر اس کے ساتھ جہاد کیا جس کو انگریز کے منحوس دور میں نمک خواران برطانیہ غدر ۱۸۵۷ء کے ساتھ تعبیر کرتے رہے ہیں۔ اس جہاد میں کون کون حضرات شریک تھے اور کس کس مقام پر لڑے؟ اور ہر مقام پر اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر کئی امور ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہونے کے علاوہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمیں تو اثبات مدعیٰ کے لیے بانیٔ دارالعلوم دیوبند اور ان کے چیدہ چیدہ بعض احباب و اصحاب کا تذکرہ کرنا تھا کہ انھوں نے کس حد تک انگریز کے خلاف جہاد کیا اور انگریز نے ان کے خلاف کیا رائے قائم کی اور اس وقت انگریز کے اہل ہند اور خصوصاً مسلمانوں کے خلاف کیا عزائم تھے؟ اور وہ ہندوستان میں کیا دیکھنا اور کرنا چاہتا تھا؟ اور کس حد تک وہ کر چکا ہے۔ جب ہم تاریخ کے اس موڑ پر آگئے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں وہ دلگداز واقعات پڑھتے اور دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ میں قلم لرزتا ہے۔ دل سیماب کی طرح بے قرار ہو جاتا ہے۔ سانس رکنے لگتا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ب واقعات تو تاریخ میں پڑھیے۔ ہم مشتے نمونہ از خروارے چند حقائق کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جن میں عقلمندوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ۔ ؎

گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

جب لاکھوں انسانوں پر برطانیہ یہ مظالم کر چکا تو بیرونی دنیا کی مزید بدنامی سے بچنے کے لیے اور اہل ہند پر اپنا فرعونی احسان جتلانے کی خاطر کچھ عرصہ بعد ہزاروں علماء کو تختہ دار پر لٹکانے، جلاوطن کرنے اور لاکھوں افراد کو تہ تیغ کرنے کے بعد کچھ جاری کردہ وارنٹ گرفتاری اور دیگر کئی سخت احکام واپس لے لیے گئے۔ اور اس طرح مظلوموں کی ظالم کے ہاتھ سے گلو خلاصی ہوئی ۱۸۵۷ء کے جہاد اور ہنگامہ میں اہل ہند اس قدر حق بجانب تھے کہ خود ظالم انگریز اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مسٹر لکی اس ہنگامہ کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمان کی بغاوت تھی (بحوالہ حکومت خود اختیاری ص۴۳) اور اس ہنگامہ میں انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا بھی کچھ نمونہ دیکھتے جائیے۔

مسٹر رسل کا یہ مقولہ ہے کہ "مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے پہلے خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی اور پھر انھیں جلا دیا گیا۔"
(تمغہ کا دوسرا رخ مصنفہ ایڈورڈ ٹامس ص۴۰)

ملاحظہ کیجیے کہ ظالم برطانیہ نے کس قدر سفاکانہ اور حیا سوز حرکتیں مسلمانوں پر روا رکھیں اور کس طرح ان کے بے گناہ خون سے ہولی کھیلی گئی۔ مگر ایں ہمہ مسلمان مردانہ وار اس ظالم کے سامنے ایمان سے بھرپور سینے تان کر پیش ہوتے رہے اور بزبان حال اس سے یوں خطاب کرتے تھے کہ ؎

گئے وہ دن کہ ہمیں زندگی کی حسرت تھی
فضول قتل کی دیتا ہے دھمکیاں صیاد!

عزائم برطانیہ انگریز کو جب ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا تو شیخ چلی کی طرح اس کے دل میں خفتہ اور نہاں آرزوئیں اور ارادے زبان اور قلم کی نوک سے بھی ظاہر ہونے لگے۔

گورنر ہند لارڈ ایلن برا نے ۱۸۴۲ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا ہے کہ:-

جیسے بڑے مسلمان
خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا اور قرآن و حدیث، فقہ، تاریخ اسلامی، اور سلف صالحین کے اعلیٰ کارناموں اور اقدار سے ان کو باخبر نہ رکھا گیا تو سخت خطرہ ہے کہ، العیاذ باللہ، مسلمان کہیں نصرانیت اور دیگر فتنوں کے دام ہمرنگ زمین ہی میں نہ الجھ جائیں۔ جس چال کو بھانپنے میں شاطرانِ افرنگ اور پنڈتوں اور دیگر باطل پرستوں کے جرائم و مساعی کوئی راز پنہاں نہ تھے۔ مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کو پراگندہ کرنے اور آئندہ ان کو دینی ماحول اور دینی ماحول و فنون سے بے بہرہ رکھنے کی جو کوشش و کاوش اس ملک میں ہو رہی تھی۔ ان تمام پریشانیوں کو سمجھنے اور بھانپنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتویؒ اور آپ کے رفقاء کار کو دقیقہ رس دماغ اور سیماب کی طرح بے قرار دل مرحمت فرمایا تھا اور متلاشیانِ حق کے ایک ایک فرد کو زبانِ حال سے پکار پکار کر یہ کہہ رہے تھے ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء بروز جمعرات (اسی دن ہفتہ بھر کے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہوتے ہیں۔) تاریخ کا وہ مبارک دن ہے جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی امانت کا چشمہ علم سرزمین دیوبند سے پھوٹا اور رشد و ہدایت کا پودا شجرۂ طوبیٰ بن کر پھیلا جس کے لذیذ پھل سے دنیائے اسلام کی علمی بھوک ختم ہوئی اور جس کی سرسبز و شاداب شاخوں کے سایہ کے نیچے جہالت اور غفلت کی باد سموم میں جلنے والوں کو چین اور اطمینان نصیب ہوا اور اس صاف اور شفاف چشمہ سے نہریں اور ندیاں پھوٹ پھوٹ کر نکلیں۔ اور ایشیا بھر کے مردہ دلوں کو زندہ اور اجڑے ہوئے قلوب کو لہلہاتا ہرا چمن بنا دیا۔

اس مبارک تقریب میں بہت سے بلند بزرگ جمع ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کی موجودہ عالیشان عمارت کے متصل جنوب کی طرف مسجد چھتہ میں انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ اور سب سے پہلے معلم حضرت ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سب سے پہلے متعلم حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی قرار پائے۔

اس مبارک مدرسہ کے آغاز کی خبر جب بتانے والوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو بتائی اور یہ کہا کہ حضرت ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا فرمائی جائے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا:۔

"سبحان اللہ، آپ فرماتے ہیں۔ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی ہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔"[1]

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں تحفظ اور بقائے اسلام کا ذریعہ ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوئی ہے۔

---

[1] علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص۱۵ و سوانح قاسمی جلد ۲ ص ۲۲۳ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔

سرسید اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو دہلی کالج کے تعلیم یافتہ حضرات نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ سرسید مرحوم و مغفور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مولانا محمد قاسم نے دیوبند میں اور سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ کالج قائم کیے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا محمد حسین آزاد نے پنجاب میں وہ تعلیمی کارنامے انجام دیئے ہیں جو حیات جاوید کے مالک ہیں۔ سرسید مرحوم مولانا محمد قاسم کی بہت عزت کرتے تھے۔ بعض مذہبی مسائل کے علاوہ تعلیم پھیلانے میں دونوں متفق تھے۔ علوم جدیدہ اور علوم قدیمہ کے پڑھانے میں بھی دونوں ہم خیال تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مورخہ یکم ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ میں مضمون بعنوان مدرسہ دیوبند" میں مولانا محمد قاسم کی تقریر اپنی علوم قدیمہ اور جدیدہ کے پڑھانے کے بارے میں درج ہے اور اس پر جزوی اختلاف کے ساتھ سرسید مرحوم نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ مضمون پورا نقل کیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی سالانہ مجلس میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب نے ایک نہایت لمبی اور دل میں اترنے والی اور صداقت سے بھری ہوئی گفتگو کی۔ اس کے پڑھنے سے ہم کو اس بات کی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جناب مولوی صاحب ممدوح بھی مسلمانوں کے حق میں علوم و فنون جدیدہ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔

سرسید مرحوم کو کسی دینی درسگاہ سے اختلاف نہیں تھا۔ اور خاص طور پر مدرسہ دارالعلوم دیوبند جس کے بانی مولانا محمد قاسم تھے۔ وہ اس کے حامی تھے اور اس کی کامیابی چاہتے تھے۔ چنانچہ جب مدرسہ دیوبند کے مہتمم صاحب نے سرسید کے پاس مدرسہ کی سالانہ رپورٹ بھیجی جس میں مدرسہ کی طرف سے مسلمانوں کی بے توجہی اور غفلت کا رونا رویا گیا تھا۔ اس کو پڑھ کر سرسید کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور انھوں نے یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ کے تہذیب الاخلاق میں عربی مدرسہ دیوبند اور مسلمانوں کا جھوٹا دعویٰ دینداری کے عنوان پر تین صفحہ کا ایک مقالہ تحریر کیا۔ اس میں مولانا محمد قاسم اور مولانا یعقوب نانوتوی کے بارے میں کیسے حقائق بھرے محبت آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کے خلوص پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون کے اقتباس میں پڑھیے۔

مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ عربی دیوبند نے اس مدرسہ کی رپورٹ سالانہ ۱۲۹۰ھ ہمارے پاس بھیجی ہے جس کے دیکھنے سے ہم کو نہایت ہی رنج ہوتا ہے اور مسلمانوں اور مسلمانوں کی حالت پر کس قدر افسوس آتا ہے۔ اب ہم اس رپورٹ پر متعدد طرح پر نظر ڈالتے ہیں۔

اول۔ بلحاظ مسلمانوں کے جوش مذہبی کے ہم سمجھتے تھے کہ جو مدرسہ ہم قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں علوم انگریزی اور دیگر علوم دنیاوی بشمول علوم دینی پڑھائیں گے۔ اس پر جو پکے مسلمان یا متعصب دیندار اعتراض کرتے ہیں اور اس کو کرسٹانی مدرسہ ٹھہراتے ہیں۔ اور اسی سبب سے لوگوں کو اس میں چندہ دینے سے منع کرتے ہیں تو عربی مدرسہ دیوبند میں جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس میں وہی پرانے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ جن کو مسلمان چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے مسلمانوں نے ضرور مدد کی ہوگی۔ مگر رپورٹ کے دیکھنے سے ہم کو نہایت مایوسی ہوئی۔ بڑے سے بڑا چندہ فہرست میں آٹھ روپیہ ماہواری کا۔ اس کے بعد پانچ روپے ماہوار کا۔ اس کے بعد چار روپے ماہواری کا اور اس کے بعد تین روپے ماہواری کا اور یہ چاروں قسم کے چندے غیر وصولی ہیں۔ بعض

پادریوں کی تبلیغ

ہندوستان میں مسلمان کے ہاتھوں سے سلطنت اور اقتدار جانے کی دیر تھی کہ مختلف قسم کے مذہبی فتنے عذاب الٰہی کی صورت میں نمودار ہوئے اور ساون کے مینڈکوں کی طرح بازاروں اور کوچوں، گلیوں اور محلوں میں پادری صاحبان جوق در جوق اور جماعت در جماعت گردش کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکے ڈالتے ہوئے نظر آنے لگے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر اور بدنصیب قصبہ ہوگا جس کو پادری صاحبان نے اس دور میں اپنے منحوس پاؤں سے نہ روندا ہو۔ اور اسلام کے خلاف خوب زہر اگل کر مسلمانوں کی دل آزاری نہ کی ہو۔ اور جارحانہ رنگ میں عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو اور مسلمانوں کو چیلنج نہ دیا ہو۔ ایسے تمام واقعات کا استیعاب اور احاطہ نہ تو ہمارے بس کا روگ ہے اور نہ ان پر ہمارا مدعیٰ موقوف ہے۔ اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف دو تین واقعات بطور نمونہ عرض کیے دیتے ہیں۔ ہر عقلمند انسان ان سے بخوبی حقیقت کی تہ کو پہنچ سکتا ہے۔ اور نادان کے لیے تو دفتر کے دفتر بھی بے سود ہیں۔

چاند پور کا مذہبی اجتماع

ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانہ پر تبلیغ کو دیکھ کر ہندوؤں کو بھی یہ جرأت پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے مذہب کا پرچار کریں اور عیسائیت کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مذہبی امور میں الجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ مشہور شہر شاہجہان پور سے پانچ چھ میل کی مسافت پر ایک قصبہ تھا جس کا نام چاند پور تھا۔ وہاں کے ایک ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ۱۲۹۳ھ میں ایک مذہبی جلسہ بنام میلہ خداشناسی مقرر کیا جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا باہمی مباحثہ طے پایا اور تینوں فریق اس میں شریک ہوئے۔ مگر لالہ جی نے کمال ہوشیاری اور انتہائی چالاکی سے ایک مختصر سی لیکن نہایت بے معنی اور مہمل لکھی ہوئی تقریر کرنا شروع کی کہ میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا اور ان کے پنتھ میں جاگتے سوتے سانس چلتا رہتا تھا۔ (الخ) جس کو چیستان اور پہیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور اس طرح اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی جان چھڑالی اور اصل گفتگو مسلمانوں اور عیسائیوں میں رہی۔ عیسائیوں کی طرف سے ان کے دیگر نامی گرامی پادریوں کے علاوہ پادری نولس صاحب انگلستانی بھی تھے۔ جو بڑے لسان، عمدہ مقرر اور چوٹی کے مناظر تھے۔ پادری نولس صاحب کا یہ بے بنیاد دعویٰ تھا کہ مسیحی دین کے مقابلہ میں محمدی دین کی کچھ حقیقت نہیں (معاذ اللہ) اور اہل اسلام کی طرف سے جو حضرات اس موقع پر موجود تھے۔ ان میں مشاہیر میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحؒ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحؒ اور حضرت مولانا سید ابوالمنصور صاحب دہلوی رحؒ امام فن مناظرہ اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات علماء، اور اہل دل اور دیندار مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ پہلے دن تو اس مباحثہ میں متعدد حضرات نے حصہ لیا اور پادری نولس صاحب کے مزعوم دلائل کے جواب دیتے رہے اور اپنے دعاوی کا اثبات کرتے رہے مگر دوسرے دن مناظرہ میں صرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حصہ لیا اور ایسے زبردست دلائل اسلام کی حقانیت پر پیش کیے کہ مجمع داد تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکا اور دین مسیحی کے منسوخ اور ناقابل اتباع ہونے پر ایسے ٹھوس براہین پیش کئے کہ پادری باہم کہتے تھے۔ آج ہم مغلوب ہو گئے۔ (ملخصاً گفتگوئے مذہبی بلقب تاریخی میلہ خداشناسی ص ۳۵)

اس مناظرہ کی مکمل روئداد ہر اک کتاب میں ملاحظہ فرمائیے کہ پادریوں کا مغرور سر کیسے سرنگوں ہوا۔ اور اسلام کی حقانیت اور صداقت کس طرح آشکارا ہوئی۔ سچ ہے کہ،

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

شاہجہان پور

اس مناظرہ کے تقریباً دو سال بعد ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں شاہجہان پور میں اہل اسلام اور مختلف باطل فرقوں کا مناظرہ و مباحثہ طے ہوا جس میں پنڈت دیانند سرستی، منشی اندرمن، پادری اسکاٹ مفسر انجیل اور پادری نولس صاحب وغیرہ نے حصہ لیا اور اہل اسلام کی طرف سے متعدد علماء حق اور مشاہیر اس وقت اور اس مقام پر حاضر اور موجود تھے۔ مگر مناظرہ پادریوں اور مسلمانوں کا ہوا۔ اور لالے وقت کی تنگی سے فائدہ اٹھا گئے۔ اس میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مناظر تھے۔ انھوں نے عقلی و نقلی رنگ میں ایسی صحیح اور قطعی دلیلیں پیش فرمائیں کہ پادری صاحبان سے انکا کوئی معقول جواب نہ بن سکا اور اس موقعہ پر بھی اسلام اور اہل اسلام کا بول بالا ہوا۔ مسلمانوں کی کھلی فتح کا مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ متعصب ہندوؤں نے بھی اقرار کیا چنانچہ منشی پیارے لال نے یہ کہا کہ مولوی قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال کیا بیان کیجئے؟ ان کے دل پر علم کی سرستی، علم کی تیغی، بول رہی تھی۔ (مباحثہ شاہجہانپور ص۹)

پورے بارہ صفحات پر اس مناظرہ کی روئداد بار ہا طبع ہو چکی ہے۔ اہل علم اس سے استفادہ کریں۔

اس کے علاوہ حجۃ الاسلام نے پادری تاراچند سے بھی مناظرہ کیا۔ چنانچہ سوانح قاسمی ص۱۵ از مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ہے،

"ایک پادری تاراچند نام تھا۔ اس سے گفتگو ہوئی۔ آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا۔ سچ ہے شیروں کا مقابلہ لومڑیاں کیا کر سکیں۔"

پادری فنڈر کا فتنہ

پادری ڈاکٹر کارل فنڈر (جو ایک جرمنی مشنری تھا۔ جسے روسی سلطنت نے جورجیا کے قلعے شوشا سے بدر کر دیا تھا جس نے فارسی میں میزان الحق نامی ایک کتاب شائع کی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ (ملاحظہ ہو اہل سنہ ص۲۱۴ مصنفہ ایل بون جونز۔ بی اے۔ بی ڈی لندن۔ مترجمہ جے عبدالسبحان بی اے، بی ڈی۔ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور) نے ہندوستان میں پہنچ کر اور انگریز کی سرپرستی حاصل کر کے جس دریدہ دہنی سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور اہل اسلام کے خلاف جو زہر اگلا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں جو جو بہتان تراشی اور اتہام بازی اس نے اختیار کی اس سے مسلمان تو آخر مسلمان ہیں، بانصاف مزاج غیر مسلم بھی صدائے نفرین کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پادری فنڈر جو اپنی بے باکی میں مشہور تھا۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں سرگرم عمل تھا چنانچہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی، کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۲ رمضان ۱۳۰۸ھ) جو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس سرہ العزیز کی اولاد میں تھے اور سلسلہ ولی اللہی میں منسلک ہو کر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اور آپ کی ولادت جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ میں کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ہوئی تھی"، نے پادری فنڈر کے ساتھ خط و کتابت کی اور مناظرہ کا چیلنج دیا۔ اور تمام ابتدائی مراحل طے کر لینے کے بعد اکبر آباد آگرہ میں کئی دن کے لیے مناظرہ طے ہوا۔ یہ مناظرہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۲ رجب ۱۲۷۰ھ کو ہوا تھا جو اسلام اور عیسائیت کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کے لیے فیصلہ کن اور تاریخ ہندوستان میں اس موضوع کا سب سے پہلا اور عظیم الشان مناظرہ تھا جس میں طرفین سے معزز مسلمان، ہندو اور انگریز اس مناظرہ کے جج اور منصف قرار دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری دین کا حامی و ناصر ہے۔ اس نے اسلام کی صداقت کا ظاہری سبب اس موقع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کو بنایا جنھوں نے اپنی خداداد قابلیت، عمدہ ذہانت اور تبحر علمی سے تین روز کے متواتر مناظرہ میں دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ سے اس امر کو ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل جس پر آج پادری صاحبان کو فخر و ناز ہے، بالکل محرف ہے جس میں ذرہ

اور حکیم موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ ہی سے ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

"جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں روضۂ پاک صاحب لولاک نظر آتا تھا۔ فوراً جناب مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پا برہنہ چلنا شروع کیا" (الفضائح ص)

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو مدینہ طیبہ اور گنبدِ خضراء کے ساتھ کس قدر عقیدت اور کیسی فریفتگی تھی اور دیکھئے کہ تادب حسن کا کیا ہی بہترین طریقہ اختیار فرما کر اپنی فرطِ محبت کا اظہار فرمایا اور یہ ساری عقیدت و محبت جناب امام الانبیاء خاتم الرسل حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اس سنگلاخ رقبہ اور پتھریلی زمین کی فی نفسہٖ کیا قدر ہے؟ جو کچھ بھی ہے اور جتنی کچھ بھی ہے۔ وہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت ہے۔ اور آپ ہی کے واسطہ سے ہے اور ایسے ہی موقعہ کے لیے کشتۂ عشق نے یہ کہا ہے کہ:۔

وما حب الدیار شغفن قلبی

ولکن حب من سکن الدیارا

میرا اور میرے تمام اکابر کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا وہ حصہ جو آپ کے جسد اطہر سے لگتا ہے۔ عرش سے بھی زیادہ مرتبہ اور فوقیت رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ج ۱ ص۱۹، سیرت حلبی ج ۲ ص۳۲ اور روح المعانی ج ۵ ص۲۲۱ اور اس کی وجہ بھی صرف اور صرف یہ ہے کہ ؎

عرش پر گر فرش بھاری ہے تو ہے اس خاک سے

جس میں محوِ خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار

(۳) انگریز کے خلاف جہاد ۱۸۵۷ء میں دیگر اکابر کی طرح حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحہ بھی بہ نفس نفیس خود شاملی وغیرہ میں شامل تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے اور تذکرۃ الرشید کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ جب ظالم انگریز کی طرف سے حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لیے صلہ تجویز ہو چکا تھا۔ اس لیے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے تھے تو حق تعالیٰ اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو کمال شجاعت، استقلال اور ہیبت قلب عطا فرمائی تھی۔ اس لیے وہ ہر قسم کے نتیجہ سے بے نیاز ہو کر کھلے بندوں پھرتے تھے۔ مگر اعزہ اور اقارب اور ہمدردوں کی طرف سے جب شدید اور بلیغ اصرار ہوا کہ حضرت وقت کی نزاکت کے پیش نظر ضرور روپوش ہو جائیں۔ تو ان کے اصرار کی وجہ سے تین دن روپوش رہے اور لکھا ہے کہ

"تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے۔ لوگوں نے پھر سنت روپوشی کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن روپوش رہے ہیں۔"

(سوانح قاسمی ج ۲ ص۱۰۲ و ص۱۰۳ از مولانا گیلانی رح)

رہا جمال پہ تیرے حجاب بشریت	نجانا کون ہے کچھ بھی کسی نے جز ستار!
سوا خدا کے بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے	کہ شمس نور ہے شپر نظر اولوالابصار!

کفیل جرم اگر آپ کی شفاعت ہو	تو ناکسی بھی طریقہ ہو مرتبوں میں شمار
تمہارے جود پہ لکھتا ہے عزہ طاعت	گنہ تو اسم برگشتہ نسبت بہ اظہار
گناہ کیا ہے اگر تجھ گناہ کیے میں نے	تجھے شفیع کون کہے گر نہ ہوں بدکار
سنا ہے حرف شکایت پہ حضرت جاشی	اگر گناہ کہے ہے خوف خشم قہار
یہ سن کے آپ شفیع گناہ گاراں ہیں	کیے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا	نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی	کہے ہے سامنے بڑوں بھی بڑا تجھے سرکار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا	بنے گا کون ہمارا تمہارے سوا غم خوار

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ	کہ ہو سگان مدینہ میں میرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگان حرم کے تیرے پھروں	مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغ و مار
جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب میرے	کہ میں ہوں اور سگان حرم کی تیرے قطار
اڑا کے باد مری مشت خاک کو پس مرگ	کرے حضور کے روضہ کے آس پاس نثار

ولے یہ رتبہ کہاں مشت خاک قاسم کا

کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار

قصیدۂ قاسمی
(از صفحہ ۲ تا ۵ ملتقطاً)

تدبر فرمائیے کہ ایک ایک شعر میں کس طرح حضرت نانوتوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ہی کی بدولت مدینہ طیبہ سے

؎ مولانا مرحوم خود ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی مکان کی طرف جاتا ہے تو گو اس کا مقصود ہوتا ہے اس طرف کو آداب و نیاز بجالاتا ہے تو آداب و نیاز کا ہر شخص صاحب خانہ کے لیے سمجھتا ہے (مصنف قبلہ نما)

جہت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار مصلحتوں کے علاوہ ایک اس مصلحت کے لیے بھی متعین فرمایا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کا اس یک جہتی کی وجہ سے اتفاق و اتحاد قائم رہے۔"

(مسئلہ ترجیح)

قبلہ نما کی اس عبارت سے جہاں اللہ تعالیٰ کی خالص توحید اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور منصب رسالت واضح ہوتا ہے اس سے "مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا" وغیرہ اشعار و عبارات کا مطلب بھی بالکل عیاں و آشکار ہو جاتا ہے کہ حضرت نانوتوی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نافع اور ضار سمجھتے ہیں۔ اور نہ اس ارادہ سے آپ کو پکارتے اور مدد مانگتے ہیں۔ جیسا کہ بعض اہل بدعت نے سوء فہم سے یہ سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ محض عشق و محبت کے طور پر یہ ندا اور خطاب ہے۔ نہ یہ کہ حاضر ناظر سمجھ کر ان سے استمداد کی گئی ہے وہ تو اسکو کفر لکھتے اور سمجھتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو فیوض قاسمی ص۴۲)

حج

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے تین مرتبہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو حج کرنے کی توفیق اور حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد خضرا کی زیارت سے متمتع ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ پہلا حج انہوں نے ۱۲۷۷ھ ۱۸۶۰ء میں) دوسرا ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں اور تیسرا ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء میں کیا ہے اور ان اسفار میں جو روحانی لذت انہوں نے محسوس کی وہ صرف انکا قلب مبارک ہی ادراک کر سکتا تھا۔ دوسرا بھلا اس کو سمجھے تو کیونکر سمجھے اور بیان کرے تو کیسے بیان کرے ؎

واعظم ما یکون الشرق یوما
اذا دنت الخیام من الخیام

حفظ قرآن کریم

حضرت نانوتوی رح تصحیح کتب اور دینی بحث و مباحثہ اور سرگرمیوں میں ایسے منہمک رہتے تھے کہ ان اہم دینی کاموں سے فراغت کا موقع ہی ہاتھ نہ آتا تھا اور دل میں قرآن کریم کے حفظ کا جو شوق تھا۔ وہ کب چین لینے دیتا تھا۔ بالآخر دو سال کے صرف دو رمضان میں قرآن یاد کر لیا اور ایسی روانی کے ساتھ سناتے تھے کہ کوئی کہنہ مشق پختہ کار حافظ بھی شاید ایسا نہ سنا سکتا ہو۔ چنانچہ خود انکا اپنا بیان (سوانح قاسمی ص۲۰ از مولانا محمد یعقوب صاحب رح میں) ہے۔

"فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے اور جب یاد کیا پاؤ۔ سیپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا اور جب سنایا۔ ایسا صاف سنایا۔ جیسے

امام ربّانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ (تذکرۃ الرشید)
عبد الرشید ارشد

شاد باش اے خستہ ہجرانِ بلا	کز پئے دردِ تو درماں میرسد
در دلِ افسردہ روحے میدمد	مردہ تن را مژدہ جاں میرسد
شوق کن اے بلبل گلزارِ عشق	کاں گل نواز گلستاں میرسد
تازہ باش اے تشنۂ وادئ غم	کز برایت آبِ حیواں میرسد
دُور شو اے ظلمتِ شامِ فراق	کافتاب وصلِ تاباں میرسد
بہرِ رشد خلق می آید رشید	قطبِ عالم بحرِ عرفاں میرسد

(از تذکرۃ الرشید ص ۱۳)

ولادت

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء بروز سوموار چاشت کے وقت اس دنیائے آب و گل میں تشریف لائے۔ گویا سوموار کی ولادت میں غیر اختیاری سنت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی پیدائش مشہور تاریخی مقام گنگوہ میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کے مزارِ مبارک سے مشرقی جانب تقریباً تیس قدم دُور اپنے جدی مکان میں ہوئی۔

سلسلہ نسب

آپ والد ماجد اور والدہ ماجدہ دونوں کی جانب سے شریف النسب اور نجیب الطرفین شیخ زادہ انصاری اور ایوبی النسل تھے اور آپ کا نسبی سلسلہ جدہ کی جانب سے گیارہویں پشت پر قطب العالم شیخ المشائخ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ سے جا ملتا ہے۔ اور روحانی سلسلہ بھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ حضرت شیخ موصوفؒ سے ملتا ہے۔ گویا آپ نسبی اور روحانی دونوں طور پر گنگوہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ہوئے کہ آپ کی ذات گرامی قدر سے گنگوہ کا نام دوبارہ چار دانگ عالم میں پھیلا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گنگوہ کی گذشتہ عظمت و شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ صاحب تذکرۃ الرشید حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی تذکرۃ الرشید میں رقم فرماتے ہیں :-

شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۵ سنہ ہجری کو اس عالم جسمانی سے انقطاع فرمایا اور تیسری صدی کا آخری سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس خاندان ایوبی کا نام باقی رکھنے والے اور قدوسی مسند کی عزت سنبھالنے والے نونہال نے اپنے وجود مسعود سے خانہ عالم معمور اور وہی قصبہ گنگوہ آباد کیا جس میں قدوسی خانقاہ اپنے شیخ کے سچے جانشین کی تلاش میں تین سو برس سے پریشان حال و ویران پڑی ہوئی تھی۔ یعنی تیسری صدی کے پورے اختتام پر شیخ عبد القدوس کے وصال کا سال اور مہینہ اور دن یعنی ۲۳ جمادی الآخر ۱۲۴۵ سنہ کا روز جب آیا ہے تو ہمارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ پورے سات ماہ اور سات دن کی عمر پا چکے تھے۔ فالحمد للہ علیٰ لسانہ (تذکرۃ الرشید ص ۱۵)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ددھیال دراصل قصبہ رام پور ضلع سہارنپور تھی مگر حضرت کے دادا قاضی پیر بخش صاحب مرحوم نے گنگوہ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اس لیے آئندہ نسل کا انتساب گنگوہ کی جانب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح جانشین نسبی، روحانی اور وطنی طور پر ان کا جانشین ہو۔

والدین

حضرت مولانا کے والد ماجد مولانا ہدایت احمد صاحب گنگوہ ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت ہوئی اور پھر یہیں انصاری خاندان میں مولانا محمد نقی صاحب کی ہمشیرہ سے شادی ہوئی۔ مولانا محمد نقی صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد شفیع صاحب ۱۸۵۷ سنہ کی

تحریک آزادی میں شہید ہوئے[۱] مولانا محمد تقی صاحب حضرت مولانا گنگوہی کے خسر بھی ہیں اور ماموں بھی کیونکہ ان کی صاحبزادی خدیجہ حضرت مولانا کے عقد میں آئیں[۲]. حکیم مولانا مولوی مسعود احمد گنگوہی اور مولانا مولوی محمود احمد صاحبؒ (صاحبزادگان حضرت گنگوہی) اسی عفت مآب خاتون سے پیدا ہوئے۔

حضرت مولانا کے والد ماجد اپنے زمانہ میں مقدس عالم اور بڑے دینی مقتدا تھے۔ آپ نے تعلیم شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے علماء سے حاصل کی اور روحانی تربیت حضرت مولانا شاہ غلام علی مجددیؒ دہلوی سے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ کامل سے مولانا ہدایت احمد مرحوم سلوک و تصوف سے بھی خاصہ حصہ پائے ہوئے تھے۔ نہایت خوشنویس اور زود نویس تھے۔ عملیات اور تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے اور بروایت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد سے مجاز بھی تھے[۳]. اللہ تعالیٰ نے انہیں پینتیس سال کی عمر میں ۱۳۵۲ھ میں اس جہان سے اٹھالیا. جبکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ اور حضرت مولانا صرف والدہ ماجدہ ہی کی تربیت میں رہ گئے اور سرپرستی جد امجد قاضی پیر بخش صاحب نے کی۔

والدہ ماجدہ

حضرت کی والدہ ماجدہ نہایت پارسا اور عابدہ زاہدہ تھیں۔ باوجودیکہ عورت ذات تھیں۔ اور ان کے شوہر تعویذ گنڈے بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر یہ ٹونے ٹوٹکوں سے طبعاً متنفر اور خائف تھیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی والدہ ماجدہ سے سنا ہوا ایک قصہ سنایا کرتے تھے۔ کہ میری والدہ ماجدہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ :۔

> رشید احمد جب تو بچہ تھا مجھکو اللہ بخش جن نظر آیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ تیری چارپائی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے کہا کہ تو فلاں مزار پر عطر کے پھوئے چڑھا ورنہ میں تیرے لڑکے کو مار ڈالوں گا۔ والدہ فرماتی تھیں کہ میں نے اس سے کہا کہ اچھا مار ڈال تیرے سامنے لیٹا تو ہے ———— والدہ فرماتی تھیں کہ جب کبھی اللہ بخش نظر آتا اور یہ دھمکیاں دیتا اور ڈراوے دکھاتا تھا میں تو اس کو یہی جواب دیتی تھی کہ میں تو ہرگز بھی نہ چڑھاؤنگی اگر تجھ سے مارا جائے تو مار ڈال اس کو رے اور صاف جواب پر بھی تیرا بال بیکا نہ کر سکا اور مارنا تو مارنا تجھے ڈرا بھی نہ سکا[۴]

حضرت مولانا کا بچپن

جن لوگوں نے آگے چل کر بڑا آدمی بننا اور لوگوں کی اصلاح وفلاح میں اپنی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ انہیں شروع ہی سے بیکار باتوں۔ لایعنی حرکتوں اور فضول کھیل کود سے دور بلکہ متنفر رکھتا ہے اور جن لوگوں نے تجدید و احیائے دین کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے وہ بچپن ہی سے اپنی فطرت میں متبع سنت و شریعت ہوتے ہیں یہ نہیں کہ بڑے ہو کر محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے یا طعن و تشنیع سے بچنے کے لیے شرعی شکل و صورت بنالی. تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں۔

لم تقولون مالا تفعلون (القرآن) کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں

یہ لوگ اگرچہ تعلیم و تدریس حاصل کرتے ہیں لیکن وہبی طور پر سلیم الفطرت ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تعلیم و تربیت نہ بھی ہوتی تو اپنی سلامتی طبع سے بہر حال صراط مستقیم پر چلتے چاہے شیخ و مرشد نہ ہوتے. حضرت مولانا گنگوہی بچپن ہی سے

بالائے سرش زہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

---

[۱] تذکرۃ الرشید ص ۱۱ ۔ [۲] ایضاً ۔ [۳] ایضاً ۔ [۴] تذکرۃ الرشید ص ۲۴ ۔ [۵] مولانا شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ پیدائش ۱۱۵۶ھ مطابق ۱۷۴۳ء وفات ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء ۔ عارف کامل اور جامع علوم ظاہر و باطن تھے۔

کا مصداق تھے چنانچہ اس سلسلے میں ان کے بچپن کی بیسیوں حکایات میں سے دو چار پیش کی جاتی ہیں

حضرت مولانا قدس سرہٗ چونکہ بچپن ہی سے بالطبع سلیم القلب اور شیدائی سنت تھے۔ اس لیے کبھی

تصویر سے نفرت

آپ نے اپنے مکان میں کوئی تصویر نہیں رہنے دی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ساڑھے چار برس چھوٹی آپ کی صرف باپ شامل علاتی بہن — بچپن میں گڑیاں کھیلتی تھیں۔ حضرت قدس سرہٗ جس وقت باہر سے تشریف لاتے تو گڑیوں کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا کرتے تھے [۱]

خدا اور رسول پر پختہ یقین

ایک مرتبہ اثنائے وعظ میں فرمایا:۔

"میں اپنے آپ کو کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے طفولیت ہی میں مجھے وہ یقین عطا فرمایا تھا کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا اور جمعہ کا وقت آجاتا تو کھیل چھوڑ کر چلا آتا اور لڑکوں سے کہہ دیتا تھا کہ ہم نے اپنے ماموں صاحب سے سنا ہے کہ تین جمعہ کا چھوڑنے والا (جہاں جمعہ فرض ہو) منافق لکھا جاتا ہے۔ لوگوں کو کہتا ہوں آخر مسلمان ہیں خدا اور رسول پر تو یقین ہوگا ہی۔ پھر ایسے غافل کیوں ہیں [۲]

اندازہ کیجیے کہ جس فرمان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر لوگ بڑے ہو کر عمل نہیں کرتے۔ حضرت مولانا بچپن میں اس کا کتنا خیال کرتے اور کیسا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ آدمی منافق ہو جائے گا جو مسلسل تین جمعے چھوڑ دے گا۔ اور بچوں کے ساتھ کھیلنے وغیرہ میں اکثر ایسا ہوتا کہ اکثر ان کے ساتھ شریک نہ ہوتے بلکہ

"ایک طرف بیٹھ جاتے اور یوں کہہ دیا کرتے تھے کہ بھئی تم سب کھیلو۔ میں تمہارے کپڑوں کی حفاظت کرونگا"[۳]

بچپن ہی میں عبرت و نصیحت آموزی

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ کی عمر چار یا پانچ سال کی تھی کہ والدہ ماجدہ نے آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی عنایت احمد کو دودھ بانٹ کر دیا۔ آپ بتقاضائے عمر ضد کرنے لگے کہ مجھے دودھ کم دیا ہے۔ بڑے بھائی نے دونوں جگہ کا دودھ پی لیا۔ مولانا کو زیادہ تو کیا ملتا۔ اپنا حصہ بھی گیا۔ بس اسی عمر میں یہ سبق حاصل کر لیا کہ بے جا ضد کرنا یا ہٹ کرنا اپنا نقصان اور حق کا ضائع کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر کبھی ضد نہیں کی۔ فرمایا کرتے کہ

"مجھے دودھ کے قصہ سے یہ تجربہ حاصل ہو چکا ہے کہ ضد کرنے کا نتیجہ اپنے اصل حصہ سے محروم ہو جانا ہے"۔

ایک تمنائے جوانمردی ہے ناسخ ترکِ حرص
عمر بھر میں ہے دم آب اکتفا تلوار کو

بچپن میں قناعت و استقلال

جس عظیم ہستی نے لوگوں کو قناعت و استقلال اور صبر و شکر کی تلقین کرنا تھی، اور لوگوں کے دلوں سے حرص و طمع اور غرض و جاہ اور دنیا کی محبت کو نکال کر اس میں خدا اور رسول کی محبت پیدا کرنا تھی، ضروری تھا کہ وہ خود اس پر بچپن ہی سے عامل ہو۔ صبر و قناعت اور استقامت کا یہ جوہر بچپن میں کس قدر تھا اس کی مثال تذکرۃ الرشید سے پڑھیے:۔

"ایام طفولیت میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بخار میں مبتلا ہوئے اور مرض کو اس قدر امتداد ہوا کہ کامل چار سال تک بخار نے

---

[۱] تذکرۃ الرشید ص ۲۴ ۔ [۲] تذکرۃ الرشید ص ۲۴ ۔ [۳] حوالہ مذکور ص ۲۴

حق تعالیٰ شانہٗ نے علمائے زمانہ کے مقتدا بننے والے امام کو ابتدا ہی سے عادات حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے ساتھ سنوارا اور آراستہ فرمایا تھا۔ بچپن ہی میں ایک خدا ترس، رحمدل، عابد، خوش خلق، متین و سنجیدہ غیور و باحیاء، صابر و مستقل مزاج حلیم و بردبار، مہذب و باادب اور نہایت درجہ سلیم الطبع ثابت ہو چکے تھے آپ کو ضد اور اصرار، ہٹ دھرمی و شرارت چھچھورا پن اور بے تہذیب و غیر تربیت یافتہ بچوں کی عادتوں سے طبعاً نفرت تھی، آپ کا چھ سات سال تک ناز پروردگی اور لاڈ پیار کا زمانہ اور آٹھویں سال یتیمی یعنی سر پرست و مربی کا سایہ سر سے اٹھ جانا جن عادات کو مقتضی ہے۔ ان بدخصلتوں کا آپ میں نام بھی نہ تھا۔[1]

تعلیم۔ ذہانت

آپ کے قرآن پاک ناظرہ پڑھنے کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں سے پڑھا غالباً گھر ہی میں والدہ ماجدہ سے یا والد ماجد سے پڑھ لیا ہوگا۔ آپ کے سوانح میں آپ کے پہلے استاد کا اسم گرامی میاں جی قطب بخش صاحب مرحوم ہے، آپ نے ان سے چند دن بعد ہی اپنی ذہانت و ذکاوت کا اعتراف کرا لیا۔ میاں جی مرحوم حضرت کے ننھیال کی طرف سے رشتہ دار بھی تھے لہٰذا غایت شفقت کے ساتھ ساتھ استادانہ سختی و ڈانٹ ڈپٹ بھی رکھتے تھے۔ ان کے بعد فارسی آپ نے کرنال میں اپنے منجھلے ماموں مولوی محمد تقی مرحوم سے پڑھی جو فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ اسی طرح فارسی کا کچھ حصہ مولوی محمد غوث مرحوم سے پڑھا۔ فارسی پڑھنے کے بعد عربی کا شوق ہوا اور آپ نے ابتدائی صرف و نحو کی کتابیں جناب مولوی محمد بخش صاحب رامپوری سے پڑھیں۔ رامپور حضرت کی دادھیال اور آپ کے دادا قاضی پیر بخش کا اصل مسکن تھا۔ لہٰذا آپ کی روحانی تربیت کا سلسلہ بھی ادھر منتقل ہوا۔ مولوی محمد بخش موصوف آپ کے نہایت شفیق استاد تھے آپ کو حزب البحر اور دلائل الخیرات کی اجازت اپنے استاد مولوی محمد بخش صاحب ہی سے ملی۔ مولوی صاحب نے ابتدائی کتب پڑھانے کے بعد مشورہ دیا کہ آپ تکمیل تعلیم کے لیے دہلی چلے جائیں۔ وہاں بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ موجود ہیں۔ یہ قصہ ۱۲۶۱ھ کا ہے جب کہ آپ ہدایت النحو پڑھتے تھے چنانچہ آپ نے استاد کے صائب مشورہ پر دہلی کا سفر کیا۔

ورودِ دہلی

ان دنوں دہلی میں حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب، مولانا شاہ احمد سعید صاحبؒ اور حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کی بہت شہرت تھی۔ آخر الذکر عربک سکول میں صدر مدرس تھے اپنی علمی قابلیت اور فکری صلاحیتوں کی وجہ سے آفاقی شہرت کے مالک مولانا مملوک علی نانوتہ کے رہنے والے تھے ۱۲۶۰ھ کو ایام تعطیل گذارنے گھر گئے تو واپسی پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو تعلیم کے لیے اپنے ساتھ لے آئے۔ حضرت گنگوہیؒ ۱۲۶۱ھ کو دہلی پہنچے۔ اِدھر اُدھر پھر پھرا کر درسگاہوں کو جانچتے رہے لیکن کہیں تسلی نہ ہوئی ایک دن مولانا مملوک علی کے ہاں پہنچے تو آتے ہی دل لگ گیا اور فیصلہ کر لیا کہ یہیں پڑھوں گا۔ اللہ کو منظور تھا کہ اپنے زمانہ کے شمس و قمر ایک جگہ تعلیم حاصل کر کے برصغیر میں اشاعت

---

[1] تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۹ ج ۱۔ مولانا مملوک علیؒ آپ حضرت مولانا یعقوب نانوتوی صدر مدرس اول دار العلوم دیوبند کے والد ماجد تھے۔ آپ نے درسیات کا اکثر حصہ بلکہ یوں کہیے کہ جملہ علوم و فنون جناب مولانا رشید الدین خاں سے پڑھے۔ جو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ارشد التلامذہ ہیں۔ مولانا کریم الدین اپنی کتاب "طبقات الشعراء ہند" میں لکھتے ہیں:۔

"بندے کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہا جائے تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل سے مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھائیں گے گویا ان کو حفظ ہے" الخ

حضرت نانوتویؒ مولانا محمد قاسمؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور سر سید احمد خاں مرحوم جیسے مشاہیر نے اکثر درسی کتابیں حضرت مولانا مملوک علی ہی سے پڑھی ہیں۔ ۱۲۶۷ھ میں وفات پائی۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دربارِ دُربار میں

دہلی میں تعلیم کے دوران میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چار سال اس طرح یک جان و دو قالب رہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ازل سے ایک دُوسرے کے ساتھی چلے آ رہے ہیں. حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نانوتہ کے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ننھیال نانوتہ میں حضرت نانوتوی کے خاندان میں تھی اس طرح آپس میں خاندانی رابطہ بھی تھا اور حضرت حاجی صاحب کی ہمشیرہ بھی نانوتہ بیاہی ہُوئی تھیں اس لیے حضرت حاجی صاحب اکثر نانوتہ تشریف لاتے. تو حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا محمد یعقوب دونو حاضر خدمت ہوتے. حاجی صاحب کا ان دونو نونہالان چمنستانِ علم کے ساتھ بچپن ہی سے غایت شفقت و محبت اور اخلاص کا معاملہ تھا. کتاب کی جزبندی دونو بزرگوں نے حضرت حاجی صاحب سے سیکھی. حضرت نانوتوی جب وطن سے دہلی اور دہلی سے وطن جاتے تو تھانہ بھون ضرور حاضری دیتے یہ ہمیشہ کا معمول تھا. اور اعلیٰ حضرت حاجی صاحب جب دہلی جاتے تو مولانا مملوک علی کے پاس قیام فرماتے. اس طرح شاگردِ رشید مولانا مملوک علی حضرت نانوتوی کو حاجی صاحب کی زیارت ہوتی رہتی. حضرت نانوتوی تمام ساتھیوں سے عموماً اور خصوصی رفیق و محب حضرت گنگوہی سے خصوصاً حاجی صاحب کا تذکرہ کرتے رہتے.

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی جو پہلی زیارت حضرت گنگوہی صاحب نے کی وہ یہیں دہلی میں مولانا مملوک علی کے ہاں کی. دونو بزرگ دہلی میں جب پڑھتے تھے تو مولانا مملوک علی سے عرض کیا کہ سُلّم پڑھا دیجئے. انہوں نے فرصت نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا. آخر شاگردوں کے اصرار پر ہفتہ میں دو دن مقرر ہوئے. ایک دن سبق ہو رہا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے یہ کون تھے یہ قصہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سُنیے بڑا لطف آئے گا

> ہفتہ میں (سُلّم کے) دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی. ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہُوئے آنکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب معہ تمام مجمع کے کھڑے ہوگئے. اور فرمایا کہ لو بھائی حاجی صاحب آگئے. حاجی صاحب آگئے اور (حضرت مولانا سے) مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا." مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا. اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ "بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی رہ گیا." مولوی محمد قاسم نے کہا ہا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں اور "ایسے ہیں ایسے ہیں." "ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈ لیں گے." اوّل زیارت مجھے اس وقت ہُوئی تھی اس کے بعد حضرت حاجی صاحب ہم دونو کا حال دریافت فرمایا کرتے. اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں وُہ دو طالب علم (مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی رحمہما اللہ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور بس[1]

حاجی صاحب کی کرامت

دوسری ملاقات تھانہ بھون میں ہُوئی جبکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کئی طالب علموں کے ساتھ تھانہ بھون گئے اور سب طلبہ نے مسجد میں قیام کیا. حضرت گنگوہی کا جوتہ بدلا گیا اتنے میں حاجی صاحب آگئے اور فرمایا کہ جوتہ (بدلا ہوا) دکھاؤ. اور چراغ کے سامنے دیکھ کر فرمایا کہ "یہ تو حبیب حسن کا ہے." حالانکہ حاجی صاحب حبیب حسن کو بھی نہ جانتے تھے جوتا تو کیا پہچانتے. حضرت گنگوہی نے یہ ماجرا دیکھا تو کشش سی پیدا ہُوئی کہ حاجی صاحب صاحب کشف آدمی ہیں (ان کی پہلی تعریفات ان کے ذہن میں تھیں) ـــ ویسے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ تھا کہ حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونگا

[1] تذکرۃ الرشید صـ۴۱

کیونکہ آپ صحاح کی کتب پڑھنے کے دوران ان کے تقویٰ و زہد اور اخلاص عمل کا خوب مشاہدہ کر چکے تھے مگر دل کی بات زبان پر نہ لا سکے اور بغیر کسی کے بیعت ہوئے تکمیل علوم کر کے گنگوہ آ گئے [1]

تیسری ملاقات

ایک مرتبہ گنگوہ مسجد میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور پاس آ کر کھڑے ہو گئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے نظر اوپر اٹھائی تو ایک نورانی صورت نظر پڑی لیکن پہلی نظر میں پہچان نہ سکے اور پوچھا کون؟ جواب ملا۔ امداد اللہ۔ حضرت فوراً اٹھے اور تعظیم و تکریم سے پیش آئے اور اس سے زیادہ شفقت و محبت کا مظاہرہ حاجی صاحب کی جانب سے ہوا [2]

چوتھی ملاقات

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی گنگوہ بالقصد آنے یا کہیں آتے جاتے گنگوہ اتفاقیہ قیام ہوتا تو مولوی سراج الدین کے مکان پر قیام فرماتے تھے جو ملازم ہونے کے باوجود نہایت پارسا اور متقی انسان تھے کبھی رشوت یا اس قسم کا کوئی پیسہ کسی سے نہیں لیا۔ یہ حضرت گنگوہی کے رشتہ دار تھے۔ ایک ملاقات ان کے ہاں ہوئی۔ اسی ملاقات یا کسی اور ایسی ہی ملاقات میں حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "میاں رشید احمد اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی تمنا ہے یا نہیں؟" مولانا نے جواب دیا کہ "حضرت جی تو بہت چاہتا ہے"۔ حاجی صاحب نے پوچھا کہ "کہاں اور کس طرف میلان ہے؟" مولانا نے جواب دیا کہ "اب تک جتنا غور و فکر کیا دو حضرات میں سے ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبد الغنی صاحب کا یا آپ کا"۔ اعلیٰ حضرت مسکرائے اور یہ فرما کر ٹال دیا کہ "ہاں صاحب شاہ عبد الغنی صاحب عالم بھی مشہور ہیں محدث ہیں علماء تو علماء ہی کی طرف جھکتے ہیں مجھے کیوں شامل کرتے ہو۔ میں بے چارہ پڑھا نہ لکھا"۔۔۔۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے بظاہر تو اپنی طرف سے رغبت کم کی مگر اندر ہی اندر دل کھینچ لیا۔ اس گفتگو کے بعد آپ کا ارادہ حاجی صاحب کے متعلق پختہ ہو گیا [3]

تھانہ بھون حاضری اور بیعت

تھانہ بھون میں ایک بڑے عالم۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے ان کی ایک تحریر کسی نے حضرت گنگوہیؒ کو بھیجی جس میں لکھا تھا کہ "روضہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں جو جگہ ایک قبر کے لیے چھوٹی ہوئی ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مدفون ہونگے اور یہ امر قطعی ہے اس کا منکر ایسا ہے اور ویسا ہے"۔۔۔ حضرت مولانا نے بجائے تصدیق و تصویب کرنے کے لکھ دیا کہ "سارا ثبوت باحادیث و اخبار احاد ہے اس لئے علم ظنی حاصل ہوگا قطعیت کا ثبوت دشوار ہے"۔ حضرت شیخ محمد صاحب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو غضب میں آ گئے کہ ایک طفل مکتب نے میرا رد کرنا چاہا اسی حالت میں ایک رسالہ اپنے موقف کی تائید میں لکھ کر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا۔ مولانا نے دیکھا تو سوائے ان احادیث و آثار کے ذکر اور اسناد کی تفصیل کے جن میں یہ مضمون وارد ہے اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور اس کا اقرار مولانا نے اپنی پہلی تحریر میں ہی کر لیا تھا۔ مولانا نے اس رسالہ کے پشت پر لکھ دیا کہ

میں نے نہ احادیث کا انکار کیا نہ اس کا دعویٰ کہ یہ مضمون ثابت نہیں ہاں میں نے یہ لکھا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اس بحث کی جملہ اخبار واردہ احاد ہیں ان سے مضمون کی قطعیت کیونکر ثابت ہو جائے گی جو میرا شبہ ہے اس کا رسالہ میں جواب نہیں اور جو احادیث مذکور ہیں ان کا میں منکر نہیں [4]

---

[1] تذکرۃ الرشید ص۴۱ ۔ [2] بحوالہ ایضاً ص۴۲ ۔ [3] ایضاً ص۴۳ ۔ [4] تذکرۃ الرشید ص۴۴ ۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ علماء میں سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے حضرت حاجی صاحب سے بیعت کی تھی اس کے بعد تو اس کثرت سے علماء بیعت ہوئے کہ اس کی مثال شاید دنیا میں ایک آدھ ہی مل سکے۔ سات آٹھ سو کے قریب علماء حاجی صاحب کے مرید تھے عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ——— اور اس چیز کی بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاجی صاحب کو ایک خواب کے ذریعے دے چکے تھے امدیہ اسی بشارت کا ثمرہ تھا اور بشارت حاجی صاحب کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے تھی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے۔ یہ عجب قصہ تھا کہ حضرت نانوتویؒ کے تعریف کرنے سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان ہوا۔ لیکن حضرت نانوتویؒ کو حضرت گنگوہیؒ نے سفارش کر کے بیعت کرایا۔

چالیس دن میں خلافت

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن کے ارادہ سے تھانہ بھون گئے تھے لیکن حضرت حاجی صاحب کے دربار میں پہنچ کر کچھ ایسے شیخ کی محبت میں گرفتار ہوئے کہ خود ہی ایک دفعہ فرمایا کہ "پھر تو مرمٹا" ظاہر ہے کہ جو محبوب حقیقی سے ملا دے۔ اس سے زیادہ محبوب اور کون ہوگا۔ اور بقول صاحب تذکرۃ الرشید حقیقت میں حضرت مولانا اس کے بعد مرمٹے آپ نے اپنے نفس کو مار دیا ہوائے نفس کو ملیامیٹ کر دیا۔ جس پاک نام کو سیکھنے کا قصد کیا تھا اس میں کھپ گئے۔ فنائیت حاصل کی اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ٭ باوصف خانہ داری اور اہل وعیال سے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے۔ گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا دانائے عصر اور علمائے زمانہ ہر ایک آپ کا مخلص و مستفاد تھا۔ ہر وقت عشق الٰہی میں مست و سرشار رہتے تھے دل کی کیفیت چہرۂ مبارک پر معلوم ہوا کرتی تھی محبت الٰہی کا صورت شریف پر ہر آن ظہور تھا۔ میاں جی سے بیعت ہوئے تو آپ کے ارشاد پر کہ سوا لاکھ آیت کریمہ پڑھو۔ عصر سے لے کر دوسری عصر تک ورد پورا کر لیا اور تمام اشغال بہت جلد پورے کر لیے۔ کئی سال تک آدھ پاؤ کے قریب روزانہ کھانا کھاتے رہے۔ فانی الشیخ ہو گئے تھے۔ ۱۵ ر شعبان سے آخر رمضان تک ہر رات مشغول رہتے۔ شب کو سونا یا لیٹنا موقوف کر دیتے تھے۔ چند ہی دن میں کمال جذب کے ساتھ سلوک کی تمام منازل طے کر لیں۔ اور اس قدر کمال توحید اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے اس وقت تمام درویش اہل حال فن تصوف میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیران تھے ———

مولانا شیخ محمد محدث تھانوی نے پہلے حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سے کسب فیض کیا (آپ مولانا کے ماموں بھی تھے) آپس میں ہم عمر تھے۔ بعد ازاں میاں جیؒ سے بیعت ہوئے۔ حضرت حافظ اتباع شریعت اور زہد و تقویٰ میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ادنیٰ بدعت کو بھی اکھاڑ پھینکتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں احتیاط پر عمل کرتے۔ اوامر و نواہی میں شان فاروقی عروج پر ہوتی تھی کہ نسباً فاروقی تھے۔ اخفائے حال کو پسند کرتے تھے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت پیران کو تنبیہ کی جیسا کہ حاجی صاحبؒ کے ذکر میں گزر چکا۔

شہادت اور کشف شہادت

سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی کے جہاد میں حصہ لیا آپ کو اپنی شہادت کا کشف ہو چکا ہے۔ چنانچہ آٹھ دس روز پہلے اپنے ایک مرید کو خط لکھا (فارسی میں) کہ "لازم کہ بغور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچا دلیا نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے باقی حال بر وقت بیان کیا جائے گا۔"

شہادت کا دولہا

میدان شہادت میں جانے سے پہلے آپ نے خوب زیب و زینت کی۔ غسل کر کے نیا لباس زیب تن کیا جو کئی دن سے تیار کر رکھا تھا۔ نعلین اگرچہ بوسیدہ نہ تھیں۔ مگر وہ بھی نئی پہنیں۔ خوشبو مل سر پر لگایا دستار پیچدار، سپاہیانہ وضع شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنا میں علم جوانمردی اٹھا کر مردانہ اور مشتاقانہ بر سر معرکہ جان بحق تسلیم فرمائی۔ شہادت کے سال اکثر فرمایا کرتے ——— "دیکھو حوریں پیالے لیے ہوئے بالوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے لے لیوے" ——— حافظ صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ (باقی برصفحہ آئندہ)

حاضری کے وقت مختصر قیام کا خیال تھا۔ مگر اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ فنا عن الفنا پر پہنچ کر اپنی فنائیت سے بھی بے خبر اور فانی محض بن گئے:" ——— یہ خیال کرتے کرتے کہ آج نہیں کل چلا جاؤں گا پورا ایک چلہ یعنی چالیس دن وہیں گزار دیئے۔ چالیس کے عدد کو تزکیہ قلب کے باب میں خاص دخل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا مگر دس راتیں اور ملا کر چالیس راتیں پوری کیں۔ حضور علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے مقام پر سرفراز کیا گیا۔ مدینہ منورہ کے قیام پیغمبر کو خلافتِ راشدہ کے تیس سال میں جمع کیا جائے تو چالیس کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ چالیس سال کے بعد انسان کو اعمال و کردار کے لحاظ سے مثالی شخصیت بن جانا چاہیے۔ اسی طرف شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے ؎

چہل سال عمر عزیزت گذشت — مزاج تو از حال طفلی نگشت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ⁂ بوقت شہادت یعنی نزع کے وقت میرے پاس رہنا۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ آپ کو گولی لگنے کے بعد قریب کی مسجد میں لے گئے۔ اور اپنے زانوں پر سر رکھا اور اسی عالم میں یہ شہید الفت اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملا جس سے ملنے کے لیئے بے حد بے چین تھا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ؎

ان کے محاسن میں وہ چمکے عذار — شعلے کی جو دود سیہ میں بہار

سینے پہ کچھ بال سیہ ہیں نمود — ہیں یہ اسی آتش سوزاں کے دود

اور یہ سراپا شہادت کے وقت کا ہے گویا حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سینہ اور داڑھی کے بال اس وقت سیاہ تھے۔

تاریخ شہادت

آپ نے ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو سوموار کے دن ظہر کے وقت شہادت پائی۔ آپ کی شہادت پر جو تاریخیں کہی گئیں وہ یہ ہیں:-

شہادت مرشد ہادی ۱۲۷۴ھ (از محمد علاؤالدین رام پوری)

مرزا غالب کے شاگرد مولوی عبدالسمیع صاحب بیدل رام پوری نے یہ اشعار لکھے جس سے معرکۂ جہاد پر بھی تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے:۔

شہید ہو گئے ضامن علی پاک نہاد — جواب جن کا نہ تھا کوئی نسل آدم میں

شہید ہو گئے مگر اک تماشا دکھلا کر — لہولہان کیا دشمنوں کو اک دم میں

نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی — گلو بریدہ ہے سکھ بھی ان کا درہم میں

جو مارے تیر تو لگتے ہی جا لیا گوشہ — ہزاروں کافر بدکیش نے جہنم میں

خدا کو پیارے ہوئے آخرش شہید ہوئے — نہ دل میں تاب ہے باقی نہ کچھ تواں ہم میں

جو پوچھا سن شہادت کہا فلک نے کہ ہائے — ہوئے شہید وہ شاہ جری محرم میں

دوسری تاریخ بیدل صاحب نے یوں نکالی:۔

بیدل آں وقت کہ حافظ ضامن — رفت و آراست بجنت مسند

شاہ رضواں شد و گفت ایں تاریخ — حافظ مصحف ایزد آمد!

میاں جی عبدالغفور:۔ حوریں سب مل کر کے بولیں واہ وا — پیر کے دن خلد میں آ گئے پیر

(باقی بر صفحہ آئندہ)

تھا کہ مشکل گزارا ہوتا تھا۔ تذکرۃ الرشید میں آپ کے مشہور و معروف چند نسخوں اور ان کے اجزا کا بھی ذکر آیا ہے۔ دلچسپی رکھنے والے اصحاب تذکرۃ الرشید کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم نے یہاں اس کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ علم طب کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی ہے اور یہ خدمت خلق اور غمگساری و ہمدردی کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے۔ بشرطیکہ اسی نیت سے کیا جائے۔

بہتر ہے وہی علم میں جو خلقِ خدا کو ۔۔۔ پہنچائے نفعِ عام ہے جان کا ہو کہ تن کا
بس علم تو دو ہی ہیں بحکم شہ لولاک ۔۔۔ ایک علم رہ دین دوم علم بدن کا

تحریک آزادی اور حضرت گنگوہی

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی صاحبؒ حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ سمیت ان حضرات نے جو حصہ لیا اس کا اجمالاً تذکرہ آچکا ہے تفصیل کی نہ وہاں گنجائش تھی نہ یہاں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ تینوں حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ حضرت نانوتویؒ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت غار ثور پر عمل کرتے ہوئے تین دن روپوش رہے اور چونکہ غار ثور میں روپوشی کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمن قابو نہ پا سکے تھے۔ اسی طرح اس ہندی نژاد محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کی روپوشی کے بعد (باوجودیکہ وارنٹ گرفتاری جاری اور پولیس تلاش کر رہی تھی) روپوشی سے خلاف سنت ہونے کی وجہ سے جب مزید روپوشی سے انکار کر دیا تو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کے صدقے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا اور خفیہ طریقے سے ساحل کی راہ لی

شیخ کی محبت

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے روانہ ہونے کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ کی مفارقت کا بے پناہ صدمہ تھا۔ آپ کو اس صدمہ میں نیند نہیں آتی تھی۔ یہی خواہش تھی کہ کسی طرح ایک مرتبہ ان کی زیارت کر لوں۔ لیکن شیخ کی جائے قیام کا علم نہ تھا بصد دقت پتہ چلا کہ آپ پنجلاسہ میں ہیں۔ چنانچہ وہاں پہنچے۔ ملاقات ہوئی زیارت سے مشرف ہوئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بے حد اصرار کیا کہ مجھ کو بھی اپنے ہمراہ لے لیجیے۔ مگر حضرت حاجی صاحبؒ راضی نہ ہوئے اور فرمایا

"میاں رشید احمد تم سے تو حق تعالیٰ نے بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت۔ ہندوستان سے نکلتے وقت تم سے ضرور ملوں گا۔"

اور حاجی صاحب نے ملاقات کا یہ وعدہ پورا فرمایا

رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری کا قصہ آگے آ رہا ہے حاجی صاحبؒ کا ذکر آیا ہے تو دو واقعات کا ذکر یہیں کر دینا مناسب ہے حضرت مولاناؒ کی گرفتاری اور جیل جانے پر ایک دفعہ یہ خبر پھیلی کہ ان کو پھانسی کا حکم ہو گیا ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کو بھی یہ خبر پہنچی تذکرۃ الرشید میں ہے:-

بروایت مولوی ولایت حسین۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ "میاں کچھ سنا کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا؟" خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں ابھی تک تو کوئی خبر نہیں آئی فرمایا "ہاں حکم ہو گیا چلو" یہ فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی غرض تین آدمی چلے۔ شہر سے نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیٰ حضرت زمین کی گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت

فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا "پھر چلو مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا خدائے تعالیٰ کو ان سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے" چنانچہ چند روز بعد اس کا ظہور ہوگیا۔ ———— والحمد للہ علی ذالک [1]

ایک اشکال اور اس کا حل

پچھلی سطور میں گزر چکا ہے کہ حاجی صاحبؒ نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اس استدعا پر کہ میں بھی آپ کے ہمراہ چلونگا۔ فرمایا تھا کہ "تم سے تو حق تعالیٰ نے ابھی بہیترے کام لینے ہیں:" جب یہ بات منکشف ہو چکی تھی تو پھر پھانسی کی خبر کا کیوں یقین کیا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کشف کا تعلق امور باطن سے ہے اور خبر احکامِ ظاہر سے تعلق رکھتی ہے کشف کے مقابلہ میں جب خبر آجائے تو اس کا تبیّن ایک فطری امر ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی تعلیم ہے۔ اگرچہ خبر دینے والا فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر کسی مطلق خبر کی تردید پھر کشف سے ہو جائے تو اس سے پہلے کشف کو اتنی قوت ضرور مل جائے گی کہ وہ مطلق خبر کی تردید کر سکے۔ جس خبر کی تردید نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف خبر عدل ہے علامہ خالد محمود عقیدۃ الامت کے حاشیہ پہ لکھتے ہیں:۔

> "نبوت پر جس غیب کا اظہار ہو۔ اس میں قطعیت ہوتی ہے اور وہ اخبارِ غیبیہ یقینی طور پر معصوم ہوتی ہیں۔ جن میں شک، وسوسے یا شیطان کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہو سکتا اور نبوت کے علاوہ جتنے بھی مقامات ہیں جن میں کہ بعض اخبارِ غیبیہ کا اظہار ہوتا ہو ان میں وہ قطعیت نہیں ہوتی کہ ان پر احکام شروع یا احکامِ عدالت کی بنا رکھی جاسکے۔" (عقیدۃ الامت صفحہ ۴۸)

اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ حضرت حاجی صاحب نے تو آپ سے حجاز روانہ ہونے سے پہلے ایک ملاقات کا وعدہ فرمایا تھا مگر آپ جیل میں رہے اور رہائی سے قبل حضرت عازم حجاز ہو گئے، یہ وعدہ کب پورا ہوا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ہی ہلکی آواز میں فرمایا "اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے" چنانچہ دوسرے طرق سے معلوم ہوا کہ حضرت حاجی صاحب باوجود سنگین پہرہ کے جیل میں حضرت مولانا سے جاکر ملے کئی گھنٹے باتیں کرکے شب ہی میں واپس ہوئے اور عرب کو روانہ ہوئے۔

گرفتاری اور زنداں

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پنجلاسہ سے گنگوہ تشریف لائے۔ یہاں ان کے احباب نے اصرار کیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ نکل چکا ہے۔ چنانچہ اپنی دادھیال قصبہ رام پور چلے گئے۔ اور حکیم ضیاء الدین کے مکان میں مقیم ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد گارڈن کرنیل فرانسیسی غلام علی ساکنہ قصبہ ملی پور ضلع سہارنپور مخبر کے ہمراہ ستر سواروں کے ساتھ گنگوہ پہنچا اور آتے ہی مولانا کی تلاش کی۔ سوار ادھر ادھر پھیل گئے مسجد اور خانقاہوں کے حجروں کو دیکھا۔ ان کے ملنے والوں کے مکان کی تلاشی بھی لی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی ابو النصر صاحب جو صورت و وضع میں حضرت سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ مسجد کے گوشہ میں گردن جھکائے مراقبہ میں بیٹھے تھے کہ دوڑ کر سپاہی نے گردن پر زور کا ہاتھ مارا اور قبضہ میں لے کر پکارا چل کھڑا ہو کیا گردن جھکائے بیٹھا ہے۔ مولوی ابو النصر نے گردن اٹھائی اور جدھر اس نے کہا چل کھڑے ہوئے۔ حضرت مولانا کے دروازے پر ان کو لا کھڑا کیا اور کہا کہ گھر کی تلاشی دلوا اور دکھا کیا ہتھیار ہیں۔ کچھ دیر تک مولوی ابو النصر مار کھاتے ذلت سہتے رہے مگر یہ نہیں بتایا کہ میں مولوی رشید احمد نہیں ہوں۔ جب فوجیوں کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا رشید احمد نہیں ہیں

---

[1] تذکرۃ الرشید صفحہ ۸۵

پہلا حج

آپ کے دن بڑی غربت اور تنگدستی سے گذر رہے تھے۔ لیکن حرمین شریفین کی حاضری کے لیے آپ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔ لیکن صورت حال یہ تھی کہ آپ کی اقتصادی حالت اس قدر کمزور تھی کہ بمشکل اہل و عیال کی گذران ہوتی تھی۔ پھر یہاں تک کہ آپ کی خواہش یہ ہوتی کہ جس حال میں پڑا ہوں اسی گمنامی و گوشہ نشینی کی حالت میں پڑا رہوں کسی آنکھ یا کان کو اس کی خبر نہ ہو۔ ان حالات میں حرمین شریفین تک آنا جانا کیسے ہو؟ لیکن جب طلب سچی ہو تو اللہ تعالے اسباب پیدا فرما دیتے ہیں۔

ڈپٹی عبدالحق رامپوری کا قصد حج ہوا اور انہوں نے اپنے اہل و عیال اور متعلقین و وابستگان کا ایک جم غفیر ساتھ لیجانا چاہا۔ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری جو حضرت حافظ شہید ؒ سے خلیفہ مجاز تھے۔ ڈپٹی صاحب کے احباب میں سے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے حکیم صاحب کو بھی ساتھ لیا۔ حکیم صاحب حضرت گنگوہی ؒ کے عشاق میں سے تھے کیونکہ انہیں علم تھا کہ میرے پیر و مرشد نے حضرت گنگوہی ؒ کے زانو پر جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ حکیم صاحب نے حضرت گنگوہی ؒ کا ذکر کیا تو ڈپٹی صاحب بلا ادنیٰ تامل مان گئے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ مولانا گنگوہی جیسا محب رسول ؐ و متبع سنت ہمارے قافلے میں شریک ہو۔ مولوی ابوالنصر کہ حضرت گنگوہی ؒ کے ماموں زاد بھائی جو حضرت کے بچپن کے ساتھی اور جاں نثار رفیق تھے ان کو جب علم ہوا کہ مولانا سفر حج پر جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنا اثاثہ اونے پونے بیچ کر معہ اہلیہ معیت اختیار کی۔ ان دنوں سفر حج انتہائی دشوار تھا۔ اور فریضہ حج کی ادائیگی سب فرائض سے مشکل تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ دخانی کشتیاں تین تین چار چار ماہ سمندر میں ہچکولے کھاتی رہتیں۔ آپ کے سفر میں سخت طوفان آیا تمام مسافر گھبرا گئے۔ مگر آپ نہایت پرسکون تھے لوگوں کی گھبراہٹ پر انہیں یہ کہکر تسلی دی کہ "بھئی کوئی مریگا تو ہے نہیں ہم تو کسی کے بلائے ہوئے جا رہے ہیں خود نہیں جا رہے" اور جہاز جب اصلی حالت پر آیا تو کپتان نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس طوفان کی وجہ سے ہمیں آٹھ دن کی مسافت تین دن میں طے کرا دی ہے۔

رویائے صالحہ

آپ کے شریعت و طریقت دونوں کے شیخ یعنی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت حاجی صاحب علی الترتیب مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں قیام کیے ہوئے تھے۔ حرمین شریفین کی حاضری اور شیخین کی زیارت کے تصور نے حضرت گنگوہی کو بیخود بنا رکھا تھا۔ مکہ معظمہ میں حاجی صاحب کی زیارت ہوئی۔ حج کے دوران حضرت حاجی صاحب نے اپنے طالب صادق کو ہر وقت ہمراہ رکھا آپ نے مکہ معظمہ ہی میں خواب دیکھا:-

"ابدال جیسے اہل خدمت اولیاء کا ایک گروہ جا رہا ہے اور آپ ان کو دیکھ رہے ہیں آپ فرماتے تھے کہ میں نے خواب ہی میں دعا مانگی کہ یا اللہ مجھے بھی ان سے لاحق کر دے۔ یہ دعا مانگ کر میں ان کے پیچھے دوڑا اور ان کی جماعت میں مل گیا۔"

صبح کو اعلیحضرت کو خواب سنایا تو مسکرا کر فرمایا۔ "پھر اب کیا چاہتے ہو لاحق تو ہو گئے"۔

مکہ معظمہ ہی میں دوسرا خواب دیکھا:-

"آپ کے ہاتھ کی چاروں انگلیوں سے خون جاری ہے دو سے بکثرت اور تیسری سے کم اور چوتھی سے اور کچھ کم"

آپ نے یہ خواب مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے بیان کیا انہوں نے تعبیر دی کہ "تمہاری چاروں نسبتیں (چشتی سہروردی نقشبندی قادری) جاری ہوں گی دو کا جریان بہت ہوگا" حضرت مولانا گنگوہی ؒ سے ان چاروں نسبتوں کا جس طرح فیضان ہوا اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ لیکن آپ بکمال انکساری فرمایا کرتے تھے کہ "اس وقت سے اب تک منتظر ہوں۔ مولوی مظفر حسین زندہ ہوتے تو کہتا۔ کہ آپ ہی نے تعبیر فرمائی تھی دیجیے"

"ادب کله - ادب الحضرة الالٰهیة الاعراض عما سواه حیاءً واجلالاً وهیبةً - اسواء المعاصی حدیث النفس وسبب الظلمة"

(تذکرۃ الرشید ص ۱۱ دوسرا حصہ)

سارا ادب ہی کا نام ہے - بارگاہ احدیت کا ادب یہ ہے کہ ماسوائے اللہ سے منہ پھیر لیا جائے - شرم کے مارے حق تعالیٰ کے اجلال و ہیبت کے سبب حدیث نفس (یعنی نفس سے باتیں کرنا) بدترین معصیت اور ظلمت کا سبب ہے -

امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے صوفی اور اچھے انسان اور مسلمان کی جو تفصیل بالاجمال مندرجہ بالا عبارت میں فرمائی ہے - وہ ان تمام کتب کا خلاصہ ہے جو چودہ سو سال میں اسلام کی تعبیر و تشریح میں لکھی گئی ہیں اور ہر وہ مرشد یا شیخ یا معلم جو صحیح معنوں میں اس نام کا حامل ہوگا، اس میں ان صفات کا پایا جانا ضروری ہے - خود حضرت گنگوہیؒ میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اور وہ اپنے زمانے کے فرد وحید تھے - جو صحیح معنوں میں شرک و بدعت کے مخالف اور احکام شرعیہ و سنن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی تھے - حق یہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں رنگ لیا تھا - مدح و ذم ان کیلئے یکساں تھی - نہ تعریف انہیں خوش کرتی تھی اور نہ ہی ان کی مذمت ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات چھوڑتی تھی -

شیخ کا امتحان

پہلی بار جب آپ ایک چلہ تھانہ بھون رہ کر آئے - چند دن ٹھیرنے کے بعد خیال ہوا کہ حضرت حاجی صاحب پر کھانے کا بوجھ بنے گا اور انتظام کرنا چاہیے لیکن ایسا انتظام دشوار تھا لہٰذا جانے کی اجازت چاہی - حاجی صاحب نے فرمایا ابھی چند روز اور ٹھیرو - میں خاموش ہو گیا لیکن یہ فکر ہوا کہ کھانے کا کیا کروں گا - تھوڑی دیر بعد حاجی صاحب تشریف لائے اور میرے وسوسہ پر مطلع ہو کر کہا "میاں رشید احمد کھانے کی فکر مت کرنا ہمارے ساتھ کھائیو" چنانچہ دوپہر کو گھر سے کھانا آیا ایک پیالہ میں لذیذ گوشت تھا اور دوسرے میں معمولی سالن تھا - حاجی صاحب نے معمولی سالن کا پیالہ میری طرف کر دیا - اتنے میں حافظ ضامن شہیدؒ آگئے اور فرمانے لگے بھائی صاحب! رشید احمد کو اتنی دور ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے اس پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ لیتے" - اعلیٰحضرت نے بے ساختہ جواب دیا" کہ اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں - جی تو چاہتا ہے کہ جوتے ہوں اور چماروں کی طرح ایک ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا" یہ فقرہ کہنے کے بعد حاجی صاحب نے مولینا گنگوہی کی طرف دیکھا - مولانا گنگوہی فرماتے ہیں کہ "حضرت کا یہ دیکھنا اس لئے تھا کہ کچھ تغیر تو نہیں - مگر الحمد للہ میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا - میں سمجھتا تھا کہ حقیقت میں جو کچھ حضرت فرماتے ہیں بالکل سچ ہے - اس دربار سے روٹی ہی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے - اس کے بعد حضرت نے پھر کبھی میرا امتحان نہیں لیا" اس کے بعد فرمایا۔" اسی لئے مجھ کو کچھ آیا نہیں ہے[1]

مجھے اس کی تمنا نہیں

ایک دفعہ آپ نانوتہ یا رام پور تشریف لے گئے - سردی کے موسم میں آپ گاڑھے کی میلی دوہر اوڑھے ہوئے بیٹھے تھے - آپ کے دائیں بائیں حضرت مولینا محمد یعقوب نانوتویؒ اور حکیم ضیاء الدین صاحب بیٹھے تھے - ایک صاحب آئے اور دائیں بائیں مصافحہ کر کے بیٹھ گئے - آپ کو باوجود درمیان میں بیٹھے ہوئے عام آدمی خیال

[1] تذکرۃ الرشید ص ۱۸۷ جلد ۲

کر کے چھوڑ دیا۔ مولینا محمد یعقوب صاحب چونکہ آپ سے بے تکلف تھے۔ لہذا مسکرائے۔ امام ربانی نے مطلب سمجھا اور فرمایا۔ "الحمد للہ مجھے اس کی تمنا نہیں کہ لوگ مصافحہ کریں"۔

بدعت اور ضلالت سے نفرت اتباع سنت کا جذبہ جس قدر آپ کے قلب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اُسی قدر شدید جذبہ بدعت و گمراہی کے خلاف تھا چنانچہ آپ کسی گمراہی یا خلاف شریعت کام کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ کرنال سے گنگوہ ایک برات آئی جس میں رقاصہ بھی تھی۔ اس برات میں کچھ لوگ آپ سے ملنے والے تھے۔ آپ اُس دن صبح اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد میں منہ ڈھانپ کر لیٹ گئے۔ واقف کار لوگ سلام کرنے کے لئے آئے۔ دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے منہ نہ کھولا۔ بالآخر ایک صاحب بولے۔ کہ حضرت ہم تو زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ آپ نے منہ ڈھانپے غصہ میں جواب دیا کہ "میری زیارت میں کیا دھرا ہے"؟ چنانچہ ایک سفید ریش بزرگ نے معاملہ سمجھ کر عرض کیا کہ حضرت ہم تو رنڈی کو ساتھ لائے نہیں، بیٹی والوں کی حرکت ہے۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ "میاں بیٹی والے کسی کے خدا تو نہیں ہیں کہ اُن کا کہنا مانا ہی جائے"۔ اسی جملے سے بہت سے حاضرین کے دل بھر آئے۔ وہ لوگ جب چلے گئے تو آپ نے منہ کھولا اور اُٹھ بیٹھے۔

اس میں تلمیذ رے تم تھے آپ کے جدِ امجد شاہ عبد القدوسؒ کا عرس ہوتا تھا۔ آپ اس کو بند کرنے پر قادر نہ تھے۔ اول اول آپ کو صبر کرنا دشوار تھا لہذا آپ ان دنوں رام پور چلے جاتے تھے۔ مگر جب آخر میں اس ایذا قلبی کی برداشت آپ کو دے دی گئی تو آپ یہ زمانہ خانقاہ ہی میں گذارتے۔ اگر کوئی آپ کا معتقد اُن دنوں آجاتا تو آپ کو تکلیف ہوتی۔ آپ اکثر ناراض ہوتے اور ترکِ تکلم فرما دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا حافظ محمد صالح صاحبؒ[1] حضرت گنگوہی کی زیارت سے بے تاب ہو کر گھر سے نکل پڑے۔ اتفاق سے عرس کا زمانہ تھا۔ اگرچہ آنے والے کو اس کا وہم بھی نہ تھا مگر حضرت گنگوہیؒ اپنے شیدائے سنت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ آپ سے نہ ہو سکا کہ ان کی مزاج پرسی کریں یا محبت و مدارات سے پیش آئیں۔ آپ نے بجز سلام

---

[1] حضرت مولینا حافظ محمد صالحؒ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپ صاحبِ فضل و کمال بزرگ تھے اور سلف صالحین کے زہد و تقویٰ کی تصویر۔ مشرقی پنجاب کے مشہور و معروف مدرسہ عربیہ مدرسہ رشیدیہ" رائے پور ضلع جالندھر کے آپ بانی تھے۔ یہ مدرسہ آج کل جامعہ رشیدیہ کے نام سے ساہی وال میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے دورِ قدیم کے صدر مدرس حضرت مفتی فقیر اللہ (جو متحدہ پنجاب کے نامی گرامی مفتی تھے) کے فرزند ارجمند مولینا حبیب اللہ اس کے ناظم اور مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے مولینا حافظ محمد عبد اللہ صاحب شیخ الحدیث ہیں۔ حضرت حافظ محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحب زادے حضرت مولانا عبد العزیز صاحب مقیم چک ۱۱ (۱۱-ایل) نزد چیچہ وطنی اور حضرت پیر جی عبد اللطیف صاحب مہتمم مدرسہ تجوید القرآن چیچہ وطنی ہیں۔ دونوں بزرگ صاحبِ نسبت اور صاحبِ قال و حال بزرگ ہیں۔ اس مدرسہ رشیدیہ کے پہلے مہتمم مولانا فضل احمد صاحب نے چک ۱۱ (۱۱-ایل) چیچہ وطنی میں چند سال قبل تقریباً سو سال کی عمر میں وفات فرمائی۔

ان سے یہ بھی نہ پوچھا کہ روٹی کھائی یا نہیں اور کب آئے یا کیوں آئے۔ مولانا محمد صالح کو اسی طرح کئی دن
کے جواب دینے کے ان سے یہ بھی نہ پوچھنا چاہیئے تھا۔ حاضر خدمت
گذر گئے۔ حضرت کا رخ پھرا ہوا دیکھنا جس طرح شاق گذر رہا تھا۔ اس کو انہی کے دل سے پوچھنا چاہیئے تھا۔ حاضر خدمت
ہوتے اور خاموش بیٹھ کر رنجیدہ و محزون واپس ہو جاتے۔ آخر اس حالت کی تاب نہ لاکر حاضر خدمت ہوئے اور رو کر عرض کیا
کہ حضرت مجھ سے کیا قصور ہوا جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ میں تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، اللہ واسطے معاف فرما دیجئے۔ اس وقت
حضرت نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا کہ ——— "میرا قصور نہیں کیا جس کو میں معاف کر دوں، خدا کی خطاء کی
ہے اس سے معافی چاہو"۔ اس وقت مولانا سمجھے کہ عرس کے دنوں میں آنا ناگوار گذرا ہے۔ چنانچہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا "کہ خدا
شاہد ہے مجھے تو عرس وغیرہ کے ساتھ ابتدا ہی سے شوق نہیں اور نہ مجھے اس کا علم تھا۔
حضرت امام ربانیؒ نے فرمایا۔ اگرچہ تمہاری نیت عرس میں شرکت کی نہ تھی مگر جس راستہ میں دو آدمی عرس کے لئے آ
رہے تھے اسی میں تیسرے تم تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

مَنْ کَثَّرَ سَوَادَ قَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ۔ جو آدمی کسی قوم کی کثرت کا باعث ہوا وہ انہی میں سے ہے۔

عمل پر مداومت اور استقامت

اصل کرامت شریعت کے اعمال و احکام پر استقامت اور مداومت ہے۔
یہ بڑا کٹھن اور مشکل کام ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں سنتِ رسول کا خیال رکھنا
اور ساری زندگی اس پر عمل کرنا سب سے بڑا مجاہدہ اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ حضرت گنگوہیؒ میں یہ بات کمال کو پہنچی
ہوئی تھی۔ اگر ایک آدمی آپ کو دس سال قبل مل کر گیا اور دس سال بعد پھر آیا تو آپ میں بلا کم و کاست اُسی طرح اتباعِ شریعت
کی محویت اور فنائیت دیکھتا تھا اور اسی استحکام و استقامت کے ساتھ اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب کرپاتا تھا۔
آپ کے مخالفین نے آپ کے خلاف بہت زور لگایا اور بہت کچھ تحریریں شائع کیں مگر الحمد للہ مخالفین کو باوجود حد درجہ مخالفت
کے آپ کی ذات پر کبھی کسی ایسے طعن یا الزام کا موقعہ عمر بھر نہ ملا جس کا عیب یا برائی ہونا عند الشرع مسلم ہو۔ آپ کے ہنروں
کو عیب بنایا گیا اور سنت و اصل شریعت سے فرطِ محبت کی وجہ سے بدعات سے جو تنفر تھا اس کو معصیت بنا کر آپ کی تکفیر
کی گئی۔ آج جب کہ آپ کو اس دنیا سے گذرے ہوئے پون صدی سے اوپر کا عرصہ ہو رہا ہے اگر پوری مخلوق جمع ہو کر بھی کوئی ایسا
واقعہ نکالنا چاہے جس میں آپ کی نماز کا قضا ہونا یا جماعت سے کاہلی و سستی یا کسی شرعی پسندیدہ امر سے ذرا برابر بے رغبتی یا
غفلت ثابت ہوتی ہو تو نہیں نکال سکتی۔

بائیس[۲۲] برس کے بعد تکبیرِ اولیٰ فوت

دیوبند کا جلسہ دستار بندی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس میں ایک دن غالباً عصر کی نماز
میں ایسا اتفاق پیش آیا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نماز پڑھانے کو مصلے پر کھڑے
ہوئے تو تکبیر اولیٰ کہی جا چکی اور امام نماز شروع کرا چکا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا گیا کہ جو وجود بڑے بڑے حوادث اور
اعزاء کی اموات، تنگ دستی و غربت میں کبھی پریشان نہیں ہوا تھا، اُس کا چہرہ اداس اور پریشانی کا مظہر تھا اور آپ رنج
کے ساتھ یہ الفاظ فرما رہے تھے "افسوس بائیس برس کے بعد آج تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی"۔
ہوا میں اُڑنا، سمندر میں اپنے پاؤں پر چلنا یا اسی طرح کی دوسری خوارق عادت باتیں کم درجہ کی کرامات ہیں اصل کرامت

یہ استقامت و دوام ہے جو شاید کروڑوں میں سے ایک کو حاصل ہوتا ہے۔

شب بیداری و تہجد گزاری

"تذکرۃ الرشید" میں حضرت مفتی عزیزالرحمٰنؒ کی زبانی حضرت گنگوہی کے انضباط اوقات درج ہوئے ہیں۔ ساری عمر تقریباً اس پر عمل کیا کبھی اس میں تبدیلی یا تغیر نہیں ہوا۔ مولانا منیر نانوتویؒ ایک سفر حج میں ساتھ تھے۔ ایک روز آدھی رات کے بعد ان سے کہا کہ ایک دو ڈول سمندر سے پانی کے نکال دو، غسل کروں گا۔ نانوتوی صاحب نے کہا کہ ابھی تو بہت رات باقی ہے۔ صبح ہونے دیجئے اگر ایک رات تہجد قضا بھی ہوگئی، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر حضرت کو یہ منظور نہ ہوا اور اسی وقت غسل فرما کر نماز تہجد ادا فرمائی اور حسبِ معمول فجر تک تلاوتِ قرآن اور وظائف میں مشغول رہے۔

او مردود تو اللہ ہے

ایک فقیر صوفی آپ سے بہت پیار محبت رکھتا تھا۔ آپ بھی اس کو فقیر درویش سمجھ کر ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس فقیر نے آپ سے کہا کہ جانتے ہو کہ یہ جو ذکر "اللہ ہُو" کرتا ہوں کیا کہتا ہوں؟ یہ کہتا ہوں "اللہ ہُوں"۔ یہ سُن کر آپ نے فوراً طیش میں آکر فرمایا کہ "او مردود تو اللہ ہے"۔ سابقہ دوستی یا مروت کا ذرہ بھر لحاظ نہیں کیا۔ اس کے بعد پھر اس فقیر کی کبھی صورت نہ دیکھی۔

گنگوہ بھی دیکھتا چلوں

داروغہ اسد علی صاحب انسپکٹر پولیس پشاور کو شیخ کی تلاش تھی۔ انہوں نے رخصت لے کر ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ بیسیوں درویش حضرات سے ملے۔ افغانستان تک گئے مگر کسی جگہ کسی کو سنت کے اتباع میں کامل نہ دیکھا۔ رخصت ختم ہونے کو تھی۔ واپسی میں مظفر نگر ریل میں گنگوہ اور حضرت گنگوہی کا تذکرہ سُن کر گنگوہ چلے گئے کہ شاید یہیں مقصد حاصل ہو۔ دیکھوں کیا انداز ہے۔ گنگوہ پہنچے ایک ہی دن میں اُن کا غنچۂ دِل کھِلا، اور یاس اُمید سے بدل گئی۔ آپ کو داروغہ صاحب نے دیکھا کہ ہر ہر بات میں سنت کا کمال اتباع کرتے ہیں۔ چنانچہ بیعت لی درخواست کی جو منظور ہوئی۔

جانب اَولیٰ کو بھی ترک نہ فرماتے

مولانا علی رضا صاحب حضرت گنگوہیؒ کے پاس برسوں رہے اور حضرت کی شاگردی کی اس کے بعد وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے اور کڑی نگاہوں سے حضرت گنگوہی کے ایک ایک فعل کو دیکھتے کہ شیخ کی تلاش تھی اور شیخ کامل کو دیکھنا چاہتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ برسوں میں ایک دفعہ بھی حضرت کا کوئی فعل خلافِ سنت نہیں پایا بلکہ حضرت حتی المقدور مستحبات اور جانب اَولیٰ (بہتر) کو بھی ترک نہ فرماتے تھے لیکن مباح سے آگے قطعاً نہ بڑھتے تھے۔ مباح کاموں کو ــــ یعنی جائز کاموں کو ــــ کر کے آپ کو رُوحانی خوشی نہ ہوتی تھی مگر سنن و مستحبات اور واجبات و فرائض پر عمل کر کے آپ کی طبیعت میں ایسا انشراح اور مزاج میں ایسی لطافت و بشاشت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر دیکھنے والا محسوس کر لیتا تھا۔

بدعات کو دیکھ کر آنسو بھر لاتے

دنیا میں ہدایت کا پھیلنا آپ کو اس درجہ محبوب و مرغوب تھا کہ اس سے زیادہ آپ کو کسی چیز میں لذت نہ آتی تھی اور مخلوق کی گمراہی و جہالت سے اُسی قدر آپ کو صدمہ اور رنج ہوتا تھا۔ حق کی اشاعت اور باطل کی تردید میں جی توڑ کر کوشش فرماتے تھے۔ اگرچہ آپ مناظرہ و مباحثہ سے طبعاً

متنفر تھے لیکن بدعات و معصیت کو پھیلانے والی تحریر دیکھ کر آپ سخت کو ضبط نہ کر سکتے تھے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو اتر آتے بلکہ غصہ اور رنج کے باعث خون اُتر آتا اور آپ کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے۔ چنانچہ آپ سنت کا دامن تھام کر نہایت ضبط سے کام لے کر اس کی تردید میں جواب لکھتے۔ پھر اس کا طبع ہونا اور چھپنا آپ کو پسند آتا۔ جو آدمی اس کی ذمہ داری اُٹھاتا اس سے بہت خوش ہوتے اور دعا کرتے۔

مجھے تحقیق نہیں

اگر آپ کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا یا اس کے بارے میں آپ کی تحقیق مکمل نہ ہوتی تو "لا ادری" "میں نہیں جانتا" کہنے میں آپ کو کوئی جھجک یا گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ بلا تأمل یا بلا تکلف فرما دیتے کہ میں اس مسئلہ کو نہیں جانتا یا مجھے یہ مسئلہ نہیں آتا۔ اس بات کا ذرہ بھر خیال نہیں کرتے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک پرچہ ایک شخص کے پاس دیکھا جس پر چند سوالات اور حضرت کی طرف سے اُن کے جوابات تھے۔ اسی پرچہ میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "بچوں کو نزع کی تکلیف زیادہ کیوں ہوتی ہے؟" اس کا جواب حضرت نے صرف یہ لکھا تھا۔ کہ "مجھے تحقیق نہیں"۔

حوادثات اور صدمات پر صبر

دنیاوی حوادث و صدمات میں آپ صبر کرنے میں کوہ استقلال تھے۔ ایک دفعہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے پانچ عزیز۔ آپ کا نواسہؒ، بیٹاؒ، اہلیہؒ، مرحوم بیٹے کی بیوی کی شیر خوار بچہ چھوڑ کر۔ اور نواسیؒ یکے بعد دیگر فوت ہوگئے لیکن حضرتؒ نے ایسا کمال صبر کا مظاہرہ کیا کہ لوگ انگشت بدندان تھے۔ ان کا کبھی تذکرہ نہ کرتے۔ زندگی میں بعض واقعات ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جانے والوں کا ذکر فرمایا ہے ایک مرتبہ مولانا یحییٰ کاندھلوی۔ (آپ اُن پر غایت درجہ مشفق و مہربان تھے) ۔۔ سے ایک موقعہ کی مناسبت سے فرمایا۔ "مولوی یحییٰ تمہاری عقل کو ہیضہ تو نہیں ہوگیا" اُن کے جانے کے بعد مولانا دوسرے ساتھی سے فرمانے لگے کہ میں نے مولوی یحییٰ کو ویسے ہی کہہ دیا ورنہ ہمارے گروہ میں سبھی اُن کو عقل مند مانتے ہیں۔ انہوں نے اتنا تا جواب دیا تو فرمایا ۔۔۔ مزاج دانی تو مسعود احمد کی ماں ہی کو تھی ۔۔۔ اس سے قارئین یہ خیال نہ فرمائیں کہ شاید حضرت گنگوہیؒ کو ان حوادث کا صدمہ ہی نہیں ہوا۔ صدمہ تو ہر انسان کو ہوتا ہے مگر حضرت اظہار نہیں فرماتے تھے۔ بس اتنا ہی اظہار ہوتا جتنا سنت سے ثابت ہے ۔۔۔ ورنہ صدمہ تو بہت ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ۔۔۔ محمود احمد (بیٹے کی وفات) نے میری کمر توڑ دی ۔۔۔ آپ کے ایک خادم مولوی رحمت اللہ پانی پتی اپنے خطوں میں ہمیشہ محمود احمد کو سلام لکھتے۔ آخر دو سال کے بعد امام ربانی نے ان کے کسی خط کے جواب میں یوں تحریر فرمایا۔ "آپ خط میں حافظ مسعود احمد کو سلام لکھا کریں۔ حافظ محمود احمد مرحوم دو سال ہوئے کہ اس عالم سے رحلت فرما کر مجھ ناکارہ کو پریشان و حیران کر گئے ہیں۔ جب تم اس کو سلام لکھتے ہو مجھ کو بے قراری ہو جاتی ہے۔ آئندہ ان کا نام مت لکھنا"۔

جوابات میں جلدی

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کچھ سوالات ایک آدمی کے ہاتھ لکھ کر بھیجے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ جوابات جلدی عنایت فرمایئے۔ سوالات بہت سے اور خاصے دقیق تھے اور آپ کو آشوب چشم کی تکلیف تھی۔ مگر آپ نے دین کے بارے میں سوالات کے جواب میں تاخیر مناسب خیال نہ کی اور جوابات تحریر

جو داڑھی منڈاتے ہیں۔ مولوی محمد سہول ایک بار کسی مسئلہ پر بحث کرنے لگے اور اعتراض پر اعتراض کرتے رہے۔ فرمایا۔ تمہارا نام سہول کس نے رکھا۔ تم میں سہولت تو ذرہ بھر نہیں۔ تمہارا نام مسئول چاہیئے کہ سوال بہت کرتے ہو۔

اشعار سے دلچسپی نہ تھی

آپ کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہ تھی۔ تاہم کسی خاص موقعہ پر بے ساختہ بچپن کا نظر سے گذرا ہوا شعر زبان پر آجاتا تھا۔ ایسے اشعار کی تعداد پوری عمر میں بیس ۲۰ پچیس ۲۵ سے زائد نہ ہوگی۔ مرض الموت سے چند سال قبل آپ سخت مرض میں گرفتار ہوئے۔ اس شبہ پر کہ کہیں کسی نے سحر نہ کر دیا ہو۔ حضرت مولانا خلیل احمد نے ایک شخص کو دیوبند سے روانہ کیا جو اس فن میں کمال رکھتا تھا۔ جب وہ گنگوہ پہنچا تو حضرت کو من جانب اللہ معلوم ہوا کہ یہ آنے والا سحر کرنے والے کا مرید اور شاگرد ہے۔ اس کو واپس کر دیا۔ جب حضرت مولینا خلیل احمد حاضر ہوئے، تو معانقہ کرتے وقت آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

میر کیا سادہ ہیں۔ بیمار ہوئے جس کے سبب — اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ظہر کے بعد جب خلوت خانہ میں تشریف لے جاتے، حجرے کے کواڑ بند ہو جاتے تو آپ پر بعض دفعہ ایسا کیف غالب ہوتا کہ دیر تک وہیں رہتے کسی کا آنا اچھا معلوم نہ ہوتا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب آکر کواڑ کھولتے اور یا حضرت خود ہی کھول دیتے اور مولانا یحییٰ حضرت کے کچھ اس طرح مزاج شناس ہوگئے تھے کہ از خود ان کی طبیعت میں وہی بات آتی جو حضرت کی منشا ہوتی۔ اس بنا پر حضرت اکثر فرمایا کرتے کہ "مولوی یحییٰ تو میری آنکھیں ہیں" یا "یحییٰ تو میری لاٹھی ہیں"۔ بارہ ۱۲ سال اسی شفقت تلے مولانا یحییٰ نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محبِ صادق کی خدمت کی۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حضرت کو تا دیر خلوت میں رہنا پسند آیا تو مولانا یحییٰ بھی اپنی جگہ سے نہ آئے۔ ایک بار ایسا ہی اتفاق پیش آیا۔ مولانا یحییٰ نے دیر کے بعد آکر کواڑ کھولا تو دیکھا کہ حضرت بیٹھے تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا اب تک کہاں تھے؟ انہوں نے کہا حضرت جی نہ چاہا کہ ابھی حجرہ کھولوں۔ فرمایا پھر اب کیوں آئے۔ عرض کیا کہ اب دفعتہً جی چاہا کہ کواڑ کھولوں۔ آپ مسکرائے اور یہ شعر پڑھا۔

وہ نہ آئیں تو تو ہی چل رنگیں — اس میں کیا تری شان جاتی ہے

ایک مرتبہ حضرت خمیری روٹی تورمہ سے کھا کر آئے۔ جیسا کہ گذرا یہ حضرت کی پسندیدہ غذا تھی۔ چہرہ پر بشاست تھی اور قلب میں انبساط۔ مولانا یحییٰ سے پوچھا کہ میاں تمہیں بھی کچھ بھاوے ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت کچھ نہیں۔ ایک ارہر کی دال تو بھاتی نہیں۔ باقی جو کچھ مل گیا سب پسند ہے۔ آپ مسکرائے اور فوراً یہ شعر پڑھا ؎

کیا کہوں جرأت کہ کچھ بھاتا نہیں — کچھ تو بھایا ہے کہ کچھ بھاتا نہیں

ایک بار آپ نے فرمایا بھئی ہمیں تو حضرت کے درد نالہ میں ایک شعر بہت بھایا ؎

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا — تماشہ کو بھی تو میرے نہ آیا

نماز سے شغف، خدا کے وعدوں پر یقین

عام طور پر بیمار ہونے پر رغبت علاج کی طرف نہ تھی۔ احباب و خدام ہی اس کا خیال فرماتے تھے۔ بینائی جانے پر متوسلین نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بنوالی جائے مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ کبھی تو یہ فرمایا کہ "آدمی اپنے توی کو دیکھے۔ آنکھ ہی درست ہو

کیا کرے گی۔ دیکھو قاری عبدالرحمان نے آنکھ بنوائی، چھ ماہ کے بعد انتقال ہوگیا۔" کبھی فرماتے "آنکھ بنوانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ نماز پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اتنی تکلیف کون اٹھائے۔" کبھی یہ فرمایا کہ "بھئی میں نہیں بنواتا۔ سنتا ہوں کہ آنکھ بننے پر طبیب چند روز حرکت کرنے کی ممانعت کردیتا ہے اور مجھ سے بڑھاپے میں نماز نہیں چھوڑی جاتی۔" لیکن جب سبحان علی خاں سول سرجن نے جو اس فن میں مشہور ڈاکٹر اور ماہر و سند یافتہ طبیب تھے خود حاضر ہوکر واثق وعدہ کیا کہ حضرت کوئی نماز قضا نہ ہوگی۔ چند گھنٹے حرکت سے پرہیز ہوگا جو فجر اور ظہر کے درمیان ممکن ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوسکتی اور آنکھوں بغیر میرا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔" مولوی عبیداللہ نے ازحد اصرار کیا تو آخر میں اصل بات فرمادی کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ جس کی آنکھ لے لے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کا بدلہ جنت ہے سو شاید یہی ایک ذریعہ حصول جنت ہو۔ مجھے تو اندھا رہنا ہی پسند ہے اور ایک مرتبہ خاص لوگوں سے یوں بھی فرمایا کہ میاں پہلے تو آنکھیں بند کرنی پڑتی تھیں۔ الحمدللہ اب خود بند ہوگئیں پھر ان کے کھلوانے کی تمنا کیسی؟

عوام کے لئے سہولت اور برگزار اپنی ذات کے لئے تو حضرت ہر حال میں احتیاط اور اولویت کو اختیار فرماتے تھے۔ مگر عوام کے لئے جہاں تک ہو سکتا سہولت مدنظر رکھتے۔ البتہ بدعات و معصیات میں آپ کو تشدد پسند تھا اور سدّاً للباب مبادی و مقدمات پر بھی عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔ مثلاً محرم کو شہادت حسین رضؓ کا سچا واقعہ بیان کرنے کو منع فرماتے تھے کہ اس میں روافض سے تشبہ ہے۔ دوسرے موقع پر بیان کرو کیوں وہ ان دنوں اس واقعہ کے سہارے صحابہ پر سب وشتم بھی کرتے ہیں۔ لیکن عام مسائل میں جہاں تک سہولت نکلتی اس کو اختیار فرماتے اور عموم بلوی کا بہت خیال فرماتے۔ ایک دفعہ تمباکو نوشی کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مکروہ ہے کیونکہ منہ سے بدبو آتی ہے اور حقہ پر کیا منحصر ہے بدبو کی اور چیزیں مثلاً لہسن، پیاز، مولی وغیرہ سب کچھ کھانا مکروہ ہیں۔" ایک صاحب نے عرض کیا کہ بعض مولویوں نے تو حرام کہا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ "سب غلط ہے۔ تمباکو مثل اور ماکولات کے مباح ہے۔" اس پر کسی خادم نے عرض کیا کہ رمضان شریف میں حقہ پی دم لگا کر بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمباکو نشہ آور ہے۔ آپ نے فرمایا خالی معدہ میں کالی مرچ سنگھادی جائے تو وہ بے ہوش کردیتی ہے۔ میاں تمباکو نشہ نہیں کرتا بلکہ اس کی تیزی خلاءِ معدہ کے وقت البتہ بے ہوش کردیتی ہے۔

نظر کی تیزی ایک دفعہ حکیم ضیاء الدین کے ہاں رام پور تشریف لے گئے۔ ایک شخص صبح کو قارورہ لے کر آیا۔ اور حکیم صاحب کے سامنے پیش کیا۔ حضرت فاصلہ پر بیٹھے تھے۔ آپ نے دور ہی سے قارورہ پر نظر ڈالی اور جب وہ شخص قارورہ پھینکنے گیا تو آپ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ "اس مریض کا علاج سنبھل کر کرنا۔" حکیم صاحب نے پوچھا حضرت کیوں؟ آپ نے فرمایا کہ "اس کا حال ابتر ہے۔" جب وہ شخص واپس آیا تو اس نے مریض کی ہچکی وغیرہ کی وہ کیفیت بیان کی، جو عالم نزع میں ہوتی ہے چنانچہ حکیم صاحب نے اسے ٹال دیا۔

ذکر پر ترغیب و ترہیب کوئی شخص کیسا ہی قلب بگاڑ کر آپ کے پاس آتا، آپ اس کی اصلاح میں دریغ نہ کرتے بشرطیکہ اصلاح کی سچی طلب لے کر آیا ہو۔ خدام کی عیب پوشی میں آپ کو خاص ملکہ تھا۔ خود بلند ہمت تھے۔ خدام و متوسلین کو عالی حوصلہ بناتے، پست ہمتوں کو ابھارتے اور اکثر فرماتے کہ جو کچھ حق تعالیٰ توفیق دے، کئے

جاؤ۔ ہمت نہ ہارو۔ اگر قلب میں اثر نہ ہو نہ سہی۔ آخر زبان سے ذکر ہونا تھوڑا نفع ہے۔ جب زبان اللہ کے ذکر کے سبب دوزخ سے بچے گی تو دل بھی تو ساتھ ہی بچے گا۔ مریدین میں یاس و ناامیدی نہ پیدا ہونے دیتے۔ مگر ایک حالت پر قائم و قانع رہنا گوارا نہ تھا۔ تحریر، تقریر، ہر انداز سے غرض جس طرح بن پڑتا ہر پہلو سے خدام کو توجہ الی اللہ کی ترغیب دلاتے اور یوں فرماتے کہ جتنا بھی ہو سکے کرو اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اسی سے ترقی ہوگی۔

وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۔ (قرآن حکیم)

اور اگر تم شکر ادا کرو گے تو البتہ میں (نعمت) زیادہ کروں گا اور اگر کفران (نعمت) کرو گے تو بیشک میرا عذاب شدید ہے۔

اگرچہ گذشتہ سارا مضمون "تذکرۃ الرشید" سے ماخوذ ہے۔ اکثر جگہ اس کی عبارتیں خلاصہ کر کے پیش کر دی ہیں اور کسی جگہ جوں کے توں فقرے لے لئے ہیں، تاہم یہاں ایک طویل اقتباس "تذکرۃ الرشید" سے من و عن نقل کیا جاتا ہے [1]

"آپ ذکر اللہ کی تحریص و ترغیب میں یکتائے زمانہ تھے۔ عالم ہو یا جاہل، خاص ہو یا عامی، شریف ہو یا وضیع، امیر ہو یا غریب، جو کوئی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا فوراً ابدی اور رغبت الی الآخرت کا حسب مقدور کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے کر جاتا تھا۔ اس وقت [2] خدا کی مخلوق کی گنتی ہزار راست گفتار زبانیں اس مضمون پر متفق ہیں کہ آپ کی صورت دیکھ کر خدا یاد آتا اور آپ کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا سے نفرت پیدا ہوتی تھی۔ اتباع اور تمسک بالسنۃ کی تعلیم کے لئے صرف آپ کی زبان نہ تھی، بلکہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک جو افعال آپ سے صادر ہوتے وہ سب یہ سبق پڑھاتے اور یاد کرایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کا نام انسان کا بڑا رفیق ہے اور اطاعت پیغمبر کا اتباع مسلمان کا اصل مقصود اور رضائے مخلوق کا مضبوط وسیلہ۔

حق تعالیٰ نے آپ کو جس مشغلہ میں لگایا تھا، اس کے اندر آپ کو اس درجہ پختگی عطا کی گئی تھی کہ کبھی فرق نہیں آیا۔ آفتاب عالمتاب صبح کو طلوع ہوتا اور شام کو افق مغرب میں غروب ہو جاتا تھا، ماہتاب کبھی ہلال بن کر نکلتا اور کبھی بدر بنتا، کبھی دکھائی دیتا اور کبھی عالم کی نظروں سے چھپ جاتا تھا، کبھی روز روشن ہوتا تھا اور کبھی شب تاریک، کسی وقت سردی جلوہ گر ہوتی اور کسی وقت گرمی، غرض عالم حادث ہر روز مختلف ہوتا اور دنیا اپنے انقلاب عظیم کو ہر لمحہ پلٹتی اور بدلتی رہتی تھی مگر حضرت امام ربانیؒ قدس سرہ کا ایک دم تھا کہ مضمون واحد یعنی خدائے یکتا وحدہ لاشریک معبود کی عبادت میں یکساں مصروف تھا۔ آپ اپنے نفس نفیس کی حیثیت سے اس خاصیت میں فرد تھے کہ متغیر عالم کے تغیرات کا اثر آپ کے مستحسن مشغلہ پر نہ

---

[1] میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ "تذکرۃ الرشید بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔ میں نے سالک صاحب (عبدالمجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے احباب کو یہ کتاب پڑھائی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی عظمت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے آدمی تھے" مخفی۔

[2] تذکرۃ الرشید حضرت امام ربانیؒ کی وفات کے دو سال بعد لکھا گیا تھا۔

پڑا۔ آپ کے حالات زمانہ کے ماتحت بن کر بیشک مختلف تھے مگر سنّت کے اتباع کا امر مشترک سب کو شامل اور ہر حالت میں موجود تھا۔ آپ کا دل اندر سے یوں چاہتا تھا کہ دنیا میں ایک متنفس بھی ایسا نہ ہو جس سے حق تعالیٰ کی معصیت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ظاہر ہو۔ آپ شفقت کے درجہ میں اپنے نفس ہی کے خیر طلب نہ تھے بلکہ تمام عالم کے ساتھ آپ کو یہ ہمدردی تھی کہ کاش دوزخ میں جانے والا ایک بشر بھی نہ رہے۔ آپ اس درجہ رقیق القلب تھے کہ کسی کی حالتِ تکلیف یا تنگی و بدحالی سُنتے تو بے چین ہو جاتے تھے۔ واقف ہو یا ناواقف، یگانہ ہو یا بیگانہ، کسی شخص کی بدحالی و عسرت آپ کو گوارا نہ تھی۔ جس طرح دنیا کی عسرت و بدحالی آپ کو صدمہ پہنچاتی، اس سے زیادہ آخرت کے افلاس پر آپ تنگ دل و بے چین ہوتے تھے۔ کسی شخص کی معصیت اور بددینی سُن کر آپ کو جس درجہ حزن ہوتا اور اس کے لئے آپ کا دل رویا اور دعا کیا کرتا تھا شاید اپنے فقر و افلاس پر بھی کسی کو رنج نہ ہوتا ہوگا۔ دشمن سے دشمن کے لئے بھی آپ نے کبھی بد دعا نہیں کی[1]۔"

مولوی احمد رضا خاں کے متعلق

مولوی احمد رضا خان بریلوی آپ کے سب سے بڑے مخالف تھے اور اگر اُن کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے جو حضرت امام ربانیؒ کے متعلق لکھے ہیں تو ایک رسالہ بن سکتا ہے اور ان کی تمام کوششوں کو شمار کیا جائے جو انھوں نے حضرت امام ربانیؒ کی تکفیر کے متعلق روا رکھیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے کہ کاش وہ اس مشغلے کی بجائے بطحائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنے پر صرف کرتے — ان صاحب سے حضرت گنگوہیؒ کو اتنی ایذائیں پہنچیں کہ شاید انہوں نے کسی دوسرے کو نہ پہنچائی ہوں۔ مگر جو ہستی خلقِ پیغمبرؐ کا نمونہ بن کر آئی ہو اور دنیا کو اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کی ترغیب و مشق پر جس نے ساری عمر اپنے آپ کو لگا رکھا ہو اُس کی زبان سے بھلا کیوں اپنے مخالف کے لئے کوئی بُرا لفظ نکلتا۔ اس بارے میں حلف اٹھایا جا سکتا ہے کہ حضرت سے تاعمر کوئی ایسا لفظ نہیں سُنا گیا کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ آپ ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ جس زمانہ میں مولوی احمد رضا صاحب کو مرض جذام ہوا اور خون میں فساد پیدا ہوا۔ بعض لوگوں کو مسرت ہوئی کہ سب و شتم کا ثمرہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ مگر جس وقت کسی شخص نے حضرت سے عرض کیا کہ "بریلی مولوی کوڑھی ہو گئے" تو حضرت گھبرا اُٹھے اور یہ الفاظ فرمائے کہ "میاں کسی کی مصیبت پر خوش نہ ہونا چاہیئے خدا جانے اپنی تقدیر میں کیا لکھا ہے" — ایک دن ڈاک میں خط آیا جس میں اطلاع تھی کہ آپ کے ایک بڑے مخالف مولوی ہدایت رسول کو ایک منکوحہ عورت سے نکاح کرنے کے جرم میں عدالت سے سزائے قید کا حکم سُنایا گیا۔ بعض سامعین کو مسرت ہوئی مگر آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

زیادہ سے زیادہ رنج

زیادہ سے زیادہ رنج کا اثر جو کسی بدگو مبتدع کی طرف سے آپ کو پیش آتا یہ ہوتا تھا کہ آپ اس کے لئے دعا کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ مگر یہ بھی اس لئے کہ یہ ایذا رسانی حضرت سے تجاوز کر کے آپ کے مخلصین تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک بار کسی شخص نے آپ کو دعا کے لئے لکھا۔ آپ نے فرمایا — کہ یہ وہی تو

[1] تذکرۃ الرشید جلد ۲ صہ ۸۲

و ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آپ کے اس طبعی انداز اور رنگ نسبت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ متوسلین کی تعداد بہت ہی کم ہوتی اور پھر منتفع اور فائز المرام تو بہت ہی قلیل نکلتے۔ مگر یہ حق کا فضل اور آپ کی کرامت ظاہرہ تھی کہ متوسلین کا شمار ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچ گیا آپ کے خلفاء در خلفاء کے متوسلین جو در اصل آپ ہی کے متوسلین ہیں، کا شمار کیا جائے تو ان کا شمار برصغیر پاک و ہند میں ایک کروڑ سے بھی زائد ہوگا۔

آپ عموماً متوسلین کو فجر و مغرب کی نماز کے بعد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر سو سو بار اور ایک تسبیح استغفار کی جس وقت فرصت ہو، اور اگر سونے کے وقت ہو تو بہتر ہے، کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ استغفار کوئی مخصوص نہ تھا۔ جو الفاظ بھی ہوں پڑھے جائیں۔ بعض کو آپ نے یہ بھی کہا کہ سوتے وقت کم از کم دس مرتبہ پڑھا کرو۔ اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ "یا اللہ میری توبہ ہے" اس طرح کہنا بھی کافی ہے۔ غرض جس طرح اور جن الفاظ سے توبہ استغفار کرے بہتر ہے۔ تاہم سید الاستغفار کے ساتھ آپ کو زیادہ اُنس تھا کہ وہ حدیث میں منقول ہے۔ استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ۔

نیز عموماً متوسلین کو درود شریف پڑھنے کی تلقین فرماتے کہ کم از کم تین سو مرتبہ روزانہ پڑھا جائے اور اتنا نہ ہو سکے تو ایک تسبیح میں تو کمی نہ ہونا چاہیئے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا احسان ہے۔ پھر آپ پر درود بھیجنے میں بخل ہو تو پھر بڑی بے مروتی اور خسران کی بات ہے۔ درود شریف آپ کو ابراہیمی زیادہ پسند تھا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ الفاظ صلوٰۃ وسلام جو احادیث میں منقول ہیں۔ دوسروں کے مولفہ درود تاج و لکھی وغیرہ کو آپ عموماً پسند نہ کرتے تھے بلکہ الفاظ کو دوسرے معنی کا موہم ہونے کی وجہ سے خلاف شرع فرمادیتے تھے۔ یہ اوراد و وظائف آپ نے قریب قریب تمام متوسلین کو تعلیم فرمائے اور چونکہ متوسلین کی فراغت و مشغولیت کے حالات مختلف تھے۔ اس لئے مقدار کی بیشی و کمی اُن کے حسب حال فرما دیا کرتے تھے۔ البتہ دو امر پر آپ توجہ زیادہ دیتے تھے۔ ایک یہ کہ گو تھوڑا کام کیا جائے مگر نباہ کر بالالتزام کیا جائے۔ دوم یہ کہ جو وقت کسی ورد کا تجویز کیا جائے، اس کی پابندی کی جائے اور یہ وقت کا تعین عموماً متوسل پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔

اوقات مختلفہ میں آپ ادعیہ مسنونہ کے بے حد پابند تھے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں اور کلمات مختلف اوقات اور کاموں کیوقت منقول ہیں اُن کو آپ خود بھی نہایت پابندی سے کرتے اور اپنے متوسلین کا بھی ان کو پابندی سے کرنا پسند تھا۔

اذکار و اشغال میں آپ کسی خاص طریقے کے پابند نہ تھے۔ طالب کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر اس کی تربیت فرماتے اور جو صورت اس کے لئے انفع و انسب معلوم ہوتی وہ عمل میں لایا کرتے تھے۔ کسی کو چشتیہ خاندان کی اور کسی کو نقشبندیہ کی اور کبھی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کو اس کی طلب پر حضرت مولانا عبدالعزیز مغفلوی ثم سرگودھوی جانشین حضرت اقدس رائے پوریؒ کی خدمت میں لے کر گیا اور عرض کیا کہ یہ توبہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے سختی سے پوچھا کہ کہیں تم تو بہکا کر نہیں لائے۔ (ارشد)

صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت سرتاپا اعضاء وجوارح کے حرکات وسکنات ہوں اور وقتِ ولادت سے لحد کی آغوش میں پہنچنے تک جو زمانۂ حیات کہلاتا ہے نقشہ مجسم تصویر بن جائے۔ اس عالیشان شاہی محل ومکان کا جس کی تعمیر فخرِ عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس ۲۳ سالہ زمانۂ نبوت میں فرمائی ہے نہ اپنے ارادہ سے سکون ہو نہ اپنے قصد سے حرکت۔ اگر سوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی تعمیل میں سوئے، اگر جاگے تو امتثال ارشادِ پیغمبر میں جاگے۔ اسی کا نام محبت ہے اور اسی کا نام عشق اور یہی سلوک کہلاتا ہے اور یہی طریقت ہے

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
پا بدستے دگرے، دست بدستے دگرے

اگر مسلمان کو دعویٰ ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رکھتا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو معبود مانتا ہے تو پھر اس کو زندگی کی ہر ہر حرکت وسکون سے اس دعوے کی دلیل لانا چاہیئے۔

زندگانی نتواں گفت حیاتے کہ مرا
زندہ آنست کہ با دوست وصالے دارد

تزکیہ و تصرّفات

انسانی فطرت ہے کہ وہ ہم نشیں سے متاثر ہوتی یا ہم نشیں کو متاثر کرتی ہے اور دنیا میں بعض لوگ مشقیں اور مجاہدے کر کے لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں اور اس کا انکار مشکل ہے۔ مسمریزم وغیرہ قسم کی چیزیں اسی قبیل سے ہیں اور جب کوئی مسلمان تخلقوا باخلاق اللہ کے امر کے تحت اپنے باطن کو صاف وپاکیزہ بناتا ہے تو اس کی روحانی قوت اس قدر مؤثر ہو جاتی ہے کہ دوسرے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ علامہ اقبال رحؒ نے اسی چیز کو بیان کیا ہے ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

مسمریزم وغیرہ کرنے والے تو وقتی طور پر افراد کو متاثر کرتے ہیں مگر صاف باطن لوگوں کی نگاہ جب اٹھتی ہے تو اس سے زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اکابر صوفیائے کرام مثلاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور مخدوم علی احمد ہجویریؒ جیسے بزرگوں نے اپنی اسی باطنی قوت اور اخلاص کی وجہ سے لاکھوں لوگوں کی کایا پلٹ دی کہ ع

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس چودھویں صدی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی ایسے ہی پاک وصاف باطن لوگوں میں سے تھے کہ جن کی نظر کیمیا اثر تھی۔ آپ کی صحبت کی تاثیر تھی کہ تاریک وزنگ آلود قلوب لئے جب لوگ آپ کی مجلس میں پہنچتے تھے تو امامِ ربانیؒ کے منور قلب کی شعاعیں ان کو صیقل کر دیتی تھیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ایک فریضہ یَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِہٖ کے بعد "یُزَکِّیْھِمْ" بھی ہے۔ امام ربانی کو چونکہ حق تعالیٰ نے اس پر آشوب زمانہ میں تعلیم احکاماتِ شرعیہ اور تزکیۂ وتطہیرِ قلوب کے لئے نائب رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اس لئے آپ کی قوتِ قدسیہ کا کیا پوچھنا کہ کس حد پر تھی۔ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرہ سو برس بعد پیدا ہونے والی امت جس کو زمانہ کی رسومات نے جکڑ کر فرائض کی جگہ اپنا پابند اور غلام بنا لیا ہو، وہ جس درجہ بھی ادراک سے بے بہرہ ہو ظاہر ہے۔ خصوصاً جبکہ خواہشاتِ نفس

نے بدعات کو عبادات بنا کر دلوں میں پلا دیا اور دنیادار مولویوں نے مقدس اہل اللہ کے مجمع کو وہابی کے خطاب سے مشہور کر کے ان کی صورت دیکھنے سے مخلوق کو بیزار اور ان کے پاس بیٹھنے سے متنفر کر دیا ہو، ایسی حالت میں ان کے نفرت کھاتے دلوں کا کھینچ لینا اور ان سے بدعات چھڑا کر سنتوں کا والہ وشیدا بنا دینا بڑے قوی القلب شیخ کا کام ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ آپ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس کی کثرت کیوں نہ ہو، جونہی آپ کی صحبت میں بیٹھے اور قلب میں ایک خاص قسم کا سکینہ اور جمعیت حاصل ہوئی جس سے سب کدورات رفع ہو گئیں۔ اور قریب قریب آپ کے کل مریدوں میں عقائد کی درستی، دین کی پختگی خصوصاً حب فی اللہ و بغض فی اللہ بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ ساری برکت آپ کی صحبت کی ہے اور ان کمالات کی شہادت میں بے شمار واقعات موجود و مشہور ہیں ــــــ اس سے آگے خود حضرت تھانویؒ نے اپنے متعلق دو شہادتیں فراہم کی ہیں کہ کس طرح حضرت گنگوہیؒ نے ان کی (حضرت تھانویؒ کی) دو باتوں میں اصلاح کی۔ ایک علم ظاہر میں اور دوسری باطن میں ــــــ اور پھر ان کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے تذکرۃ الرشید میں مندرج وہ مراسلت مطالعہ کی جائے جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان ہوئی۔ اسی طرح دوسرے واقعات کے لئے بھی تذکرۃ الرشید کی طرف مراجعت کی جائے۔

معنوی کمالات

ظاہر پرستوں کے نزدیک کرامات کسی کے ولی ہونے کی علامات ہیں۔ حالانکہ سب سے بڑی کرامت اتباعِ سنت اور استقامت علی الدین ہے۔ کرامت تو مقصود ہی نہیں ہے، اصل مقصود تو اتباعِ سنت ہے۔ جو اس بارے میں جتنا زیادہ پختہ و مستقیم ہوگا وہ اتنا بڑا صاحب کمال اور مقرب الٰہی ہوگا۔ انسان افراط و تفریط کے درمیان احتیاطاً چلنے والا ہو تو وہ صاحبِ کمال کہلائے گا۔ حضرت گنگوہیؒ ایسے ہی معتدل المزاج، میانہ رو بزرگ تھے اور اس پر ان کی اس قدر استقامت و استقلال تھا کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

مجھے بھی یاد رکھنا حضرت تھانویؒ حج کے لئے تیار ہوئے اور خدمت میں حاضر ہو کر رخصت و اجازت چاہی۔ اس کے بعد عین روانگی کے دن بذریعہ تحریر پھر حضرت کو اطلاع دی کہ بندہ آج روانہ ہو رہا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے جو تحریر بھیجی اس میں درج تھا کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مجھے بھی یاد رکھنا۔ اس کے بعد یہ شعر مسطور تھا ؎

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی ۔۔۔ بیاد آر محبان بادہ پیما را

یہ اتباع ہے اس مضمون کا کہ جب سیدنا عمرؓ نے بارگاہِ رسالت سے عمرہ کی اجازت چاہی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ بھائی وہاں حاضر ہو تو دعا کے اندر ہمیں مت بھول جانا۔

یہی جزا ہے مولوی حکیم اسماعیل گنگوہیؒ نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ بے تکلف ہونے کی وجہ سے حضرت کے تنفر ظاہر کرنے کے باوجود باصرار سنایا۔ جب ختم کر چکے تو آپ جھکے اور زمین سے خاک اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرے کپڑے خراب ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔ منہ پر مدح کرنے والوں کی یہی جزا ہے۔ میں کیا کروں۔ جناب

سے الگ رہے۔ یہ جھگڑا نفسانیت کا ہے۔ ایسی باتوں کے پیچھے پڑنا دین کی بات نہیں۔ یہ مسئلہ علماء سے پوچھنے کا نہیں ہے۔ اگر زیادہ تحقیق منظور ہو تو قاریوں سے دریافت کرو۔

سلام پر اکتفا کرتا ہوں

بدعات سے اس درجہ احتراز تھا کہ آپ نے وہ امور مباحہ بھی ترک فرما دیئے تھے جن سے دیکھنے والوں کو بدعت کی جانب میلان کا واہمہ پیدا ہو یا صورۃً استناد و استدلال ہو سکے۔ ایک مرتبہ خود ہی ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اول بارہا حاضر ہوا اور بیٹھا ہوں۔ مگر مبتدعین کے باعث عرصہ سے اس کو ترک کر دیا۔ اب حاضری کے لئے بہت طبیعت بے قرار ہوتی ہے مگر اس خیال سے نہیں جاتا کہ پیرزادے کہیں گے اب پھر ادھر کو جھک آئے اور بدعات کی طرف مائل ہو گئے۔ اس اندیشہ کے سبب یہیں سے سلام پر اکتفا کرتا ہوں اور اُدھر چلنے کا قصد بھی نہیں کرتا۔

صرف ناک کاٹنی تھی

جن دنوں حضرت جناب مولانا کریم بخش صاحب پنجابی کی خدمت میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک پٹھان طالب علم دہلی آیا۔ جس کو دعویٰ تھا کہ مجھے یہاں کوئی عالم پڑھا نہیں سکتا۔ یہ شخص کافیہ پڑھتا تھا۔ مولانا کریم بخش صاحب کو طالب علم کا یہ دعویٰ پسند نہ آیا۔ سبق ہو رہا تھا۔ حضرت گنگوہی شریک جماعت تھے۔ سبق کے بعد استاد نے آپ سے کہا کہ یہ لو کافیہ ہے اس پٹھان کو سبق پڑھا آؤ۔ یاد رکھنا اگر نیچا دیکھ کر آئے تو سر گنجا کر دوں گا۔ مولینا گنگوہی کتاب بغل میں لے کر سیدھے اس طالب علم کے پاس پہنچے۔ باتوں باتوں میں کتاب کھولی اور بحث شروع کر دی۔ یہاں تک کہ پٹھان حیران رہ گیا اور آخر کار یہ لفظ کہے کہ ہمیں پوری کتاب دہرا دو۔ اس وقت حضرت نے کتاب بند فرما دی اور کہا پڑھانا منظور نہیں ہے صرف ناک کاٹنی تھی کہ دہلی میں جن علماء کے متعلق یہ خیال ہو کر پڑھا نہ سکیں گے۔ ان کے ادنیٰ شاگرد نے زچ کر دیا۔ یہ کہہ کر اپنے استاد کے پاس چلے آئے اور عرض کیا کہ حضرت پڑھا آیا اور مات دے آیا۔

بخدا میں اپنے آپ کو

آپ کی ذکاوت اور خداداد استعداد بجائے خود معنوی کمال تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ بایں علومرتبت آپ اپنے آپ کو ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کے برابر بھی نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ تدریس کے زمانہ میں جب کہ آپ کی حسن تقریر پر بعض طلبہ نے آپ کی کچھ تعریف کی تو بے ساختہ خلافِ عادت آپ کی زبان سے قسم نکلی اور آپ نے یوں ارشاد فرمایا کہ "بخدا میں اپنے آپ کو تم میں سے ادنیٰ طالبعلم کے برابر بھی نہیں سمجھتا"۔ یہ ہے وہ کمال جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

میں نے سعادت حاصل کی ہے

ایک دفعہ صحن مسجد میں طلبہ کو درس دے رہے تھے کہ بارش ہونے لگی۔ طلبہ کتابیں اور تپائیاں لے کر اندر بھاگے۔ حضرت مولانا نے اپنی چادر بچھائی اور تمام طالب علموں کے جوتے اٹھا کر اس میں ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ طلبہ نے جب یہ صورت دیکھی تو وہ پریشان ہوئے اور بعض رو دیئے کہ حضرت یہ کیا۔ فرمایا کہ "حدیث میں آتا ہے کہ طلب کے لئے چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں پانی میں دعا کرتی ہیں اور فرشتے ان کے پاؤں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خدمت کر کے میں نے سعادت حاصل کی ہے۔ آپ مجھے اس سعادت سے کیوں محروم کرتے ہیں"۔

اکرام امیر قوم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم کا سردار تمہارے پاس آئے تو اس کا اکرام کیا کرو۔ اس

کے امتثال امر میں حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں اگر مخالف جماعت کا کوئی بڑا شخص آتا تو آپ اس کے اکرام میں مطلق پہلو تہی نہ فرماتے تھے۔ مگر اس کے باوجود متنازع فیہ امر میں مداہنت یا نرمی ممکن نہ تھی کہ ذرہ برابر بھی ظاہر ہو۔ اور بات بھی یہی ہے کہ کسی کا اکرام جب امتثال امر پیغمبر میں کیا جاتا ہے تو اکرام پیغمبر سے چشم پوشی کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔ ایک بار مولوی عبد السمیع صاحب (حضرت کے کٹر مخالف اور غالی بدعتی) کسی تقریب میں گنگوہ آئے اور حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تو آپ نہایت خلق سے ملے اور فرمایا کہ آج کسی وقت کا کھانا میرے یہاں کھائیے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولوی صاحب "انوار ساطعہ" حضرت کے خلاف لکھ چکے تھے اور ادھر سے بتصدیق حضرت اس کا جواب شائع ہو چکا تھا۔ فتنہ کے دبانے اور بدعات کی رد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس امر کا مسلمان کو مامور بنایا ہے وہ آپ پورا فرما چکے تھے اور اب درجہ اکرام ضیف اور اکرام امیر قوم کا تھا۔ سو اس کو آپ نے پورا فرمایا۔ مولوی صاحب نے دعوت قبول کی اور حضرت کے مہمان بن کر کھانا کھایا۔ حضرت نے ایک مکتوب میں اس دعوت کا ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میرا خیال تھا کہ بدعات کا زبانی تذکرہ ہوگا۔ مگر مہمان نے اشارۃً بھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ سو میزبان کو کیا لازم تھا کہ یہ ذکر نکال کر مناظرہ کرے۔

جیسا کہ گذرا حضرت امام ربانیؒ سنت کے فروغ اور بدعت کی رد میں بہت کوشاں رہتے تھے۔ یہی وجہ کہ مبتدعین کی نگاہ میں آج تک حضرت مورد عتاب ہیں۔ لیکن حضرت کو اپنے زمانے میں ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت صحیحہ کے خلاف آپ کوئی بات نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ سن سکتے تھے اور آپ اس معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ بعض مباح چیزوں کو ترک کر دیا تھا کہ مریدین اور طالبین اسی سے آگے راہ کو وسیع کر لیتے اور بدعات کا باب کھول لیتے ہیں۔ اکثر بدعات کا رواج اسی طرح ہوا ہے۔ آپ کے نزدیک اصل اتباع و اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی تھی۔ اس کے بعد اگر دنیا میں کسی کا ادب، فرمانبرداری یا اطاعت ہے تو وہ اسی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ مثلاً بڑے بھائی، والدین، استاد، شیخ سب اپنے بڑے اور مطاع ہیں مگر ان سب کے مراتب علیحدہ علیحدہ ہیں مخلوق کے مراتب مختلفہ میں ماتحت کی وہ فرمانبرداری زیبا نہیں جس سے مافوق کی نافرمانی پیدا ہو۔ مثلاً بڑے بھائی کا وہ کہنا نہیں مانا جاتا جس میں والدین کی نافرمانی ہو۔ اسی طرح والدین یا استاد کے اس حکم کی تعمیل نہیں ہے جس میں روحانی باپ یعنی شیخ طریقت کی نافرمانی لازم آئے۔ یہاں تک کہ پیر کے بھی اس حکم کی تعمیل جائز نہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو ہاتھ سے چھڑا دے۔ اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات و خصوصیات کا حامل سمجھنا جو صرف خدائے تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہیں، غلط ہے اور شرک ہے۔ یہی کمال جس کو حفظ مراتب کہا جاتا ہے، تمام معنوی کمالات کی اصل ہے عوام کا تو کیا ذکر ان کے نزدیک تو اس کمال کا نام کفر ہے، بہت سے خواص بھی اس کا پورا حق ادا نہیں کرتے۔ جو آدمی جتنا بڑا ہے اس کا اس باب میں اتنا ہی بڑا امتحان ہوتا ہے کہ اگر شیخ کے کسی قول و فعل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے کچھ فرق نظر آتا ہو تو شیخ طریقت کے عمل اور سنت نبویہ کے اتباع میں ایک کی دوسرے پر ترجیح اور بصیرت و محافظت ادب کے ساتھ حفظ مراتب میں کمی نہ آنے پائے۔ یہ چیز صرف کاملین میں پائی جاتی ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے حضرت گنگوہیؒ کا بعض فروعی مسائل میں کچھ اختلاف ہوا۔ حضرت حاجی صاحب

میلاد و قیام وغیرہ میں کچھ توسع رکھتے تھے اور حضرت گنگوہیؒ اس میں سخت تھے۔ لوگوں نے اس پر یہ افواہ اڑا دی کہ حاجی صاحب نے حضرت گنگوہیؒ کی بیعت فسخ کر دی ہے۔ اصل چیز یہ تھی کہ حضرت حاجی صاحبؒ کو وہ تشدد پسند نہ تھا جس کو امام ربانی نے اصلاح خلق و احیاء سنت کی خاطر دانتوں سے مضبوط پکڑ رکھا تھا۔

اس تھوڑے سے شیخ و مرید باصفا کے اختلاف کو معاندین نے بہت ہوا دی اور یہاں تک خبر مشہور کر دی، کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت گنگوہی کی بیعت فسخ کر دی۔ حالانکہ جانبین کا حال یہ تھا کہ ادھر عقیدت و ادب میں اعلیٰحضرت حاجی صاحبؒ کی جانب سے ذرہ برابر تفاوت پیدا نہ ہوا تھا۔ اگر یہاں سے خط جانے میں توقف ہوتا اور خیریت معلوم ہونے میں چند روز کی دیر ہو جاتی تو حضرت حاجی صاحب بے تاب و بے قرار ہو جاتے اور خیریت طلب کرنے کے لئے بار بار خط لکھتے تھے اور اگر اعلیٰحضرت کا والا نامہ بغیر انتظار کے آجاتا تو حضرت امام ربانی خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور احباب کو بار بار مژدہ سنایا کرتے تھے کہ ہمارے حضرت کی عافیت مزاج بے موسم معلوم ہو گئی ـــــ اور بدگوئیاں جب حد سے گذر گئیں اور متوحش افواہیں چار طرف پھیلیں تو حضرت امام ربانی نے عریضہ لکھا اور دریافت کیا کہ ان باتوں کی اصل کیا ہے؟ اعلیٰحضرتؒ کی طرف سے جو طویل والا نامہ آیا تھا اس کو ملخصاً ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ از فقیر امداد اللہ عفی عنہ بخدمت فیضدرجت جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی متع اللہ بطول حیاتہ و دوام اعدادہٗ ـــــ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ، مکتوب برکت اسلوب مورخہ چہار دہم رمضان شریف بدست مولوی ممتاز علی صاحب ورود سرور لایا۔ ممنون و مسرور ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بایں عنایت و محبت مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر کونین درجات عالیات قرب و رضا عطا فرمائے۔ مولانا آپ کی تحریر باعث انشراح قلب و موجب جمعیت خاطر فقیر ہے اس لئے آرزو ہے کہ ہمیشہ اپنی خیر و عافیت و حالات ظاہر و باطن سے مسرور و مبتہج فرماتے رہو۔

آپ کے اس خط کے ہر لفظ اور ہر فقرہ سے عجب کیفیت و شگفتگی پیدا ہوئی ع اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کر دی۔ مولانا ضیاء القلوب[1] میں جو کچھ آپ کی نسبت تحریر ہے وہ آپ سے نہیں لکھا گیا جیسا القاء ہوا تھا ویسا ہی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ پس بدیہیات کو نہ ماننا اور اپنے ذریعۂ نجات و وسیلۂ فلاح دارین سے علیحدگی کرنا سخت جہالت و محرومی و ادبار ہے، خارج کرنا چہ معنی؟ فقیر تو تم علماء و صلحاء کی جماعت میں اپنا داخل ہو جانا موجب فخر دارین و ذریعۂ نجات وسیلۂ فلاح کونین یقین کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بھی یہی دعا ہے کہ تم صالحین کی محبت میں جلادے یا مارے۔ وہ شخص مُدبِر ہے جو تم مقدس و مقتدائے زمان سے کچھ دل میں کینہ یا سوء ظن یا بدعقیدگی یا عداوت و رنج رکھے۔ فقیر تو آپ کی سب حرکات و سکنات و اقوال و افعال کو منتج حسنات و برکات و موافق شریعت و طریقت سمجھتا ہے اور کل امور میں مخلص و صادق یقین کرتا ہے۔" (الیٰ آخرہ)

اور ادھر حضرت امام ربانی کو اپنے شیخ کے ساتھ محبت کی جو حالت تھی، اس کو کیونکر ظاہر کیا جائے جب کہ ضبط و استقلال

[1] ہر کس کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند و صحبت او شاں را غنیمت داند کہ ایں چنیں کساں دریں زمان نایاب اند (ملخصاً از ضیاء القلوب)

بندے گا۔ باقی کیسا شوق اور کیسی تمنائے زیارت، ہم تو سیاح آدمی ہیں یوں ہی گذارتے پھرتے ہیں ؎

گر شاد بزی کہ خوش جہانے دارد
نے خادم ہیچ کس نہ مخدوم کسے

ابھی چائے موجود تھی

مولوی شریف حسین مدراسی جو حضرت کے شاگرد تھے، حضرت کے دیوبند تشریف لانے پر ایک سماوار میں بڑی عمدہ چائے بنا کر بڑے شوق سے لائے۔ دیکھا تو بیٹھک اشخاص سے بھری ہوئی تھی۔ سوچتے رہے کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔ آخر یہ سوچ کر کہ خاص خاص حضرات کو پلا دیتا ہوں، دہلیز پر بیٹھ گئے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا۔ مولوی شریف حسین ایک طرف سے پلانا شروع کر دو۔ وہ پریشان تو ہوئے لیکن تعمیل ارشاد میں داہنے ہاتھ سے تقسیم کرنا شروع کر دی۔ تقریباً پچیس ۲۵ آدمی مجمع میں موجود تھے۔ سب نے چائے پی لی تو سماوار کھول کر دیکھا تو اس میں ابھی چائے موجود تھی اور یہ برتن صرف چھ پیالی کا تھا۔

آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا

حضرت کا معمول تھا کہ ہر روز ۱۲ بجے دوپہر کو حجرہ کی گھڑیاں دھوپ گھڑی سے ملاتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ متواتر کئی دن ابر محیط رہا اور دھوپ نہ نکلی۔ ایک دن دھوپ نکلی تو اس طرح کہ کبھی دھوپ کبھی بادل۔ حضرت بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے تشریف لائے اور مولوی علی رضا سے کہا کہ جب بارہ ۱۲ بجیں، مجھے خبر کرنا اور خود قریب ہی ایک جگہ لیٹ گئے۔ جب آئے تو دھوپ تھی لیکن جس وقت سایہ خط کے قریب (۱۲ کے خط کے قریب) پہنچنے لگا تو دفعتہً ایک بہت بڑا بادل سورج پر چھا گیا۔ گھبرا کر عرض کیا گیا کہ حضرت دھوپ چھپ گئی۔ آپ اُٹھ کر دھوپ گھڑی کے پاس آ گئے۔ آپ کا آنا تھا کہ بادل درمیان سے پھٹ گیا۔ آپ نے گھڑی ملائی اور حجرہ میں تشریف لے گئے۔ یا تو ایسا تھا کہ ابھی دس بارہ منٹ آفتاب نہ نکلے گا یا آپ کے آتے ہی آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا اور ایسا ہو گیا جیسے کوئی برقع سے منہ کو نکال دے یا جھروکے سے جھانکنے لگے۔

جا جا پہاڑ پر چڑھ جا

مولوی عبدالسبحان صاحب انسپکٹر پولیس گوالیار کے ایک تحصیلدار دوست برخاست کر دیئے گئے۔ تمامی کوشش کی دوبارہ تقرری ہو مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر دعا کے لئے گنگوہ پہنچے۔ حضرت نے فرمایا "تمہارے گھر کے قریب جو میدان ہے وہاں ایک مجذوب فقیر رہتے ہیں اُن سے ہمارا سلام کہہ دینا" تحصیلدار صاحب سمجھے کہ ٹال دیا۔ دل برداشتہ ہو کر واپس ہو گئے اور فقیر کے پاس بھی نہ گئے۔ کچھ دنوں بعد اتفاقیہ ادھر سے گذر ہوا، تو فقیر مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ دُور ہی سے ان کو دیکھ کر فقیر نے کہنا شروع کیا "بابا مولوی صاحب نے بھیجا ہے جا جا پہاڑ پر چڑھ جا" یہ سُن کر انہوں نے حضرت کا سلام تو پہنچا دیا مگر رنجیدہ و مغموم یہ سوچتے ہوئے مکان کو واپس ہوئے کہ مولانا نے یوں ٹالا اور انہوں نے اس طرح ٹالا۔ کام کچھ بھی نہ ہوا۔ اسی پیچ و تاب میں تحصیلدار صاحب مکان پر پہنچے تو حکم آیا ہوا تھا کہ تم بحال کئے گئے اور نینی تال کا تبادلہ ہوا۔

تم گنگوہ ہی جاؤ

مولوی عبدالسبحان صاحب کے ایک دوست مولوی قاسم صاحب کمشنر بندوبست ریاست گوالیار سے ریاست کی جانب سے تین لاکھ روپیہ کا مطالبہ ہوا۔ ان کے بھائی مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی خدمت میں گنج مراد آباد پہنچے۔ انہوں نے وطن دریافت کیا۔ عرض کیا گیا دیوبند۔ مولانا نے تعجب کے ساتھ فرمایا۔ گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں کیوں نہ گئے، اتنا لمبا سفر کیوں اختیار کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت لائی ہے۔ مولانا نے فرمایا

تم گنگوہ ہی جاؤ۔ تمہاری مشکلکشائی حضرت گنگوہی کی دعا پر موقوف ہے۔ تمام روئے زمین کے اولیاء بھی اگر دعا کریں گے تو نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ واپس ہوئے اور بوسیلہ حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے سفارش کی تو حضرت امام ربانی نے ارشاد فرمایا کہ میرا کوئی قصور نہیں کیا، یہ صاحب مدرسہ عربی دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے۔ سو قصور وار بھی اللہ پاک کے ہوئے۔ حق تعالےٰ سے توبہ کریں۔ بندہ دعا کرے گا۔ چنانچہ ادھر انہوں نے توبہ کی، اُدھر مطالبہ سے کمشنر صاحب کی برات ہوگئی۔

دو رکعت پڑھو

ایک مرتبہ دو اجنبی شخص آئے۔ سلام و مصافحہ کے بعد بیعت کی تمنا ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا "دو رکعت پڑھو"۔ حضرت کے اس ارشاد پر تھوڑی دیر تو دونوں صاحب گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر چپکے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ جب دروازہ سے باہر ہولئے۔ تو حضرت نے فرمایا دونوں شیعہ تھے۔ میرا امتحان لینے آئے تھے۔ حاضرین میں سے بعض آدمی اس کی تحقیق کو ان کے پیچھے گئے اور معلوم کیا تو واقعی رافضی تھے۔

ورنہ گمراہی کا احتمال ہے

مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہے تھے اور ان کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا، اس وقت تک ان کو حضرت امام ربانیؒ سے عقیدت تھی۔ اس طرف جانے والوں کو پوچھا کرتے تھے کہ حضرت مولانا اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔ اسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ یوں فرمایا تھا کہ "کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے"۔ اس کے بعد ہی مجددیت، مہدویت و علیسویت کے خیالات ظاہر ہونے شروع ہوگئے۔

(مرزا کے خیالات تاریخی کتاب سے ۳۹۹)

اچھا جلدی کیا ہے

افسرالاطباء حکیم احمد سعید امروہویؒ بیعت ہونا چاہتے تھے مگر کسی جگہ نظر نہ جمی۔ اسی خیال سے گنگوہ حاضر ہوئے۔ حضرت کے کمال اتباع سنّت کو دیکھ کر عقیدت پیدا ہوئی۔ مگر پھر یہ خیال ہوا کہ جب تک ادھر ہی سے قلب کو نہ کھینچا جائے گا بیعت نہ کروں گا۔ کئی دن کے قیام میں معمولاتِ پسندیدہ اور اخلاقِ حمیدہ دیکھ کر ارادہ کر ہی لیا۔ بعض خدام کے واسطے سے درخواست کی۔ حضرت نے صاف انکار فرما دیا کہ نہیں بیعت نہیں کروں گا۔ بڑے لوگوں کو مرید بنا کر جان کو آفت میں ڈالنا ہے۔ کوئی سفارش کراتا ہے، کوئی الزام لگاتا ہے۔ غرض ٹھیک نہیں"۔ حکیم صاحب بڑے افسردہ ہوئے کہ مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ مرجع خلائق اور کامل راہبر کی دست بوسی نصیب ہو۔ اب اسی افسوس میں کئی دن گذر گئے۔ آخر ایک دن حضرت کو حجرہ میں تنہا دیکھ کر اندر چلے گئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے محرومی کی امید نہ تھی۔ گو میں ناقابل ہوں مگر حضرت تو سب قابل ہیں۔ حضرت نے ان کو فرمایا۔ "اچھا جلدی کیا ہے، ابھی اپنے قلب کا اطمینان تو کر لو"۔ حکیم صاحب اپنے وسوسہ پر بہت نادم ہوئے اور معذرت کی۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں، بیعت سے متعلق انسان کو ہر طرح قلب مطمئن کر ہی لینا چاہیئے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست

بالفعل تم واپس جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔ حق تعالےٰ برکت عنایت فرمائے گا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے قلب پر سکون طاری ہونا شروع ہوگیا۔ بے چینی دُور ہوگئی اور وہ تعلق قائم ہوگیا جو مرید کو اپنے شیخ سے ہوتا ہے۔ وطن سے

حیدر آباد گئے تو دنیاوی برکات بھی حاصل ہوئیں ۔ افسر الاطبار، کا خطاب ملا ، اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کے مقابلہ کے باوجود اعزاز دن بدن بڑھتا رہا ۔

شیخ عبد القادر گیلانیؒ کے حکم سے بیعت حضرت منشی رحمت علی صاحب جالندھری خلیفہ ارشد حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری حضرت گنگوہیؒ کے بیعت ہوئے تھے ۔ ان کو جب شیخ کی تلاش ہوئی تو حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی خواب میں زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ گنگوہ جاؤ اور مولوی رشید احمد سے بیعت کرو ۔ چنانچہ حضرت منشی صاحب حضرت کے بیعت ہوئے ۔

خواب میں مرشد کی اطلاع اسی طرح حضرت حافظ محمد صالح صاحب (نکودری جالندھری) کو جب مرشد کی تلاش ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالے سے دعا کی کہ میں اس بزرگ سے بیعت لوں گا جس کی مجھے خواب میں زیارت ہو ۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ کی زیارت ہوئی ۔ پھرتے پھراتے گنگوہ پہنچے اور جاتے ہی پہچان لیا غالباً ادھر بھی اطلاع ہو چکی تھی ۔ درخواست بیعت پر فوراً بیعت کر لیا ۔

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں ۔ اوّل تو متوسلین بھی حضرت کی صحبت کیمیا اثر سے اس کو معمولی بات سمجھتے تھے ۔ نہ کسی کو یاد رکھنے کی طرف توجہ ہوئی ۔ نہ محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا ، پھر بھی تذکرۃ الرشید " میں حضرت مولانا عاشق الٰہی نے تقریباً اس سائز کے تیس ۳۰ صفحات میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے ۔ ہم نے اس باب کی تکمیل کے لئے چند واقعات لے لئے ورنہ ؎

ایں شرح بے نہایت کز حسن یار گفتند   حد نیست کز ہزاراں کاندر عبارت آمد

وصال

۱۲ رجمادی الاول ۱۳۲۳ھ کو آپ تہجد کی نماز میں مشغول تھے کہ آپ کے پاؤں کی دو انگلیوں کے درمیان کسی جانور نے کاٹا ۔ آپ کو محویت نماز کے سبب احساس بھی نہ ہوا ۔ جب فجر کی نماز کے لئے باہر آئے تو کپڑوں پر خون کی سرخی تھی ۔ جلدی کپڑے تبدیل کر کے جماعت کرائی اور جب چارپائی پر جا کر لیٹے تو معلوم ہوا کہ انگلیوں پر خون جما ہوا ہے ۔ خاصہ خون نکل چکا تھا ۔ جس کی وجہ سے ضعف و نقاہت اور کمزوری و غنودگی طاری رہنے لگی ۔

۲۷ رجمادی الاول ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء آپ کو تپ لرزہ ہوا ۔ پاؤں کے زخم کو معمولی سمجھ کر خاص علاج نہ کیا تھا ۔ اب اس جگہ نیلگوں چھالے پڑ گئے ۔ یہ بھی خیال ہوا کہ کسی نے سحر نہ کیا ہو ۔ ہر طرح کا علاج معالجہ کیا گیا ۔ مگر جو وقت مقدر تھا وہ کب ٹل سکتا تھا ۔ اسی زخم کی وجہ سے ورم ہو گیا جو بڑھتے بڑھتے اوپر کو چڑھتا گیا ۔

حضرت امام ربانیؒ کو جمعہ روز سے جمعہ کا انتظار تھا ۔ یوم شنبہ دریافت فرمایا کہ آج کیا جمعہ کا دن ہے ؟ خدام نے عرض کیا کہ حضرت آج تو شنبہ ہے ۔ اس کے بعد درمیان میں کئی بار یوم جمعہ کو دریافت کیا ۔ حتیٰ کہ جمعہ کے دن جس روز وصال ہوا ۔ صبح کے وقت پھر دریافت فرمایا کہ کیا دن ہے ؟ اور جب معلوم ہوا کہ جمعہ ہے تو فرمایا ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ

اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ——— باختلاف روایت ۸ یا ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو بروز جمعہ بعد اذان یعنی ساڑھے بارہ بجے آپ نے دنیا کو الوداع کہا اور اٹھتر سال سات ماہ تین یوم کی عمر میں رفیقِ اعلیٰ کی جانب ہنستے اور مسکراتے ہوئے سدھارے۔

تاریخ ہائے وفات

انّہ فی الآخرۃ لمن الصّالحین۔	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
کُنْتَ حَمِیْدًا لَمُتَّ شَہِیْدًا۔	حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ
مَوْلانَا عاش حمیدًا مات شہیدًا۔	حکیم الامت حضرت تھانویؒ
آہ حتّیٰ دَخَلَ الْخُلْد۔	حضرت مفتی عزیز الرحمانؒ
اے وائے نہاں شد آفتاب عرفان گفتند کہ وے شدہ خراماں بجنان	مولینا محمد شفیع گنگوہیؒ

تصنیفات و تالیفات

۱- تصفیۃ القلوب: حضرت حاجی صاحب کی تصنیف ضیاء القلوب کا اردو ترجمہ۔
۲- امداد السلوک: تصوف کے رسالہ مکیہ کا ترجمہ جو اوائل شباب میں کیا۔
۳- ہدایۃ الشیعہ: ہادی علی شیعی لکھنوی کے اعتراضات کے جوابات۔
۴- زبدۃ المناسک: حج کے متعلق تمام مسائل ضروریہ۔
۵- لطائف رشیدیہ: چند آیات قرآنی کے نکات اور پردہ مروجہ شرفا ہند کا حدیث سے ثبوت۔
۶- فتاویٰ میلاد و عرس وغیرہ مع تصدیقات دیگر علما۔
۷- رسالہ تراویح: بیس رکعت تراویح کا احادیث سے ثبوت۔ الرای النجیح فی اثبات التراویح
۸- ثقوب دافیہ: محلہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ کی کراہت کا فقہ سے ثبوت۔
۹- جمعہ فی القریٰ: اہلحدیث کے اس فتوے کا جواب ہے جس میں انہوں نے گاؤں میں جمعہ جائز ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اوثق العریٰ
۱۰- رد الطغیان: کلام مجید کے اوقات کو بدعت ثابت کرنے والوں کا جواب۔
۱۱- احتیاط الظہر: اس کا ثبوت کہ جہاں جمعہ ہو جاتا ہے وہاں احتیاط ظہر کی ضرورت نہیں۔
۱۲- ہدایۃ المعتدی: قراءۃ فاتحہ خلف الامام کے جوابات۔
۱۳- سبیل الرشاد: رد عدم تقلید
۱۴- براہین قاطعہ: انوار ساطعہ کا جواب نیز رد بدعات و تحقیق سنت میں لاثانی کتاب جو حضرت کے حکم سے لکھی گئی اور آپ نے اول تا آخر لفظ بلفظ ملاحظہ کر کے

۱۵- فتاویٰ رشیدیہ
۱۶- رسالہ خطوط [illegible]

ترتیب
عبدالرشید ارشد

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے تک ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا وہ علماً اور مذہبی مسلمانوں کا طبقہ تھا۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ سکول قائم ہوتا ہے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا) - اس وقت سے جدید و قدیم کا فرق ہونے لگتا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس حقیقت کو پہلے دن سے سمجھ لیا تھا کہ ہندی مسلمانوں کی خیر نہیں ہے۔ اور اب ذہنی و دماغی۔ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے رجحانات میں ایسا فرق ہو جائے گا کہ اگر بروقت علی گڑھ سکول کے قیام کی تحریک میں اصلاحات نہ کی گئیں تو آئندہ چل کر دیوبند اور علی گڑھ کی وہ چپقلش پیدا ہو گی جو کبھی ختم نہ ہو گی اور اس خلیج کو پاٹنا مشکل ہو گا۔ مولانا نانوتوی کی فراستِ ایمانی اور نگاہِ مردِ مومن کے سامنے ہندوستان کی پچاس سال قبل اور پچاس سال بعد کی سیاست تھی۔ اس لئے آپ نے سر سید مرحوم سے خط و کتابت شروع کی اور چاہا کہ جدید و قدیم تعلیم کے فرق کو بیچ سے نکال کر صحیح اسلامی فکر کو اصولِ تعلیم کر کے میدان کو جیت لیا جائے کیونکہ دین کی بنیاد صحیح علم و عمل پر ہے اور علم نام ہے خود شناسی اور خدا شناسی کا۔ بعض امورِ پر اتفاق کے باوجود کچھ حالات ایسے پیش آ گئے کہ جن کی وجہ سے ان دونوں کے اشتراک سے جامع منصوبہ تیار نہ ہو سکا اور دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ایسی کمائی تھے کہ جو علوم و فنون، افکار و خیالات میں اپنے استاد کے حقیقی جانشین اور چھوڑے ہوئے کاموں کے پورا کرنے والے تھے۔ یہ شیخ الہند تھے کون؟ ایک عالمِ ربانی و عارفِ یزدانی تھا جو اپنے کام و دھن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم۔ اس نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی اور نہ رُوسو اور نہ مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا وہ نہ گلیڈسٹون کے مجموعہ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن اسپیر کے افکار و نظریات سے۔ اس نے نہ کسی دل کشی کا خطرہ اٹھایا تھا اور نہ عشرت کدہ فرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی ان سب چیزوں کے برعکس اسکا شیرازہ حیات قال اللہ و قال الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباعِ سنتِ نبویہ تھا اس کے فکر و نظر کا تار و پود احکامِ الٰہی کے انوار سے بنا اور شریعتِ اسلام کے آفتاب جہاں تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا۔ سینہ میں صبر و استقامت کا ایک کوہِ گراں رکھتا تھا بظاہر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سب سے الگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں بین میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہو گئی تھیں۔ نیشنل کانگریس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ لیکن شیخ الہند یہاں اس حکومت کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے۔

(مدینہ بجنور)

ہم کو تسلیم ہے کہ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے زبان و قلم نے غفلت کدہ ہند کے خس و خاشاک میں آگ

بیس بڑے مسلمان لانے سے کم و شمار نہ تھا۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، مظفر نگر، دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا حرام کی زیارت کرانے کے لیے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے۔ اور انگشت بدنداں تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء یعز من یشاء و یذل من یشاء انہ علی کل شیئ قدیر

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ رولٹ کمشنر کے الفاظ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔ تاکہ معلوم

رولٹ رپورٹ کے الفاظ

ہو جائے کہ وہ دشمن جو اپنی سطوت وطاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر کہتا تھا کہ میں سمندروں کا خدا ہوں۔ میری حدود مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا، مجھ پر اگر آسمان ٹوٹ پڑے تو میں سنگینوں پر اٹھالوں گا۔ اس مغرور اور جابر طاقت نے اس تحریک سے کیا اثر لیا۔ اس کی نظر میں اس تحریک کی کیا حقیقت تھی۔ اس کی بنیادیں کتنی مضبوط تھیں۔ اور کس طرح کامیابی کے کنارے پہنچ گئی تھی۔ اس کے نتائج کیا ہوئے۔ اور اس تحریک نے دیس کی کیا کیا خدمتیں سرانجام دیں اور اس کے کارکنوں نے کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا الفضل ما شہدت بہ الاعداء رولٹ کمیٹی رپورٹ کے پیرا نمبر ۱۶۴ میں درج ہے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا۔ اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا یہ ایک منصوبہ تھا جو اس خیال سے ہندوستان میں تجویز کیا گیا تھا۔ کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش[1] سے اسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔

اس منصوبہ کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لیے مولوی عبید اللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں عبداللہ، فتح محمد، محمد علی، کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبید اللہ پہلے سکھ تھا۔ بعد میں مسلمان ہوا۔ اور دیوبند ضلع سہارنپور کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے مولوی بنا۔ وہاں اس نے اپنے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند مدرسین اور طلبہ میں پھیلا دیا۔ جن لوگوں پر اس کے اپنا اثر ڈالا۔ ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن صاحب کی تھی۔ جو مدتوں تک درسگاہ دیوبند کے صدر مدرس[2] رہے۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی (بیان اسلامک)

---

[1] اگر فقط مسلمانوں کے لیے منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی۔ اور حکومت مرقتہ میں غیر مسلموں کے لیے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی۔ جیسا کہ آئندہ آئیگا۔ (۲) اگر صرف مسلمانوں کے لیے یہ منصوبہ تھا تو ہردیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی اعانتیں کیا گواہی دیتی ہیں۔ دیکھو رولٹ رپورٹ فصل پنجاب (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ جیسا کہ آئے گا اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور رام چند غدر پارٹی کا ممبر تھا جس میں رام چندر جیسا مشہور و معروف بھی ممبر تھا۔ تو اس میں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی۔ بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی۔ جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ البتہ مسلم عنصر غالب تھا۔ جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمار سے میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبید اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔

(برٹش کاز ملاحظہ کرو ص ۲۲۸)

[2] یہ بالکل برعکس معاملہ ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا عبید اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر نہیں کیا۔ بلکہ مولانا شیخ الہند انگریزوں کے مظالم شنیعہ اور مسلسل بے راہیوں واقعات ماضیہ اور حالات حالیہ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے مولانا عبید اللہ صاحب کو اس طرف کھینچا۔ جیسا کہ ہم نے حضرت شیخ الہند کے اس سفر کو پہلے بھی نقل کیا ہے اور مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنی ڈائری میں بار بار اس کو ذکر کیا ہے۔ یہ

حاشیہ باقی اگلے صفحہ پر

تحریک چلائے لے

مگر بہتم صاحب اور ارباب شوریٰ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان میں ہی ختم کر دیا۔ مولانا محمود حسن صاحب بہرحال میں دیوبند میں ہی رہے اور عبیداللہ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتیں اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے میاں محمد ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) بات محض اصحاب غرض نے گورنمنٹ کو سجھائی تھی کہ مولانا عبیداللہ نے حضرت کو متاثر کیا ہے۔ یہ ذکر نہیں سُنے تھے کہ سارے سابقہ اور لاحقہ طرابلس اور بلقان کے معاملات اور ہندوستان کے مظالم اس کے باعث ہوتے ہیں۔ بیچارے مولوی عبیداللہ کو ہدف ملامت بنا کے رہے۔

لے یہ بھی بالکل غلط اور افترا ہے۔ ہندوؤں کو اس تحریک سے بھڑکانے کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے انگریزوں کی عادت رہی ہے۔ مولانا عبیداللہ صاحب اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو سودہ اپنی ڈائری ص۳ میں لکھتے ہیں۔ ''میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا۔ لیکن مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ان عملی حصہ لینے کے لیے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا۔ تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی (ذاتی ڈائری ص۳) اور یہی مطمح نظر اور مشورہ حضرت شیخ الہندؒ کا مولانا عبیداللہ صاحبؒ کے لیے نشان راہ تھا۔ چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کے باب میں ص۸ پر لکھتے ہیں۔'' مجھے یہاں صراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور کا صحیح مشورہ نہ ملتا تو میری بات اس قدر موثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا۔ بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی'' (ذاتی ڈائری ص۹) امیر حبیب اللہ خاں نے بھی یہی مشورہ مولانا عبیداللہ صاحب کو دیا تھا۔ چنانچہ ڈائری کے ص۱۲ میں لکھتے ہیں۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے ملکر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں داخل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوشش سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس میں فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔ (ذاتی ڈائری)

خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اس تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لیے موثر قرار دیتا ہے۔ یہی اس کا عقیدہ اس سے پہلے کا ہے۔ اور پان اسلامک اور اتحاد اسلامی تحریک کو امیر کابل کی ناپسندیدہ تحریک قرار دیتا ہے اور اسی کو حضرت شیخ الہند کا مشورہ قرار دیتا ہے۔ مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کے لیے اس کو پان اسلامک

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولوی عبید اللہ کی پیروی کی اور ہندوستان چھوڑ دیا۔ مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کے خطۂ حجاز میں پہنچ گئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور دو کتابیں شائع کی تھیں۔ جس میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا۔ اس شخص (مولانا عبید اللہ) اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا شیخ الہند کا اہم مقصد یہ تھا کہ بیک وقت ہندوستان پر باہر سے بھی حملہ کرایا جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے۔ ہم اس جد و جہد کی تفصیل بتلاتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے عمل میں لائے۔ عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے۔ وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترکی جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا دیوبندی دوست میاں محمد بھی اس سے جا ملا۔ یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا۔ جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے وصول کیا تھا۔ یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد میاں نے اس کی کاپیاں راستہ میں ہندوستان اور سرحدی قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں۔ مولوی عبید اللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جو شیلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے اٹلی سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا۔ اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔ ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا۔ جس کا نام اسلامک فرٹیرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر برادری سے جا ملا۔ ۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومتِ موقتہ (پروشنل گورنمنٹ) نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے۔ جن میں اس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان

کہتی ہے ہم پہلے بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو مسلمان پارسی سکھ وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی سکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا۔ بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے ان کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے۔ جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرایہ پر لے رکھا تھا۔ رولٹ کمیٹی کی یہ رپورٹ جھوٹ اور افترا نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ۱۸۲۴ء اور جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا (حاشیہ گزشتہ صفحہ) ؎ یہ غلط ہے کہ یہ تجویز آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اس وجہ سے ختم ہوئی۔ یہ تجویز اس وقت تک ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ بعض مسائل دینیہ مختلف فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا اور اسی اختلاف کی بنا پر مولانا سندھی رح کو دار العلوم دیوبند سے الگ کیا گیا۔ ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ آپ نے مولانا سندھی رح

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ہیں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ لگ گئے۔ نار کے جو خط لکھا گیا تھا۔ وہ سونے کی تختی پر تھا۔ اور اس کی ایک تصویر ہمیں (رولٹ کمیٹی کے ارکان کو دکھلائی گئی تھی۔ حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدرآباد (سندھ) بھیج دیا گیا۔ شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔ مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں۔ ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام، بھاگے ہوئے مہاجر طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا اور حکومت موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنے کی تجویز ہوئی تھی۔ اور اس کا کام اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلہ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچا دیں مولانا عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود حسن صاحب کو اس کا سالار بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلبہ میں سے ایک کو میجر جنرل بننا تھا اور چھ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے معافی مانگی۔ بہرحال اصلی سبب وہ امر ہے۔ جس کی بنا پر مسٹن گورنر یوپی دیوبند اور دارالعلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا"۔

لہ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لیے جو سازش تیار ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک رجمنٹ اور میگزین پر حملہ کرنا تھا۔ اس تاریخ کو ۱۲۰ آدمی جن میں سے کچھ مسلم تھے۔ ریل کے ذریعے فیروز پور پہنچے۔ مگر فوج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی۔ ان میں سے پندرہ مسلمان طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین (مجاہدین) سے جا ملنے کے لیے نکل چکے تھے۔ (رولٹ کمیشن) رپورٹ فصل پنجاب) پیراء ۱۶۴۔ ہم نے پنجاب سے متعلقہ فصل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے ۱۵ طالب علموں نے کالج چھوڑا اور مجاہدین سے جا ملے۔ اس کے بعد وہ کابل گئے وہاں ان کو پہلے تو سختی سے نظر بند رکھا گیا اور بعد میں رہا ہو کر نگرانی کے ماتحت نقل و حرکت کی اجازت دی گئی۔ وہ ہندوستان واپس آتے۔ تین کو حکومت روس نے گرفتار کر کے برطانوی حکومت کے حوالہ کیا۔ انھوں نے اپنے برتاؤ کے متعلق ندامت کا اظہار کیا اور انھیں مشروط معافی مل گئی ان پندرہ طلباء کو ان کے مداحوں نے مہاجرین کا لقب دیا تھا۔ ان میں سے جو دو واپس ہوئے ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں۔ ایک طالب علم تو ایک مطبوعہ ٹریکٹ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے اعلان کیا ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کرکے ان مقامات کی بے حرمتی کا خطرہ ہے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت کر کے کسی اسلامی ملک میں جانا چاہیئے۔ دوسرے طالب علم کو بھی اس سلطانی اعلان سے جوش آیا تھا اور انگریزی اخبار کی تصویر سے بھی اسے صدمہ پہنچا تھا۔ جو اس کے خیال میں نفرت کی لہریں پیدا کرنے والی تھی۔

(حاشیہ ۵۸-۵۹ ذاتی ڈائری)

ہیں بڑے مسلمان

کر لیفٹیننٹ کرنل، ان اعلیٰ عہدہ داروں کے لیے جن اشخاص کو تجویز کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی۔ چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور اس کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضہ میں آگئے۔ اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں۔ غالب نامہ پر دستخط کرنیوالا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے۔ اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس پر دستخط کئے ہیں اس خط کے مشہور حصوں کا ترجمہ یہ ہے:

دو ایشیا۔ یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے کود پڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آگئے ہیں۔

اس لیے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو۔ اس پر حملہ کرو دشمن کو مرنے پر مجبور کر کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جد وجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو۔ ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا۔ اور اسے ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ اور آدمیوں اور روپیوں اور ہر اس چیز سے امداد کی جائے۔ جس کی ضرورت اسے پیش آسکتی ہے۔

(ذاتی ڈائری از ص۵۳ تا ص۵۶)

(رولٹ کمیٹی کی رپورٹ)

رولٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح اور مکمل علم نہیں ہو سکا۔ تاہم ان تحریروں سے حضرت شیخ الہند رح کی جلالت وعظمت اور ان کے بلند ارادوں اور استقلال وعالی ہمتی اور بلند پروازی کا کافی اندازہ ناظرین کو ہو گیا ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے بارہا فرمایا

"حضرت شیخ الہند رح تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہ پہنچے تھے۔"

اور جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لیے دیوبند تشریف لائے اور رو کر کہنے لگے کہ:-

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال نے ہماری کمر توڑ دی"

یورپین قومیں ہر اس شخص کو جو اپنی قوم اور وطن کا فدائی اور خیر خواہ ہو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کا احترام کرتی ہیں۔ اگرچہ سیاسۃً وہ دشمن ہی ہو۔ مالٹا کی اسارت گاہ میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی آفیسر انگریز آتے تھے۔ تو حضرت شیخ الہند کو دور سے دیکھ کر ہیٹ (انگریزی ٹوپی) اتار کر سلام کرتے تھے اور باادب کھڑے ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کھڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات اپنے ترجمہ قرآن کے لکھنے میں مصروف رہتے۔ مگر یہ فوجی اور ملکی بڑے بڑے آفیسر اکرام

کھڑے ہوجاتے تھے اور آپ کی معروضیتوں کو نہایت ادب سے دیکھتے رہتے تھے۔ حالانکہ معمولی گورا بھی بڑے بڑے گورنمنٹ پرستوں، ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کی ادنیٰ درجہ کی تعظیم وتکریم عمل میں نہیں لاتا تھا۔ پرنس جرمنی (جرمن کا شاہزادہ) جوکہ اڈن جہاز سے گرفتار ہوا تھا اور مالٹا میں ایک عرصہ تک رہا تھا۔ ہمیشہ حضرت کی خدمت میں بالخصوص بقرعید کے موقعہ پر حاضر ہوتا تھا اور مبارک باد پیش کرتا تھا۔ اور یہی حال بڑے بڑے فوجی اور سول افسروں جرمنی، اسٹریا، بلگیرین اور ترکوں کا تھا۔ مسٹر برن جوکہ گورنر پی کا سیکرٹری انگریز تھا۔ مولانا عزیز گل صاحب سے بعض استادوں کے تذکرہ پر کہنے لگا کہ گڑ گڑ ہی رہا اور شکر چینی بن گئی (یعنی تمہارے وہ اساتذہ کم ہمتی کی وجہ سے نیچے ہی رہے اور تم اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی وجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے) یہ تو دنیاوی عزت اور رفعت کا معاملہ ہے مگر ہم کو اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس سے بدرجہا زائد رفعت کی امیدیں ہیں ؎

سگِ اصحابِ کہف روزے چند
پے مردم گرفت مردم شد
پسرِ نوح با بداں بنشست
خاندانِ نبوتش گم شد

اسی پر جب شریف حسین نے دنیاوی لالچ میں آکر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اسلامی ترکی حکومت کو جوکہ اس کی اور اس کے آباؤ اجداد اور اولاد وخاندان کی ولی نعمت بھی تھی کفرانِ نعمت کرکے برباد کردیا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

با بداں یار شد شریف حسین　　خاندانِ شرافتش گم شد

چنانچہ تھوڑے ہی زمانہ کے بعد شرافت کا عہدہ اور امتیاز تمام مکہ معظمہ اور حجاز بلکہ عرب سے مٹا دیا گیا۔ شریف حسین کو اس کے آقاؤں نے ہی نظربند کرکے جزیرہ سائپرس (قبرص) میں بٹھا دیا۔ اور وہ اسی طرح وہاں بے یارگی کی حالت میں مرگیا۔ آخرت کی خبر خدا جانے۔ اس کے لڑکوں شریف عبداللہ کو شرق اردن کی بے برگ وبے گیاہ وادی کا چھوٹا سا ٹکڑا اور شریف فیصل کو ماسوپوٹامیا (عراق) کا برباد شدہ اور غیر آباد صوبہ دے دیا۔ اور پھر جو اس کے قتل وغیرہ کے واقعات پیش آئے ان کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔ شریف کے ساتھ غدر کرنیوالے سوریہ اور فلسطین کے عرب باشندوں کا جو حشر فرانس اور اسرائیل (یہودیوں) کے ہاتھ سے کرایا گیا۔ وہ تاریخ کے سیاہ اوراق اور عربوں کے زخمی اور گہری گھاؤ والے دلوں سے پوچھئے۔ جن پر یورپ کی تیراندازی آج تک ختم ہونے میں نہیں آتی اور آئے دن قیامت پر قیامت ٹوٹتی رہتی ہے ان ربک لبالمرصاد۔

گندم از گندم بروید جو ز جو !　　از مکافاتِ عمل غافل مشو

ترک تو اپنے مقامات پر مستقل اور قابض وحکمران رہے۔ مگر عربوں کی پریشانیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ کہاں عربوں کی مستقل جمہوریت اور تمام عربی بولنے والوں کا صوباتی وفاق اور شریف حسین کی سب پر صدارت، جمہوریت جس کا سبز باغ بلکہ خوش آئند خواب برطانوی ذمہ داروں نے دکھلایا تھا اور کہاں یہ تفرق اور یہودیوں کا یہ تسلط اور ظلم وجبر اور عربوں کے لاکھوں نفوس کی جلاوطنی یہ قدرت کے عبرات میں سے نہیں ہے تو کیا ہے۔

قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من

ہو گئے چنانچہ میں پورب کے سفر گوڑہ جہاں ، الہ آباد ، غازی پور ، فیض آباد ، لکھنؤ ، مراد آباد سے واپس ہو کر امروہہ چلا گیا۔ اور کتب درسیہ متعلقہ مدرس اول کی تدریس میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حضرت کا حکم محرم مجھ کو ملا کہ تم کو یہاں دیوبند میں میرے پاس رہنا چاہیے اس زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بیماریوں کی شکایت شروع ہو گئی تھی۔ مہمانوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں دورہ کی تیاری فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشاد اور حکم سے میں امروہہ گیا ہوں اور وہ بھی آپ ہی کا مدرسہ ہے۔ اس کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ فرمایا کہ مجھ کو یہاں تیری ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں تو خدمات انجام دینے والے بکثرت اور خصوصاً فلاں فلاں حضرات موجود رہتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ تو اپنی نگہداشت بھی نہیں کر سکتے۔ میری نگہداشت کیا کریں گے۔ اس کو سن کر میں چپ ہو گیا اور عرض کیا کہ میں حسب ارشاد حافظ زاہد حسن صاحب کو لکھتا ہوں۔ چنانچہ حافظ صاحب موصوف کو اطلاع دی۔ وہ فوراً آئے اور عرض معروض کے بعد اس پر راضی کر لیا کہ ایک مہینہ کے لیے حسین احمد کو امروہہ کی اجازت دے دی جائے۔ تاکہ ہم اس مدت میں ہم دوسرے مدرس کا انتظام کر لیں۔ حضرت اس پر راضی ہوئے اور میں امروہہ جا کر تدریس میں مشغول ہو گیا۔ میرے جانے پر مرض میں زیادتی ہو گئی۔ کچھ دن ہی گزرے ہوں گے۔ کہ حضرت کا تار پہنچا کہ میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں۔ تم مجھ سے علیگڑھ میں مل۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سفر علیگڑھ اور جامعہ ملیہ

تحریک خلافت کا زور تھا۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترک موالات کا جوش تھا۔ اس لیے چاہتے تھے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کر لے۔ مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیاں یونیورسٹی کب اس کو گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے سخت مخالفت کی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتدبہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی۔ اور آزاد درسگاہ قائم کرنے کے لیے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو۔ تیاری کرنے لگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا۔ اور اس میں نان کو اپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آ گئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی۔ اور تمام مسلمانوں اور طلبہ مسلم یونیورسٹی کو زور دار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹ امداد چھوڑ دیں۔ اور اگر کالجوں اور سکولوں کے زعماء امداد نہ چھوڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں۔ جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس ہی فتویٰ کی وجہ سے گورنمنٹ نے سر رحیم بخش کو خصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتویٰ واپس لینے کے لیے بھیجا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔ جیسا کہ طلباء مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا۔ اسی طرف خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا۔ فتویٰ مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریمؐ

قال اللہ تعالیٰ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرینؐ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے

تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہئیے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔ ۱۷

وتعاونوا علی البر والتقوٰی و لا تعاونوا علی الاثم و العدوان ط

اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی معاونت کرنی چاہیئے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو ۔ ۱۸

ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین ۰

کفار کی موالات کی تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے ۔ اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی ۔ وہ شخص بھی ان ہی میں سے شمار ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا ۔ ۱۹

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف

آدمی ایا نہ ہوا لیکن محبت ہو تو ہو

اما بعد آج جب کہ مشرق و مغرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ۔ جب کہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز اُنڈتے طوفانوں کی موجوں سے ٹکرا کر (خدا نہ کردہ) پاش پاش ہو جائے ۔ جب کہ ہر فرد مسلم کی رُوح موت کی دھمکیاں دینے والے حرارت سے لرز رہی ہے ۔ بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے ۔ علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہند و ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جد و جہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں ۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے ۔ لیکن جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے ۔ تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے ۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں ۔ اور جیسا کہ میری طویل زندگی سے شاہد ہے ۔ میرا مطمع نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے ۔ اور یہی وہ مطمع نظر ہے ۔ جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا ۔ پس میں ایک لمحہ کے لیے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا ۔ جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز و فلاح سے ہو ۔ یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو ۔ مالٹا سے واپس آکر مجھ کو علم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بسط و کشاد نے آخری طریقہ کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے ۔ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں ۔ اور نفع و ضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف و خطر انجام تک پہنچائیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کر دیں ۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے ۔ اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیئے کہ وہ سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے ۔ ۲۰

۶ـ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے۔

۷ـ صرف اپنی ملک کی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔

۸ـ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں۔ ان پر عمل کریں۔ بشرطیکہ:۔

۹ـ اتباع شریعت کیا جائے۔ اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔

۱۰ـ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقض امن کا اندیشہ ہو۔ ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کے اعتدال مدنظر رہے۔

۱۱ـ ارشاد عثمان - اذا احسن الناس فاحسن معهم واذا اساؤا فاجتنب اساتهم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو۔ اور جبکہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ واللہ الموفق والمعین

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۳ ذیقعدہ
سنہ ۱۳۳۸ھ

اس کے بعد یہی فتویٰ جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فیصلہ کی صورت میں تقریباً ۵ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔ الغرض اسی تحریک اور اسی فتویٰ اور اسی تحریر کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اگر زعماء مسلم یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا۔ بہرحال گورنمنٹ پرستوں نے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ جوشیلی روحیں کب اس کو گوارا کرسکتی تھیں۔ انھوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا۔ مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوئی۔ تو مجوزہ آزاد نیشنل یونیورسٹی کے لیے جلسہ کرنا چاہا اور اہل الرائے کو دعوت دی۔ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے۔ چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ خدام نے اس سفر کو خطرناک اور نہایت تکلیف دہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت کا جواب حسب ذیل تھا۔

"اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہوں گا"

ـہ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب صاحب زادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مہتمم دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب سرجیمس گورنر یوپی نے دلوایا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس کردیا اور ایسی موثر تقریر مجمع میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر بیک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔

محسوس کرکے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہو گی۔ تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے۔ تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو۔ ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے دبا سکے گی۔ ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشیں کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں۔ کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں۔ کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے۔ جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے در پے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے۔ کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو۔ ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پئیے۔ یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے مہلک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔"

(خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند مطبع قاسمی)

(از علمائے حق ص ۳۱۸)

(مرتبہ ازی ... ص ۸۲۳)

(مرتبہ ... ص ۸۲۴)

بے شمار اجتماع سہارنپور مظفرنگر وغیرہ اطراف وجوانب سے ہوگیا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے گا۔ صبح تک یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہوگیا۔ جنازہ صبح کی نماز کے بعد دارالعلوم دیوبند میں پہونچایا گیا۔ نودرہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تمام صف بندی ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب جنھوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ باقلب مضطر وچشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک پرکیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہدہ ہو رہی تھی۔ خواہ اس کو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت وحقیقت کہیئے۔

(سوانح صد ۱۵۱)

دیوبند میں اس وقت تک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازہ سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ جنازہ مقبرہ میں پہنچا یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے اس راحت کے لیے یہ شاگرد فرشتہ خو استاذ اپنے مقدس مرشد واستاد کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ قبر تیار تھی۔ جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے۔ چاشت کا وقت تھا۔ نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین، امام المحدثین والعارفین، قطب عالم طور کمالات، بطل حریت، آزاد کنندہ ہندوستان، حاتم دوراں، بخاری زماں، کوہ وقار و وقار حلم، آفتاب معرفت وعلوم، گنجینہ حکمت، امام خزینہ احادیث، سنن نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو لحد میں اتار دیا گیا۔ اور شریعت وطریقت کے آفتاب عالم تاب کو ہمیشہ کے لیے نظروں سے چھپا دیا گیا۔ ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو!
گنجینہ علوم ہے۔ گنجینہ زر نہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ط رضی اللہ عنہ وارضاہ آمین۔

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو
چھپا چاہ لحد میں وائے قسمت ماہ کنعانی

جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہم ہو
پھریں ہیں ڈھونڈتے سرگشتگان تیہ حیرانی

زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی فرقت کا
کہ تھا داغ غلامی جس کا تمغائے مسلمانی

نہیں ہے سینہ مجروح کم گنج شہیداں سے
تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہے سب کی قربانی

قضا لے آئے میں سے کوئی ایک دکھلا دے
کئے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۸۰ھ / ۱۸۶۳ء　○　۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۲ء

۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ

حکیم الامت خود اپنی نظر میں

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ سے تھانہ بھون میں متعینہ ایک پولیس افسر نے بیعت کی درخواست کی تھی۔ جس کے جواب میں آپ نے انہیں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا۔

"میں ایک خشک طالب علم ہوں۔ اس زمانہ میں جن چیزوں کو لوازمِ درویشی سمجھا جاتا ہے۔ جیسے میلاد شریف۔ گیارہویں عرس، نیاز، فاتحہ، قوالی و تصرف و مثل ذالک میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اس خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں"

میں نہ صاحبِ کرامت ہوں اور نہ صاحبِ کشف۔ نہ صاحبِ تعریف ہوں اور نہ عامل۔ صرف اللہ اور رسولؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا۔ نہ اپنی حالت۔ نہ اپنی کوئی تعلیم نہ امورِ دینیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔ عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں۔ نہ کسی کی سفارش۔ اس لیے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک کہتے ہیں میرا مذاق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں۔ خواہ حرفی ہی اذیت ہو۔

سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے۔ خواہ بدنی ہو جیسے مار پیٹ خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا۔ یا ناحق کوئی چیز لے لینا۔ خواہ آبرو کے متعلق ہو جیسے کسی کی تحقیر، کسی کی غیبت۔ خواہ نفسانی ہو جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار، رنجدہ معاملہ کرنا اور اگر اپنی غلطی سے ایسی بات ہو جائے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

مجھے ان کا اسقدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع خلافِ شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس سے نجات دے۔ یہ ہے کچا چٹھا ورنہ لوگوں نے تو ـ

منش کردہ ام رستم پہلوں ؛ دگر نہ یلے بود در سیستان

حضرت حکیم الامت کے ماموں پیرجی امداد علی صاحبؒ ایک زبردست حال وقال بزرگ تھے۔ یہ اپنے وقت کے مجذوب کامل حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتیؒ کے مشورہ سے حیدرآباد دکن تشریف لائے۔ یہاں ملازم بھی ہوئے اور اسکے بعد حضرت صاحبؒ ہی کے ایماء سے مرزا سردار بیگ صاحب کی ارادت میں داخل ہو گئے جنہوں نے نوابی وریاست کو ٹھکرا کر فقر و درویشی اختیار کر رکھی تھی۔ گو حضرت حکیم الامت کو مسائل وحقائق میں ان سے اختلاف تھا مگر ان کا جذبۂ عشق بہرحال قابل قدر تھا۔ حکیم الامت پر ان کے اشعار سے آگ برستی تھی۔ چنانچہ ان کا یہ شعر حضرت اقدسؒ نے بارہا نقل فرمایا ہے ؎

جب تو نے یہ مے ظالم شیشے میں بھری ہوگی ✣ ساقی تری مستی سے کیا حال ہوا ہوگا

حضرتؒ کے نانا میر نجابت علیؒ اعلیٰ درجہ کے فارسی دان، انشاپرداز اور حاضر جواب بزرگ تھے۔ مولانا شاہ نیاز احمد بریلوی کے ایک خلیفۂ خاص کے مرید اور حافظ غلام مرتضےٰ صاحب سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔

حضرت اقدس کے جدِ اعلیٰ سلطان شہاب الدین "فرخ شاہ" "کابلی" تھے۔ ان کی اولاد میں شیوخ تھانہ بھون کے علاوہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہٗ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اور شیخ فریدالدین گنج شکر جیسے کاملین ہوئے ہیں۔ خود حضرت فرخ شاہ پہلے تو والی کابل رہے اور سلطنتِ غزنویہ کے زوال پر جذبۂ جہاد کے تحت کئی بار ہندوستان پر حملہ کر کے کافروں کو زیر کیا اور بامراد لوٹے۔ جہادِ اصغر سے فراغت پاکر جہادِ اکبر میں مصروف ہو گئے۔ کابل کے کہسار کو اپنا نشیمن بنایا۔ بزرگانِ چشت کے آگے زانوئے ارادت تہ کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ اور ایک عالم کو فیض یاب کیا اور پھر بعد وفات وہیں دفن ہوئے۔ یہ موضع آج تک "درۂ فرخ شاہ" نام سے مشہور اور زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔

تا گوہرِ آدم نسبم باز نہ استد ✣ ز ابائے خود ار لشمرم اصحابِ کرم را

ولادت اور بچپن

خاندان اشرف کا مجمل خاکہ نظروں میں آگیا۔ ایسے عالی خاندان میں جہاں دولت وحشمت اور زہد وتقویٰ بغل گیر ہوتے تھے، حضرت مجدد الملت کی جامع شخصیت ظہور پذیر ہوئی۔ ولادت کا واقعہ بھی عجیب ہے حضرت اقدسؒ کے والد مرحوم کے اولاد نرینہ زندہ نہ رہتی تھی۔ اس کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ موصوف جب ایک مرتبہ مرض خارش میں بری طرح مبتلا تھے تو مجبوراً کسی ڈاکٹر کے مشورہ سے ایسی دوا کھالی تھی جو قاطع نسل تھی۔ مگر جب اس کی خبر مرحوم کی خوشدامن صاحبہ کو پہنچی تو وہ سخت پریشان ہوئیں اور حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحبؒ پانی پتی سے عرض کیا کہ میری لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے ہیں۔ حافظ صاحب نے مجذوبانہ انداز میں فرمایا۔ "عمرؓ و علیؓ کی کشاکش میں مرجاتے ہیں۔ اب کی باری علیؓ کے سپرد کر دینا۔" اس معمہ کو کسی نے نہ سمجھا لیکن حکیم الامتؒ کی والدہ تاڑ گئیں اور فرمایا۔ "حافظ صاحبؒ کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کی ددھیال ہے فاروقی اور ننھیال ہے علوی۔ اور اب تک جو نام بھی رکھے گئے وہ ددھیالی طرز پر تھے۔ اب کی بار جب لڑکا ہو تو ننھیالی وزن پر نام رکھا جائے گا جس کے آخر میں "علی" ہو۔ حافظ صاحبؒ یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا۔ "وہ لڑکی بڑی ہشیار ہے۔ میرا منشا یہی تھا۔" پھر فرمایا۔ "انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرے کا نام اکبر علی۔ ایک میرا ہوگا اور وہ مولوی ہوگا۔ دوسرا دنیا دار ہوگا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا مجدد الملت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہار شنبہ کے دن صبح صادق کے طلوع کے ساتھ جلوہ نما ہوئے۔

چونکہ حضرتؒ کی ولادت کے چودہ ہی مہینے بعد آپ کے چھوٹے بھائی اکبر علی مرحوم کی ولادت ہوئی اور ماں کا دودھ دو بچوں کے لیے

کافی نہ ہوتا تھا اس لیے ایک انا رکھی گئی۔ پھر حضرت کی عمر شاید پانچ ہی برس کی ہوئی تھی کہ مادری سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مگر محبت مادری کا سیلاب شفقتِ پدری کے دریا میں ضم ہو کر اب اس کی راہ سے امڈنے لگا۔ والدِ ماجد نے اپنے گوہرِ اشرف کی تربیت بڑے ہی پیار و محبت سے کی اور تربیت میں اس کا خاص لحاظ رکھا کہ اس کی جلا میں فرق نہ آئے — تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر جب مٹھائی بٹتی تو اس میں ان کو شریک نہ ہونے دیتے۔ بلکہ اس وقت خود بازار سے لا کر اپنے فرزند کو چکھا دیتے اور فرماتے کہ "مسجد کی مٹھائی لینا بے غیرتی کی بات ہے" نوعمری میں ایک مرتبہ فرزند کی زبان سے مولانا رفیع الدین صاحبؒ (مہتمم دار العلوم) کے متعلق یہ نکل گیا کہ "مولانا تو [illegible]" بس اس پر اس سختی سے ڈانٹا کہ گویا اب مارنا ہی باقی تھا۔ فرمایا کہ "بزرگوں کی شان میں یوں نہیں کہا کرتے" — حضرت اقدس کی طبیعت خود ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ کبھی بازاری لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن ہی سے حضرت کا مذاق دینی تھا۔ کھیلوں میں بھی نماز باجماعت کی نقل اتارتے تھے۔ بازار کی طرف کبھی نکل جاتے اور راستہ میں مسجد نظر پڑتی تو سیدھے اندر چلے جاتے اور منبر پر چڑھ کر خطبہ کی طرح کچھ پڑھ پڑھا کر لوٹ آتے۔ گویا مستقبل کے نقشہ کا خاکہ اس نیم شعوری دور ہی سے کھنچ رہے تھے۔

ابھی ۱۲-۱۳ برس ہی کی عمر ہوگی کہ "فغانِ صبحگاہی" کا چسکا لگا۔ پچھلی رات سے اٹھ بیٹھتے اور تہجد و وظائف میں منہمک ہو جاتے۔ والدہ تو تھیں نہیں، تائی صاحبہ کا دل بہت دکھتا کہ اس نوعمری میں یہ مشقت! — لیکن عشق کی آگ تو بھڑک چکی تھی اور حضرت کے استاد مولانا فتح محمد صاحب جیسے صاحبِ نسبت و اجازت بزرگ کی صحبت نے اپنا اثر جما دیا تھا

نظافتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ بچپن میں بھی کسی کا ننگا پیٹ دیکھتے تو قے کر دیتے تھے۔ طبیعت کی اس لطافت سے بہت ستائے گئے۔ بڑے ہو کر بھی یہ عالم رہا کہ جس کمرہ میں تیز خوشبو ہوتی سو نہ سکتے تھے۔ ابتدا ہی سے بے اصولی ناقابلِ برداشت رہی۔ اس وجہ سے حضرت والا کی بڑی اہلیہ محترمہ فرمایا کرتی تھیں کہ "آپ تو کسی بادشاہ کے ہاں پیدا ہوتے" — حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانویؒ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے پیر بھائی اور حضرت میاں جی نور محمد صاحب کے خلیفۂ خاص تھے۔ حضرت حکیم الامت کے بچپن کے احوال و آثار ہی کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ "میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا" — حضرت حکیم الامت نے بچپن ہی میں ایک خواب دیکھا (جس سے پہلے کوئی خواب دیکھنا یاد نہیں) کہ بڑے مکان میں ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے جس میں دو خوبصورت کبوتر ہیں۔ پھر دیکھا کہ شام ہو گئی اور تاریکی چھا گئی۔ ان کبوتروں نے حضرت سے کہا کہ "ہمارے پنجرہ میں روشنی کر دو" حضرت نے کہا "خود ہی کر لو" چنانچہ انہوں نے اپنی چونچیں رگڑیں اور ساتھ ہی ایک تیز روشنی ہوئی جس سے سارا پنجرہ منور ہو گیا۔ ایک مدت بعد جب حضرت نے اپنا یہ خواب ماموں واجد علی صاحب مرحوم سے بیان کیا تو انہوں نے یہ تعبیر دی کہ "وہ دو کبوتر روح و نفس تھے۔ انہوں نے تم سے درخواست کی کہ مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کر دو۔ مگر تم نے جو یہ کہا کہ تم خود ہی روشنی کر لو، اور انہوں نے اپنی چونچیں رگڑ کر روشنی کر لی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ انشاء اللہ بلا ریاضت ہی حق تعالیٰ تمہاری روح اور نفس کو نورِ عرفاں سے منور فرما دیں گے" — چنانچہ مستقبل میں یہ خواب حقیقت بن کر ظاہر ہوا۔

حضرت مجدد الملت کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں اور حافظ حسین علی صاحب مرحوم دہلوی سے کلامِ پاک حفظ کیا۔ پھر تھانہ بھون آ کر حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ سے عربی کی ابتدائی کتابیں اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں اور اس کی کچھ انتہائی کتابیں ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادبِ فارسی کے کامل استاد تھے۔ پھر دیوبند پہنچ کر بقیہ نصاب

کی تکمیل مولانا منفعت علی صاحب سے کی اور زبان فارسی میں پورا عبور حاصل کیا۔ ایک مرتبہ اسی زمانۂ طالب علمی میں خارش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے میرٹھ سے گھر تشریف لائے تھے تو بطورِ مشغلہ فارسی اشعار پر مشتمل ایک مثنوی "زیر و بم" لکھی۔ جس سے فارسی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی۔ آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور پانچ سال تک یہاں مشغول تعلیم رہ کر شروع ۱۳۰۱ھ میں فراغت حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹۔۲۰ برس کے لگ بھگ تھی۔

طالب علمانہ حیثیت زمانۂ طالب علمی میں حضرت میل جول سے الگ تھلگ رہتے۔ اگر کتابوں سے کچھ فرصت ملتی تو اپنے استادِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہٗ (صدر مدرس مدرسہ دار العلوم دیوبند) کی خدمت فیض درجت میں جا بیٹھتے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو ہر فن میں ماہر ہونے کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلیفۂ رشید بھی تھے۔ ان کی اسی جامع حیثیت کی وجہ سے ان کا حلقۂ درس "حلقۂ توجہ" بھی ہوتا تھا۔ اور ذہن و قلب کی تعلیم و تربیت ایک ساتھ ہوتی تھی۔ افسوس کہ آج دینی درسگاہیں جامعیت فیض سے محروم ہیں —— حضرت والا کی ابتدا ہی کو دیکھ کر اہل بصیرت انتہا کا بتہ چلا چکے تھے۔

چنانچہ جب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ طلباء کا امتحان لینے اور دستار بندی کے لیے تشریف لائے تو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے اپنے اس ہونہار طالب علم کی ذہانت و ذکاوت کی بطورِ خاص مدح فرمائی۔ حضرت گنگوہیؒ نے مشکل مشکل سوالات کیے اور ان کے جواب سُن سُن کر مسرور ہوئے۔

حضرت اقدس کو علومِ عقلیہ سے خاص مناسبت تھی۔ فطرت نے حاضر جوابی، طلاقت لسانی اور ذہانت و فطانت کے جواہر سے پوری طرح آراستہ کیا تھا۔ منطق میں مہارت کا اعتراف یوں فرماتے تھے کہ "میں سچی بات کہوں، نہ کہوں۔ نہ میں متواضع ہوں نہ متکبر۔ الحمد للہ مجھے منطق میں مہارت حاصل ہے۔" چنانچہ دیوبند میں جب کوئی مذہبی مناظرہ کے لیے آتا تو فوراً اشرفی تلوار خلوت کے نیام سے باہر نکل آتی اور مخالف کو گھائل کر جاتی تھی —— لیکن طبیعت کے اعتدال کا یہ عالم تھا کہ معقولات کو ہمیشہ دینیات کے لیے علوم آلیہ سمجھتے تھے۔ آپ کی ہر تقریر و تحریر میں یہ جوہر نمایاں نظر آتا ہے۔ رأس المناظرین مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ (اُستاذ دار العلوم دیوبند) حضرت کی اسی نوعمری کی تقریروں پر وجد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "حضرت کو فنِ مناظرہ میں اس قدر کمال ہے کہ بڑے سے بڑا مناظر بھی نہیں ٹھیر سکتا۔" اور خود حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "جتنا شوق مجھے اس زمانہ (طالب علمی) میں مناظرہ کا تھا، اب اس کی مضرتوں کی وجہ سے اتنی ہی نفرت ہے۔"

—— علومِ عقلیہ و نقلیہ میں اس قدر رسوخ رکھنے کے باوجود تواضع کا حال قابلِ دید ہے۔ ۱۳۰۰ھ کا واقعہ ہے۔ خبر ملی کہ دستار بندی (تقسیم اسناد) کا جلسہ بڑے شاندار پیمانے پر ہونے والا ہے اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کے مقدس ہاتھوں یہ رسم طے پانے والی ہے، اپنے ہم سبقوں کو جمع کر کے اپنے استادِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی "حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی ہوگی اور سندِ فراغ دی جائے گی حالانکہ ہم ہرگز اس کے اہل نہیں۔ یہ تجویز منسوخ فرمائی جائے ورنہ اس میں مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی ہے۔" یہ سُن کر صاحبِ بصیرت استاد کو جوش آیا، اور فرمانے لگے "تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے استاد موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے باقی سارا میدان صاف ہے۔" —— دنیا نے دیکھا کہ یہ پیشین گوئی

شیخ دوراں سے تعلق اور حج بیت اللہ

گذر چکا ہے کہ مجدد الملت کی پیدائش ایک مجذوب حضرت حافظ غلام مرتضےٰ صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ اور انہی بزرگ نے آپ کا نام "اشرف علی" رکھا تھا۔ اور آخر وقت تک اپنی محبت و توجہ سے سرفراز کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ غیر شعوری طور پر حضرت میں عشق کی جلوہ آرائیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک بار قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے تو حضرت ایک ہی نظر میں گھائل ہو گئے۔ اشتیاق سے معانقہ کے لیے آگے بڑھے۔ شوق نے بے قابو کر دیا تھا۔ پاؤں بے اختیار پھسل پڑا۔ حضرت قدس سرہٗ گنگوہیؒ نے تھام لیا۔ گو بیعت اور اس کی حقیقت سے ناآشنا تھے مگر کشش اس بلا کی ہوئی کہ بیعت کی درخواست کر دی۔ حضرت قدس سرہٗ نے دورانِ تعلیم میں اس کو مناسب نہ سمجھا اور انکار فرما دیا لیکن خاطرِ اشرف میں یہ خیال بصورتِ حسرت برابر پرورش پاتا رہا اور رجب ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا گنگوہیؒ عازمِ حج ہوئے تو خود انہی کے ذریعہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں عریضہ گزارا "آپ مولانا سے فرما دیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں" نہ جانے دونوں عرفا میں کیا راز و نیاز رہا۔ بظاہر یہی ہوا کہ حضرت حاجی صاحب نے جواب میں خود ہی بیعت فرما لیا۔ اس وقت مجدد الملت کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔

حضرت مجدد الملت تو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ شیخ العرب والعجم قدس سرہٗ نے مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن جب بصیرت کی آنکھ کھل جاتی ہے تو زمان و مکان کے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ عارف باللہ حضرت حاجی صاحبؒ نے وہیں سے تھانہ بھون کے اس درِ شہوار کا جلوہ دیکھ لیا تھا۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ حضرت قدس سرہٗ نے آپ کے والد ماجد کو کہلا بھیجا تھا کہ "تم حج کو آؤ، اور جب آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو لیتے آؤ۔"

غرض شوال ۱۳۰۱ھ میں جب کہ مجدد الملت طالب علمی کی زندگی ختم فرما کر کانپور میں اشاعت علوم میں مصروف تھے۔ سفر حج کے سامان پیدا ہو گئے، (تفصیل کے لیے دیکھو اشرف السوانح) حضرت والا اپنے والد ماجد کی معیت میں زیارت حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوئے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ جب کسی ملاقاتی نے آپ کے والد ماجد سے سمندر کے تلاطم کا ذکر کیا تو فوراً کہہ اٹھے۔

چہ غم دیوارِ امت را کہ باشد چوں تو پشتی باں   چہ باک از موجِ بحر آں را کہ دارد نوحؑ کشتی باں

اسی جذبۂ اشتیاق سے مکہ معظمہ پہنچے۔ حضرت حاجی صاحب سے نیاز حاصل کیا۔ شیخ قدس سرہٗ بہت خوش ہوئے اور دستِ مبارک سے بیعت کی نعمت سے سرفراز کیا۔ بعد فراغِ حج خود فرمایا کہ "تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ" لیکن حضرت والا کے والد ماجد نے مفارقت گوارا نہ کی اور حضرت حاجی صاحبؒ نے بربنائے احترامِ شریعت فرمایا کہ "والد کی اطاعت مقدم ہے اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا۔" چنانچہ ۲۰ سالہ عمر میں پہلی بار فریضۂ حج سے فارغ ہو کر ۱۳۰۲ھ میں ہندوستان لوٹ آئے۔ دورانِ قیام مکہ معظمہ حضرت والا پر ارضِ پاک کا احترام و ادب اس درجہ غالب رہا کہ وہاں تھوکتے ہوئے بھی تامل ہوتا تھا۔ اور جس وقت بیت اللہ شریف پر پہلی بار نظر پڑی ہے، ایسی کیفیت شوقیہ و انجذابیہ پیدا ہوئی کہ خود فرماتے تھے: "ایسی کیفیت مجھ پر عمر بھر طاری نہیں ہوئی۔"

حج ثانی اور صحبتِ شیخ

عشق کی چنگاری تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ حضرت حاجی صاحبؒ کے تعلق نے اس کو خوب ہوا دی۔ اور ارضِ پاک کے قیام نے اس کو خوب بھڑکایا۔ لیکن واپسی پر پھر بھی اس شعلہ میں سوختہ سامانی کی صفت نہ آئی تھی۔ برابر مصروفِ درس و تدریس اور مشغولِ تقریر و تحریر رہے۔ سینکڑوں کو عالم بنایا اور ہزاروں کے دل میں دین کی

ادھر شیخ کامل سے خط و کتابت برابر جاری تھی اور توجہات شیخ برابر شامل حال تھیں
ملازمت بجائی اور اس کا سکہ جمایا ——
اندر ہی اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ ان احوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ۱۳۰۷ھ سے زندگی نے دوسرا پلٹا کھایا۔ باطنی شغل سے اس درجہ دلچسپی بڑھی کہ سارے
تعلقات سے دل سرد ہو گیا۔ اپنے شیخ سے ترک ملازمت کا مشورہ لیا مگر جواب ملا کہ: "نامہ بہجت شمامہ آں عزیز تیز رسید۔ از استماع حال
ذوق و شوق آثار ترقی فہمید۔ مسرت بر مسرت افزود۔ حق تعالیٰ برکت زیادہ کند۔ بہ خلق اللہ فیض دینی رسانیدن راہ قرب وصول الی اللہ است۔"
(مکتوب مورخہ ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ) حضرت اقدس نے حسب ارشاد مرشد درس و تدریس کو جاری رکھا اور ۱۳۱۰ھ تک ضبط و سکون سے
کام کرتے رہے لیکن اب شوق و اضطراب نے مجبور کر دیا اور اپنے شیخ کا ارشاد کہ "میاں اشرف علی تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ" کسی پہلو
چین نہ لینے دیتا تھا۔ عزم فرمایا اور راہ کھل گئی۔ پھر کیا تھا مکہ معظمہ کو چل نکلے۔ عجیب ذوق و شوق کا عالم تھا۔ قطب عالم حضرت حاجی صاحب تو
چاہتے ہی تھے کہ چھ مہینے کے لیے حضرت والا آجائیں، دیکھ کر اس درجہ مسرور ہوئے کہ گویا حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ گم گشتہ پھر ہاتھ آگئے، اور
بہت ہی عنایات و توجہات فرماتے رہے۔ اُدھر قوت افاضہ کا وہ حال اور اِدھر قابلیت استفاضہ اس درجہ۔ کچھ ہی عرصہ میں شاگرد و استاذ
مرید و پیر ہم رنگ ہو گئے۔ خود حضرت شیخ بے ساختہ فرماتے تھے کہ "بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔" جب مجدد الملت کی کوئی
تقریر نظر سے گزرتی یا تقریر سننے میں آتی تو بے اختیار کہہ اٹھتے: "جزاکم اللہ، تم نے تو بس میرے سینے کی شرح کر دی۔" علوم معارف سے متعلق
کوئی کچھ پوچھتا تو مجدد الملت کی طرف اشارہ کر کے فرماتے: "ان سے پوچھ لو، یہ خوب سمجھ گئے ہیں۔"

باطنی مناسبت تو خیر پیدا ہی ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ ظاہری مناسبت کے بھی آرزو مند تھے۔ مجدد الملت کے دوران قیام مکہ
آپ کی زوجہ محترمہ اور خالہ صاحبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ خالہ صاحبہ نے خدمت شیخ میں عرض کیا کہ "ان کے لیے صاحب اولاد ہونے کی دعا فرمائیے۔"
حضرت شیخ نے اپنے مرید رشید سے باہر آکر فرمایا: "تمہاری خالہ مجھ سے دعا کے لیے کہتی ہیں کہ تمہارے اولاد ہو۔ سو دعا تو میں نے کر دی
لیکن بھائی میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی تم بھی رہو۔ جو حالت میری ہے وہی حالت تمہاری بھی رہے۔" مجدد الملت نے عرض
کیا "جو حالت حضرت کو پسند ہے وہی میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔" یہ سن کر حضرت حاجی صاحبؒ بڑے مسرور ہوئے ——
اس سے قطب عالم قدس سرہٗ کے اس جذبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے قلب اطہر میں مجدد الملت کا کس درجہ لحاظ تھا اور کس طرح
اس امر میں پوری توجہ صرف فرما دی تھی کہ آپ کے مثنیٰ بن جائیں اور کبھی دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ "من دیگرم تو دیگری۔" یہ اختصاص کسی اور مرید
یا کسی اور خلیفہ کے حصہ میں نہیں آیا —— دوران قیام مکہ معظمہ مجدد الملت پر "توحید" کا انکشاف بدرجۂ کمال ہوا جو شریعت و
طریقت کی اساس اور درویشی کا ماحصل ہے اور جس کا لازمی نتیجہ "عبدیت" ہے جو سلوک کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ اور یہی وہ دولت ہے
جو حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہٗ کا خاص حصہ تھی —— غرض چھ مہینے سے ایک آدھ ہفتہ کم قیام کے بعد مجدد الملت نے
اپنے شیخ کامل سے رخصت چاہی۔ حضرت شیخ نے دو وصیتیں بطور خاص فرمائیں۔ (۱) "دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت
پیش آئے گی، عجلت مت کرنا۔" (۲) "کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا۔ توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔"
(گویا ۱۳۰۷ھ میں جس ترک تعلق سے منع فرمایا تھا اب بعد حصول "تمکین" خود اس کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں) ان وصیتوں اور باطنی
دولت کو لے کر حضرت مجدد الملت ۱۳۱۱ھ میں پھر واپس وطن لوٹ آئے۔

مجدد الملت مسندِ ارشاد پر

یوں تو ربیع ثانی کے بعد کانپور ہی سے رشد و اصلاحِ باطنی کا کام شروع ہو چکا تھا اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ بھی اپنے بعض بعض مریدین کو حضرت کی خدمت میں بھیجنے لگے تھے۔ اور پھر تھانہ بھون پہنچ کر زندگی اور مریدین کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی لیکن گزشتہ "مرحلہ ہیبت" کے تقریباً سال بھر میں اصلاحِ خلق کا سلسلہ رک گیا تھا اور خود آپ نے بھی اس کو یہ کہہ کر ملتوی کر دیا تھا کہ ایسی حالت میں کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جب اس شدید اور آخری مرحلے سے بھی اللہ تعالیٰ نے گزار دیا تو آپ مسندِ ارشاد پر پھر جلوہ فرما ہوئے اور تربیت کے کام میں ہمہ تن معروف ہو گئے۔ مولانا محمد محسن کاکوروی "مشہور نعت گو" کے فرزند مولانا انوار الحسن صاحب کاکوروی کا خواب درج ذیل ہے جس سے حکیم الامت کے منجانب اللہ اس مقام پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے "مجدد" ہونے کی بشارت ملتی ہے ——— خود تحریر فرماتے ہیں:-

"میں نے سفرِ حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہٗ کے متعلق ایک خواب دیکھا۔ حالانکہ اس زمانے میں مجھ کو حضرت مولانا سے کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی۔ البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا۔ اور میرا خاندان بھی علمائے اہلِ حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا بلکہ حضرت مولانا کا مجھ کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید بھی خیال نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیمارداری فرما رہے ہیں۔ اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہوئے دکھائی دیے رہے ہیں جن کے متعلق خواب ہی خواب میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں ——— آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضورؐ تو کیا بیمار ہیں حضورؐ کی اُمت بیمار ہے اور حضرت مولانا اس کی تیمارداری یعنی اصلاح فرما رہے ہیں لیکن وہ بزرگ طبیب جو دور بیٹھے نظر آ رہے تھے وہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون تھے۔ واپسی ہندوستان پر میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی وہ بھی لکھ دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ بزرگ طبیب کون تھے جو دور بیٹھے نظر آ رہے تھے حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں اور وہ ابھی زماناً بعید ہیں اس لیے خواب میں مکاناً بعید دکھائی دیے۔"

چنانچہ حضرت اقدسؒ نے قصبہ تھانہ بھون کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر، دولت و ثروت اور دنیویات کو ٹھکرا کے وہ بادشاہت کی جو کم کسی کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستان کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب سے لوگ پروانہ وار آئے اور اس شمع ضیا پاش سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق روشنی کے سامان حاصل کر گئے۔ وہ بھی آئے جن کی پیاس چشموں سے نہ بجھتی تھی اور یہاں آکر سیراب ہوئے۔ لوگوں اور مریدوں کی آمد کا یہ عالم تھا کہ قصبہ تھانہ بھون کے لیے ایک مستقل ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا۔ اور خانقاہ امدادیہ کی "دکانِ معرفت" پر خریدارانِ علم و عرفان کا وہ ہجوم ہوا جو حضرت نظام الدین اولیاؒ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) رحمۃ اللہ علیہ کے بعد تاریخ ہند میں شاید اپنی نظیر آپ تھا۔ مریدین و معتقدین سینکڑوں نہیں ہزاروں تھے صرف "مجازین" ہی کی تعداد (۱۲۹) ہے۔ جس میں (۷۰) مجازین بیعت یعنی خلفاء ہیں اور (۵۹) مجازینِ صحبت ہیں جن کو بیعت کی تو اجازت نہیں لیکن تبلیغ کی اجازت حاصل ہے پھر مذکورہ (۷۰) خلفاء نہ صرف وہ ہیں جو کتابی علم دین میں کم دسترس رکھتے ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے اساتذۂ کامل ہیں جیسے مرشدی حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ مہتمم مدرسہ جامع اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہٗ مہتمم خیر المدارس ملتان، حضرت مولانا ظفر علی صاحب سلمٰی مدظلہٗ، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کامل پوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور (بہبودی ضلع کامل پور)

کی درمیانی رات ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۱ دن کی عمر پاکر ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ فاناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس سانحہ عظیم کی اطلاع ہوا کی طرح پھیلی۔ اور بن کر عشاق کے قلوب پر گری۔ صبح ہوتے ہوتے ہزاروں محبت کے مارے جو پہلے سے

در ہوائے کوئے جاناں میروم سرخوش و شاداں و رقصاں میروم

اوحکیم الامت و من جاں بلب در حضورش بہر درماں میروم

کے نغموں سے مست و سرشار چلے آتے تھے۔ آج فریادی اشکوں کے ساتھ آئے کہ سے

سیر و سینا بصحرا میبردی سمت بیہری کو بے ما میبردی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میبردی

دہلی اور دوسرے شہروں سے سپیشل ٹرینیں آئیں۔ اور ہزاروں شیدائیوں کے ساتھ مجدد الملت رحمۃ اللہ تعالیٰ کا جنازہ نکلا۔

ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

عید گاہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ میں جس کا تاریخی نام "قبرستان عاشق باز اں" تھا۔ جسم مبارک کو پیوند خاک کیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ۔ سنا ہے کہ جو شریک جنازہ تھے ان کو پھر بھی چین و سکون آیا۔ لیکن جن کی نسبتیں "اویسی" ہی تھیں ان کی آتش فراق ایک عرصہ میں جاکر فرو ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی کر سکے گا جس نے کبھی عشق حقیقی کی چوٹ کھائی ہو۔ زبان قلم اس حسی کیفیت کے اظہار سے عاجز ہے

ع اے آتش فراقت جانہا کباب کردہ

سے سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ؛ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

شہاداتِ انام

گو بفضلہٖ تعالیٰ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات علمیہ وعملیہ و حالیہ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن اور ایسے مشہور زمانہ ہیں کہ ان کے لیے اب کسی شہادت کی حاجت نہیں۔ بالخصوص شہادت انام کی۔ بمصداق ع آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ لیکن صحیح بخاری و مسلم حدیث انتم شہداء اللہ فی الارض جو ایسے ہی موقع پر ارشاد کی گئی تھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اگر کسی کے مرنے کے بعد عام طور سے لوگ اس کی تعریفیں کریں تو اس کی توقع ہے کہ وہ عند اللہ بھی اچھا تھا۔ کیونکہ حسب ارشاد نبوی انتم شہداء اللہ فی الارض عامۃ الناس بھی زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہی مضمون ایک روایت میں یوں آیا ہے۔ للہ ملائکۃ تنطق علی السنۃ بنی آدم مافی المرء من الخیر والشر (فتح الباری ج ۳ ص ۱۷۵) یعنی اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتے متعین فرما رکھے ہیں کہ وہ انسان کا خیر و شر لوگوں کی زبان پر جاری کر دیں نیز اپنے محبوب کی ہر کس و ناکس سے تعریفیں سن کر محبین کو خوشی بھی ہوتی ہے جس کی ان کو اس غم میں ضرورت بھی ہے اس لیے سینکڑوں واقعات اور تحریرات میں سے جو سننے یا دیکھنے میں آئیں صرف چند ہی بطور نمونہ پیش ہیں۔

ملک کی جتنی مسلم جماعتیں ہیں جن میں وہ بھی شامل ہیں جن کو حضرت سے کچھ سیاسی یا مشربی اختلاف بھی تھا۔ قریب قریب سب نے بالاتفاق اس خسارہ کو خسارۂ عظمیٰ محسوس کیا۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ تقریریں ہوئیں اور تقریروں کے وقت بعض مقررین وسامعین کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ریزولیشن پاس ہوئے۔ فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی ہوئی۔ بعض بعض جگہ مدارس بند ہوئے بلکہ دکانیں بھی بند ہوئیں اور بعض جگہ اس ڈر سے کہ کہیں ناجائز نہ ہو اس ارادہ پر عمل کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ آزاد لوگ تھے۔ لیکن حضرت اقدس کی دینی شخصیت کا اتنا اثر سب پر تھا کہ خود بھی حضرت کے معاملہ میں احتیاط کے خلاف کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اکثر جگہ بہت بہت ایصال ثواب کیا گیا۔ پانی پت سے اطلاع ملی کہ

۲۱ یا ۲۲ قرآن شریف ختم کیے گئے۔ وہاں حفاظ کی بہت کثرت ہے۔ متعدد جگہ تقسیم طعام کے ذریعہ بھی ایصال ثواب کیا گیا۔ غرض اپنے اپنے خیال اور مشرب کے مطابق سب ہی نے اظہار غم اور ایصال ثواب کیا۔ تمام ملکی جرائد میں جن میں غیر مسلم بھی تھے اس خبر کو خاص اہمیت کے ساتھ شائع کیا۔ بلکہ جہاں تک ملنے میں آیا اب سے پہلے ایک غیر مسلم اخبار ہی نے اس خبر کو بہت اچھے عنوان کے ساتھ شائع کیا ——

حضرت اقدس کی علالت ہی کے زمانہ میں جس نے سنا دل سے دعا دی اور تمنا ظاہر کی کہ اجی وہ تو بڑے شخص ہیں خدا کرے جلد اچھے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کے بھی یہی الفاظ ہوتے تھے۔ ایک بہت بوڑھے شخص نے جو مسلمان تھا اور جس نے کبھی حضرت اقدسؒ کی زیارت بھی نہ کی تھی جب خبرِ وفات سنی تو بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا کہ اجی ان کی کیا بات تھی! اگر کسی مسئلہ کی ضرورت ہوتی تو پہلے ڈھونڈتے پھرتے تھے اور کوئی مسئلہ بتانے والا نہ ملتا تھا۔ اور اب ہمارے گھر کی لونڈیاں بھی بہشتی زیور دیکھ کر بتا دیتی ہیں۔

بعض جرائد نے یہاں تک لکھا تھا کہ اگر مولانا اپنی تصانیف کی رجسٹری کر لیتے اور خود اشاعت کرتے تو آج کم از کم چالیس پچاس لاکھ روپیہ چھوڑ کر جاتے۔ بعض نے اپنے الفاظ میں لکھا کہ بے نظیر ہستی تھی اور اب صدیوں ایسی ہستی دنیا نہیں پیدا کر سکتی۔ بعض نے لکھا کہ متعدد کتابیں تو ایسی تصنیف کی ہیں کہ جن کی نظیر سلف میں بھی نہیں پائی جاتی۔ بعض نے لکھا کہ مولانا نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، ان کی اولاد ان کی تصانیف کثیرہ ہیں! ——

چنانچہ رسالہ "البرہان" دہلی ماہ اگست ۱۹۴۳ء میں اس حادثہ کا اظہار مضمون ذیل میں کیا گیا۔

آہ حکیم الامت!

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ یوں تو موت اس عالم آب و گل کی ہر اس چیز کے لیے ہی مقدر ہے جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوتی ہے لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں جو صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں بلکہ ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عمارتِ حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت و ارادات سے وابستہ ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہ ہائے اشک سے نہیں ہوتا بلکہ ہزاروں دلوں کی پرسکون آبادیاں ایک مستقل غم کدۂ آمال و امانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امیدوں اور ولولوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آتش کدے سرد ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثۂ جانکاہ نے کائناتِ عالم کی ہر ہر چیز کو اداس اور غمگین بنا دیا ہے اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا ؎

وما كان قيس هلكه هلك واحد ۔۔ ولكنه بنيان قوم تهدما

"قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں بلکہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو منہدم ہو گئی" گزشتہ ماہ جولائی کی ۱۹۔۲۰ کی درمیانی شب کو تقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کا جو سانحۂ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا۔ حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے۔ طریقت اور سلوک میں بھی مقام رفیع کے مالک تھے ان کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی۔ علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں۔ اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے اور کرتے تھے۔ اور اس میں انہیں کسی لومۃ لائم کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا آستانہ بڑے بڑے ارباب ثروت و دولت اور اصحاب علم و فضل کی عقیدت گاہ تھا۔ جو بات اور جو عمل تھا اخلاص اور دیانت کے ساتھ تھا۔ دنیوی وجاہت و شہرت اور مالی حرص و آز کا شاید دل کے آس پاس بھی کہیں گزر نہ ہوا تھا۔ اپنے اصول اور اپنے عقیدے و خیال پر اس مضبوطی و پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی۔ حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا چشمۂ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب

ہو کر جاتے تھے۔ وہ جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیاں آلودگی میں بسر ہوتی تھیں یہاں سے پاک و صاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامان
آرزو بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ ان کی زندگی اتباع سنت کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت کا دفتر گرانمایہ تھی۔ بعض مسائل میں
علمائے ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف[عہ] رہا۔ لیکن تقویٰ و طہارت، تفقہ فی الدین، شرعی علوم میں مہارت و بصیرت، راست گفتاری
اور مخلصانہ عمل کوشی، انابت الی اللہ، بے لوث خدمت دین، بے غرضانہ تلقین رشد و ہدایت۔ حضرت مرحوم کے یہ اوصاف عالیہ اور فضائل حمیدہ تھے
جو ہر موافق و مخالف کے نزدیک برابر مسلم رہے۔ بعض عوارض و اسقام کی بنا پر گوشہ نشینی سے قبل اپنے مواعظ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ
حضرت مرحوم نے اصلاح عقائد و اعمال اور ابطال رسوم و بدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد
طرۂ امتیاز ہے۔ قوم نے ان کو **حکیم الامت** کا خطاب دیا تھا اور بالکل وہ بجا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور
تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا جو خزف ریزے تھے وہ گوہر آبدار بن گئے اور جو صرف پیتل تھے وہ
زر خالص ہو گئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سو سے اوپر
بیان کی جاتی ہے جن میں سے کثیر تصنیفات ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور غالباً
اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ مولانا کی تصنیفات جو اب تک طبع ہو چکی ہیں ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیر چشمی اور
فیاضی، خلوص اور للہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق
اشاعت و طبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذن عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف
یہ ایک عمل ہی ایسا ہے جو آج کل کے بڑے بڑے نامور علماء کے لیے سرمایۂ عبرت اور درس موعظت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے لیے
مخصوص نہیں۔ علماء اور فضلاء، ارباب شریعت اور اصحاب طریقت، مرد اور عورتیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اردو خوان ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا ہے
اور اپنے لیے اصلاح ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کے علاوہ ایسا عجیب و غریب منطقی اور عقلی
استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق و تائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے ہیں نہایت وثوق اور یقین کے
ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریریں اور ان کی گفتگو میں غیر معمولی ذکاوت و فطانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور
ہر معاملہ کی اصل حقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لیے تفسیر بیان القرآن اور شرح مثنوی مولانا روم اور عورتوں کے لیے بہشتی زیور آپ کی ایسی گراں بہا اور کثیر الشیوع
تصنیفات ہیں کہ جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور موخر الذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہوئی
ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اردو خواندہ ہو گا جس نے کم از کم اس کا نام نہ سنا ہو۔

عہ یہ سیاسی اختلاف تھا کہ اول خلافت کمیٹی اور پھر کانگریس میں علمائے ہند کی ایک جماعت شریک رہی اور حضرت مولانا دونوں کے خلاف رہے اور جس طرح حقیقی مبارزہ میں
کافروں سے امداد لینے کی اجازت نہیں۔ اس سیاسی جنگ میں بھی ان کے نزدیک اجازت نہ تھی۔ اس کے ثمرات پر اس وقت لوگوں کی نظر نہ ہو سکی تھی مگر ہم نے دیکھ لیا کہ حق وہی تھا کہ مسلمان
جو کچھ کرے خدا پر بھروسہ کر کے کرے۔ کافروں کے آگے دست سوال دراز کرنے سے دونوں جہان کا خسارہ ہے لیکن یہی نظریہ حقیقت میں پاکستان کا ثمرہ لے آیا ہے۔ ۱۲ ج۔

اس سے کام نہیں لیا۔
تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے۔ اور کم تر کتب درس کے متعلق۔ تاہم دو چار درسی کتابوں پر بھی رسائل ہیں۔ مذہبی تصانیف میں علوم القرآن علوم الحدیث ___ کلام و عقائد ___ فقہ و فتاوی اور سلوک و تصوف اور مواعظ اکثر ہیں۔

قرآنِ پاک کی خدمت

اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک۔ مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی۔ وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانۂ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے۔ وہاں سب سے پہلے مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللھم علمہ الکتاب کی دعا دی تھی۔ اور بشارت سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس رؤیا کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور رؤیا اسی کی طرف اشارہ تھا۔ قرآن پاک کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی، بلکہ لفظاً و معنےً دونوں حیثیتوں سے۔ وہ حافظ تھے اور بڑے جید حافظ۔ وہ قاری تھے اور فنون تجوید و قرأت کے بڑے ماہر۔ آخیر زمانہ میں پانی پت کو قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتیؒ کی برکت سے قرأت سے ایک خاص مناسبت حاصل ہو گئی تھی۔ مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالقصد جہری نماز میں امام بنا دیا۔ مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر قرأت فرمائی مگر قاریوں نے تعریف کی کہ صحت مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر مؤثر قرأت نہیں سنی۔ ایک اور مقام پر صبح کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب نے کہا کہ موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیرویں کی کیفیت تھی۔ جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قرأت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی لیکن لہجہ میں عام قاریوں کی طرح بناوٹ نہ تھی اور نہ تحسین آواز کے لیے بتکلف اتار چڑھاؤ ہوتا تھا، بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسبِ موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی، کہ ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

تجوید و قرأت و متعلقاتِ قرآنی

علوم القرآن میں یہ پہلا فن ہے۔ مولانا نے اس پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں:-

۱- جمال القرآن :- یہ فنِ تجوید کا رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل یعنی مخارج اور صفاتِ حروف، اظہار و اخفاء، ابدال و ادغام، تفخیم و ترقیق، وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

۲- تجوید القرآن :- اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لیے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔

۳- رفع الخلاف فی حکم الاوقاف :- اوقاف قرآنی کے بارے میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے۔

۴- وجوہ المثانی :- اس میں قرآن شریف کی مشہور قرأتوں کے اختلاف کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے۔ اور اخیر میں تجوید و قرأت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں۔

۵- تنشیط الطبع فی اجراء السبع :- قرأت سبع اور اس فن کے رواۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

۶- زیادات علی کتب الروایات :- اس میں قرأت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں۔ یہ "وجوہ المثانی" کے اخیر میں بطور ضمیمہ ہے۔

۷- وثاقات لمانی الروایات :- یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے۔

۸- یادگار حق القرآن :- اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔ یہ "تجوید القرآن" کا اختصار اور ضمیمہ ہے۔

۹- متشابہات القرآن لتراویح رمضان :- قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہیں

احیاء السُّنن کا احیاء

۱۳۳۱ھ میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ حضرت والا خود اس کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے یہ قرار پایا کہ اس کے لیے بعض مستند علماء کو رکھ کر کام لیا جائے۔ چنانچہ مولانا احمد حسن صاحب سنبھلی کو اس کام کے لیے مقرر کیا گیا۔ انہوں نے کام شروع کیا۔ جو کام کرتے جاتے۔ مولانا کی نگاہ سے گزارتے جاتے تھے۔ اس طور کتاب الحج تک کام ہوا۔ اور اس کا "دوبارہ احیاء السُّنن" رکھا گیا تاکہ مرحوم احیاء السُّنن کی یادگار رہے۔ اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسباب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے مولانا کی تشفی نہیں ہوئی اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا اور آئندہ کام کے لیے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی مدظلہٗ کا انتخاب ہوا۔

الاستدراک الحسن

مولانا ظفر احمد صاحب نے مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی او وسعت نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا۔ سب سے پہلے احیاء السُّنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کو "استدراک الحسن" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اعلاء السُّنن

اس کے بعد "احیاء السُّنن" کے نام کو بدل کر "اعلاء السُّنن" کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا۔ اور اس وقت تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں مذہب حنفی کی موید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہلِ فن کی تحقیقات کے شروح و حواشی میں یکجا کی گئی ہیں۔

الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ

جمعہ و عیدین کے خطبوں میں اس درجہ تکلف و تصنع اور مضامین کی ابتذال سے کام لیا گیا ہے کہ یہ بازاری خطبے زبان اور طرز ادا اور مضامین و مطالب کے لحاظ سے عہد نبوت اور خلافتِ راشدہ کے اسلوب سے ہٹ کر بلغاء اور خطباء کے اظہار قابلیت کا دنگل بن کر رہ گئے ہیں۔ مجدد الملت کی اصلاحی نظر سے محراب و منبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہیں رہا۔ چنانچہ "الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ" کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ تاکہ خطبائے مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان تخفات بارده کے گناہ سے محفوظ رہیں۔

خُطبات الاحکام

جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبوں کا یہ مجموعہ تالیف فرمایا۔ جس میں احادیث و آیات سے ترغیب و ترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد و اعمال و اخلاق کے مضامین درج فرمائے۔

مُناجات مقبول

احادیث میں وارِد اَوراد و اذکار مسنونہ کے لیے "حصن حصین"، "حزب اعظم ملا علی قاری" وغیرہ کتابیں رواج پذیر ہیں۔ مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں۔ حضرت مجدد الملت نے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ان سب سے تلخیص کر کے "مناجات مقبول قربات عند اللہ و صلوٰۃ الرسول" کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف فرمایا ہے۔ جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے حد مقبول ہے۔

عُلومُ الفِقہ

مجدد الملت رح کو مسائل فقہیہ کی تلاش و تحقیق کا خاص ذوق تھا اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ و اساتذۂ کرام سے ورثہ میں ملا تھا چنانچہ ابھی وہ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح نے ان سے فتوی نویسی کی خدمت لینا شروع کر دی تھی۔ اگر حضرت مجدد الملت رحمہ اللہ کی فقہی خدمات کا آغاز ۱۳۰۱ھ سے بھی لیا جائے تو ۱۳۶۲ھ تک بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے ساٹھ سال اس فنِ شریف کی خدمت میں بسر کیے۔ اس طویل عرصہ میں ہزاروں مسئلوں کے جواب دیے۔ ہزاروں فتوے اور سینکڑوں

چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے۔ متعدد ضخیم جلدوں میں امداد الفتاویٰ اور تتمہ امداد الفتاویٰ کے نام سے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتاوے کے مجموعے جمع کئے گئے ہیں جس کی نظیر ہندوستان میں کم از کم نہیں ملتی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ

حوادث الفتاوے: کے نام سے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو اس زمانے کے نئے مسائل اور نئے مصنوعات سے متعلق ہیں۔ جن کے جوابات گزشتہ کتب فتویٰ سے بآسانی حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

ترجیح الراجح: یہ وہ مجموعہ ہے جس کی مثال سلف صالحین میں تو ملے گی، مگر متاخرین کے یہاں یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت مجدد الملت نے اپنے ان مسائل کو جمع فرما دیا ہے جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا تو اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی۔ یہ سلسلہ حضرت کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بین ثبوت ہے۔ یہی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حضرات تابعین و تبع تابعین، اور مجتہدین عظام کا طریق تھا جس کو اس زمانہ میں حضرت مجدد الملت نے زندہ کیا اور اپنے کو بارِ آخرت سے بچایا۔

مکمل امداد الفتاویٰ کی از سرِ نو تبویب و ترتیب اہم خدمت

حضرت کے فتاویٰ اس زمانہ کے فتاویٰ میں مستند مطلق اور علماء ہند کا معتمد علیہ، ضروریاتِ زمانہ پر گہری نظر، نئے حوادث، جدید معاملات اور آلاتِ جدیدہ سے متعلقہ مباحث میں بے نظیر ہے۔ اس وقت اس کی اشاعت گیارہ حصوں میں اس طرح ہوئی تھی کہ چار مستقل جلدیں۔ پانچ تتمے۔ ایک ترجیح الراجح۔ ایک حوادث الفتاویٰ۔ اور آخری زمانہ کے فتاویٰ کچھ ماہوار رسالہ النور میں شائع ہوئے کچھ قلمی رجسٹر میں محفوظ تھے جو بارھواں حصہ ہوتا۔ سلسلۂ فتاویٰ جاری رہنے کے سبب ان تمام حصوں کی تبویب و ترتیب یکجائی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے ایک مسئلہ کے متعلقہ مباحث تمام حصوں میں منتشر اور ایک دوسرے پر موقوف تھے جس سے استفادہ آسان نہ تھا۔ اس وقت سیدی و سندی مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی دامت فیوضہم خلیفہ خاص حضرت ممدوح نے تمام کتاب کے بارہ حصوں کو محنتِ شاقہ برداشت کر کے ابوابِ فقہیہ پر مرتب کیا جس کی چند خصوصیات یہ ہیں:- (۱) ایک مسئلہ کے متعلق جتنے فتاویٰ مختلف جلدوں میں تھے یا ترجیح الراجح میں اس کی بحث تھی اس کو یکجا کر دیا۔ (۲) ہر مسئلہ کے ساتھ طبع قدیم کی جلد اور صفحہ کا حوالہ لکھا۔ (۳) جن مسائل میں متعدد فتاویٰ بظاہر متعارض نظر آئے اور ترجیح الراجح میں اس پر کلام نہیں، ان کی تطبیق یا ترجیح کے لیے حاشیہ میں توضیح کی گئی۔ (۴) جن مسائل میں کوئی ابہام یا اغلاق تھا ان پر حواشی لکھ کر واضح کیا گیا۔ (۵) ترتیب میں قدیم طرز کے ابوابِ فقہیہ کے ساتھ اہم مسائل کے لیے جدید عنوانات و فصول بھی قائم کر دیے۔ (۶) ہر جلد کے فتاویٰ پر ترتیبی نمبر ڈال دیے (۷) فہرست مضامین نہایت مکمل اور واضح لگائی گئی وغیرہ وغیرہ اس کی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ کل غالباً چھ ہوں گی۔

فتاوے اشرفیہ کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ شائع ہوئے جو مختصر رسائل ہیں۔

بہشتی زیور کی دس جلدیں جو گو عورتوں کی ضروریات کے لیے ہیں مگر ان میں اسلامی معلومات کا مکمل ذخیرہ ہے۔ اور ان میں پیدائش سے لے کر مرنے تک کے تمام حالات و مسائل جو ہر مسلمان کو پیش آتے ہیں مکمل طور پر درج ہیں۔ حقیقت میں بہشتی زیور دینی و دنیاوی معلومات کا مکمل کورس ہے۔

بہشتی گوہر
بہشتی زیور کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے جس میں خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں جیسے جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ۔

الحیلۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزہ
جس میں مظلوم و مصیبت زدہ عورتوں کی مشکلات کا شرعی حل۔ جن عورتوں کے شوہر مفقود یا مجنون ہو جائیں یا نامرد ہوں یا باوجود قدرت رکھنے کے نان و نفقہ نہ دیں اور طلاق و خلع پر بھی آمادہ نہ ہوں، ان کی خلاصی کے لیے شرعی صورتیں، نیز جن صورتوں میں عورتوں کو اپنا نکاح باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ملتا ہے۔ ان کے تفصیلی احکام مرتد ہو جانے کی صورت میں فسخِ نکاح ہونے نہ ہونے کی مکمل بحث فرمائی ہے۔ ان کے علاوہ مسئلہ حجاب، مسئلہ ربا، مسئلہ رشوت، مسئلہ بنک، سینما اور فلم اور ریڈیو وغیرہ کے مسائل پر فقہی تحقیقات ہیں اور بعض موضوعوں پر باربار کئی رسالے تالیف فرمائے۔

علم کلام
علم کلام و عقائد و توحید پر متعدد رسالے تصنیف فرمائے جو شائع و ذائع ہیں خاص نئے زمانے کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں اور دوسروں سے ترجمہ کرائیں۔ مثلاً "اسلام اور سائنس" کے نام سے **الحصون الحمیدیہ** کا مولانا اسحاق صاحب سے ترجمہ کرایا۔ یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف علامہ جسری ہیں جنھوں نے سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں اس کو ملک شام میں تصنیف فرمایا تھا اور جو نئے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویل فاسد کا دروازہ نہیں کھولا گیا ہے۔

المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ
تین حصوں میں ترتیب پایا ہے۔ جس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حِکَم بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں نماز و زکوٰۃ، دوسرے حصے میں روزہ، عیدین، صدقۂ فطر، قربانی، حج، نکاح و طلاق، غلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے حصہ میں خرید و فروخت و معاملات، حدود و قصاص، فرائض، عذاب قبر اور معاد کے متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں۔

الانتباہاتُ المفیدہ عن الاشتباہاتِ الجدیدہ
یہ بھی علم کلام کا باب ہے۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی خدشوں اور وسوسوں کے تشفی بخش جوابات درج ہیں۔

اشرفُ الجواب
یہ بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو مواعظ و ملفوظات سے جمع کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سے نئے اور پرانے شبہات و خطرات کے جوابات فراہم کئے گئے ہیں۔

علم سلوک و تصوّف
علم سلوک و تصوّف روحِ شریعت کا نام ہے جس میں اخلاصِ دین اور اعمالِ قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے۔ قدما صوفیہ نے اس فن پر جو کتابیں لکھی ہیں مثلاً قشیریہ امام قشیریؒ، قوت القلوب ابوطالب مکی، کتاب اللمع ابونصر عبداللہ بن علی سراج الطوسیؒ، کتاب الصدق، ابوسعید خرازؒ، فتوح الغیب شیخ سہروردیؒ، اور غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور متاخرین میں تصانیف امام شعرانی۔ ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مصنوعی اور دکاندار صوفیہ اور مبتدعہ کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ تو بدعات کا نمونہ، بلکہ بطلان و ضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر ہندوستان میں ہندوؤں کے جوگ اور ویدانت کے اثر سے اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہو گئے جو اسلام کی روح کے تمام تر منافی یا بے معنی کہ وحدت وجود، وحدتِ شہود و لطائف و دوائر کے مباحث و اعمال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہیں۔ جو یا تو علم کلام و فلسفہ یا اوہام و

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

حضرت مجدد الملتؒ کی معرفت اس تیز و تند شراب کے "سائغ واثم" سے پوری طرح باخبر تھی۔ حضرتؒ نے "عرفانِ حافظ" کے نام سے اس کی ایسی شرح لکھی کہ اس پھول سے کانٹا الگ ہوگیا۔ ع

ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

ذاکرین، طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کے لیے "تربیۃ السالک و تنجیۃ الہالک" کا سلسلہ الگ مرتب فرمایا جس میں سالکین کی مشکلاتِ راہ، شاغلین کے شبہات و خطراتِ راہ کے لیے ہدایات مندرج ہیں۔ یہ کتاب ے جانہیں کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوالِ شخصی پر ایسی حاوی کتاب کی نظیر تصوف کے سارے دفتر میں موجود نہیں ۲، ۷، ۱۲ اصفحوں میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے

ایک دوسرا اہم سلسلہ "ملفوظات" کا ہے۔ بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کی رسم قدیم زمانے سے قائم ہے۔ یہاں تک کہ چشتیہ حضرات میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ملفوظات بھی موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ اہلِ شوق اس کام کو پورے استیعاب سے نہ کر سکے کیونکہ ان اکابر کے جو ملفوظات قلمبند ہو سکے وہ چند سال بعد بلکہ چند ماہ سے زیادہ کے نہیں ہیں اور ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والوں نے ان کو ان بزرگوں کی نظرِ کیمیا اثر سے گزارنا بھی تھا۔ تاہم چونکہ لکھنے والے خود اہلِ کمال و اہلِ احتیاط تھے اس لیے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لیے بڑی خیر و برکت کی چیزیں ہیں۔

حضرت مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ مجلدات اور رسائل میں مدون ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کی نظر سے گزار کر چھاپا گیا ہے اور جن میں سے اکثر "حسن العزیز" اور "الافاضات اليومیہ"[ع] وغیرہ نام سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان ملفوظات میں بزرگوں کے قصے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائل فقہیہ کے بیانات، سلوک کے نکتے، اکابر کے حالات، طالبوں کی ہدایات و تنبیہات، آداب و اخلاق کے نکات، اصلاحِ نفس و تزکیہ کے تجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل اور دماغ دونوں آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

اصلاحیات

حضرت مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کا یہ آخری باب ہے اور خاصا اہم باب ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی جو دقیق نظر ان کو بارگاہِ الٰہی سے عنایت ہوئی تھی اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں، عورتوں سے لے کر مردوں اور علماء و فضلاء کے حلقے تک پھیلا ہوا ہے اور سب کے لیے مفید ہدایات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔

دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس، اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی و غمی کے سوم اور روزمرہ کی زندگی تک کو وہ محیط ہیں۔ غرض ایک مسلم جدھر اپنی زندگی میں رخ کرے ان کے قلم نے شریعت کی ہدایت کا پروگرام تیار کر رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت کی سب سے اہم چیز "مواعظ" ہیں۔ واعظ تو بحمد اللہ زمانہ خیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بے شمار

ع یہ کتاب نو جلدوں میں چھپی ہے اور "حسن العزیز" ۴ جلدوں میں ۱۲۔

اس پر وہ لوگ بڑے حیران ہوئے کہ بڑے بڑے مشائخ علماء اور لیڈر تو جہاں جاتے ہیں روانہ ہونے سے پہلے اخبارات کے ذریعے اپنے پروگرام سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ شایانِ شان استقبال ہو۔ اور ان اپنے پروگرام کو شہرت دینے اور استقبال کرنے والوں کے ممنون ہوتے ہیں اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔

زیارتِ مزارات

قیام لاہور کے دوران میں آپ سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بغرض فاتحہ خوانی تشریف لے گئے آپ وہاں صبح کو ایسے وقت پہنچے۔ جب کہ زائرین کی کثرت تھی۔ آپ حسبِ معمول صاحبِ مزار کی پائینتی کی طرف قدرے ہٹ کر ہاتھ چھوڑے کھڑے کھڑے ایصالِ ثواب میں مشغول ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب حضرت کے پیچھے کھڑے تھے۔ کہ حضرت کو اس حالت میں کھڑے دیکھ کر ایک قوی ہیکل مجاور نے زوردار ہیبت ناک آواز سے پکار کر ہاتھ آگے باندھو مگر حضرت کو آواز کی طرف مطلق التفات نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اُس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور تند آواز میں یہی پکارتا رہا اور ہر مرتبہ اپنی آواز کو پہلے سے بلند کرتا رہا۔ لیکن حضرت بدستور ادھر متوجہ رہے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ حضرت داتا گنج بخش:

"بہت بڑی شخصیت ہیں۔ عجب رعب ہے وفات کے بعد بھی سلطنت کر رہے ہیں"

دوسرے روز صبح کے ناشتہ کے بعد آپ جہانگیر کے مقبرہ پر تشریف لے گئے۔ نور جہاں کے مزار کو دیکھ کر فرمایا کہ اوّل یہیں چیں ہو ہم تو اس قبر پر کم آئے ہیں گے۔ وہاں سے ہو کر جہانگیر کے مزار پر تشریف لے گئے۔ بعد ازاں لاہور کے دیگر تاریخی مقامات شاہی مسجد۔ قلعہ۔ شالامار باغ۔ خانقاہ میاں میر وغیرہ کو دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب ان کی تاریخی حیثیت۔ تاریخی واقعات وحالات بتاتے گئے اور حضرت ہر چیز پر محققانہ نظر دوڑاتے گئے اور اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔

محصول کی ادائیگی

آپ بلا ادائے محصول کوئی چیز نہ لے جاتے اگر ذرا بھی کسی چیز میں شبہ ہوتا کہ یہ مقررہ وزن سے زائد ہوگی تو آپ اُسے فوراً وزن کراتے اور اس کا محصول ادا کرتے۔ اس کا اتنا اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جاتے ہوئے کچھ گنے ساتھ تھے۔ جب ادائیگی محصول کے لئے تلوانے لگے تو کوئی تولنے والا نہیں۔ یہاں تک کہ غیر مسلم ملازمین ریلوے بھی کہیں کہ حضرت آپ یونہی لے جائیے۔ تلوانے کی ضرورت نہیں ہم گارڈ کو کہہ دیں گے۔ فرمایا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ کہا گیا غازی آباد تک فرمایا غازی آباد سے آگے کیا ہوگا۔ کہا گیا یہ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ اور وہ کانپور تک پہنچا دے گا۔ جہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا فرمانے لگے نہیں۔ وہاں ختم نہ ہوگا۔ بلکہ آگے ایک اور سفرِ آخرت بھی ہے وہاں کا انتظام کیا ہوگا۔ یہ سن کر سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ جن میں تعلیم یافتہ ہندو بابو بھی تھے۔ کہنے لگے کہ اس زمانہ میں بھی خدا کے ایسے ایماندار بندے موجود ہیں جو خدا سے ڈر کر احتیاط کرتے ہیں۔

کرایہ کی ادائیگی

اس میں بھی آپ بڑے محتاط تھے۔ بلا ٹکٹ اور بلا ادائے کرایہ سفر کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے۔ نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیتے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم حضرت کی زیارت کے لئے تھانہ بھون آیا۔ آپ اُس وقت سفر پر جا رہے تھے۔ اس لئے وہ تنگیٔ وقت کی وجہ سے گارڈ کو کہہ کر بلا ٹکٹ حضرت کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اور دوسرے اسٹیشن نانوتہ پر گارڈ کو کرایہ دینے لگا۔ تو اُس نے کہا معمولی کرایہ ہے تم غریب آدمی ہو جاؤ۔ اُس نے آکر حضرت سے کہا کہ معاملہ یہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ گارڈ ریلوے کمپنی کا ملازم ہے۔ ریل کا مالک نہیں ہے۔ اس لئے یہاں تم کرایہ برابر تمہارے ذمہ ہے داموں کا ٹکٹ لے کر اُسے پھاڑ دو تاکہ کمپنی کا حق ادا ہو جائے۔ اور تم حق العباد سے بری ہو جاؤ اس ڈبے میں ایک انگریزی خواں آریہ سماجی بھی بیٹھا تھا اس نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا۔ کہ میں تو خوش ہوا تھا۔ کہ اس نے غریب پر ترس کھایا ہے۔ مگر آپ کی تقریر سن کر معلوم ہوتا ہے کہ میری خوشی بے ایمانی کی تھی۔

ہیں بڑے مسلمان

میں نے قصائن کا دودھ پیا ہے اسی لئے بھی میرے مزاج میں حدت ہے مگر الحمد للہ شدت نہیں

حدت کی علت

"میرا دل اس قدر نرم ہے کہ مجھ سے کسی کی ذرا سی بھی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اگر کسی کو ادنیٰ تکلیف میں بھی دیکھ لیتا ہوں تو دل پگھل جاتا ہے اور پانی پانی ہو جاتا ہے۔" آپ نے اپنے طبی تعلق اور اتباع سنت کی وجہ سے اس انا کی اولاد کا پتہ لگانے کی بعد ازاں بڑی کوشش کی کہ اس کے ساتھ سلوک کیا جائے مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

"اللہ تعالیٰ کے فضل سے بچپن ہی سے میں جہاں کہیں رہا اعزہ واقربا اپنے اور بیگانے سب ہی کا محبوب رہا۔

بچپن

حالانکہ میں بچپن میں بہت شوخیاں کرتا تھا۔ مگر آج کل کے لڑکوں کی سی گندی شرارتیں نہ ہوتی تھیں۔ اس لئے سب کو بجائے ناگوار ہونے کے بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ دیوالی کے زمانہ میں میرٹھ چھاؤنی کے بازار میں سڑک پر دورویہ چراغ جلائے جاتے تھے دونوں طرف ہم دونوں بھائی چلنا شروع کرتے اور رومال کو حرکت دے کر سب کو ایک طرف سے بجھاتے چلے جاتے۔ مگر کوئی برا نہ مانتا۔ ہندوؤں کو بھی ناگوار نہ ہوتا ہے۔

لطافت طبع

"بچپن ہی سے میرا دماغ اس کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات ہو مگر ترکیب کے ساتھ بیان نہ کی جائے تو میری سمجھ ہی میں نہیں آتی نہ خود الجھی ہوئی تقریر کروں نہ دوسرے کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں۔ کیوں کہ بچپن ہی سے میرا دماغ ایک خاص ترتیب کا عادی ہو رہا ہے۔"

یہ اسی لطیف المزاجی کا اثر تھا کہ اگر کوئی شخص الجھا ہوا کلام یا بے اصول کام کرتا جس کا آپ سے تعلق ہوتا تو آپ کو اسی وقت تبخیر ہو کر درد سر ہونے لگتا حالانکہ دماغ اتنا قوی تھا کہ بلا تکان سارا دن اور سوتے وقت تک کام کرتے رہتے تھے اور بالکل نہ تھکتے تھے۔

مولانا مدنی کا معاملہ

حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت تھانوی کے درمیان بھی ویسے ہی اختلافات تھے جیسے حضرت شیخ الہند کے درمیان۔ مگر مخالفین نے کاندھلہ میں غالباً ۱۳۲۹ھ میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے حضرت تھانوی کے متعلق سوال کیا۔ تو مولانا بہت ناخوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ "یہ کیا واہیات سوال ہے۔ ہم تو ان کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ اپنے دوسرے بڑوں کو۔ بعد ازاں معاندین نے ان اختلافات کو اتنی اہمیت دی کہ عبدالماجد دریابادی جیسی شخصیت بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ:۔

(۱) "کانوں نے بیشک یہی سنا تھا۔ کہ ان کے اور ان کے درمیان بے لطفی ہے ناچاقی ہے۔"

(حکیم الامت ص ۱۶)

(۲) "دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دل دکھتا ہے خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف دیکھ کر۔"

(حکیم الامت صفحہ ۴۶)

لیکن جب عبدالماجد صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی معیت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو عبدالماجد صاحب کیا دیکھتے ہیں؟ اس کی تفصیل خود ان کی زبانی یہ ہے کہ:۔

"نماز ختم ہوئی۔ سلام پھیرا۔ دعا مانگ کر جونہی حضرت (تھانوی) اٹھے۔ نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی۔ ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے۔ لوگ تو کہتے تھے کہ بڑے خشک مزاج ہیں خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ۔ یہ ہنستا مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو

سکتا ہے!۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے۔ کہ ان کے درمیان بے لطفی ہے۔ ناچاقی ہے۔ کانوں نے بے شک یہی سنا تھا لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں دو دوست گلے مل رہے ہیں تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے تو خیر ہوتی بھی عادت طبعی ہونے کی بنا پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بنا پر بھی لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ ادھر سے بھی آداب و روادامِ تکریم میں کوئی کمی نہ تھی۔" (حکیم الامت ص ۱۶-۱۷)

حضرت تھانویؒ کے آداب و احترام کے بعد حضرت مدنی کا اخلاص و اکرام بھی قابل قدر ہے۔ جب مولانا مدنی صاحب کے مرید با صفا عبدالماجد صاحب حضرت تھانویؒ کے ہاں چند دنوں کے لیے تھانہ بھون جا کر قیام فرماتے ہیں تو انہیں تھانہ بھون میں حضرت مولانا مدنی کا یہ خط موصول ہوا۔

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ۔

والا نامہ محررہ ۱۶ اکتوبر (۱۹۲۵ء) باعث سرفرازی ہوا تھا۔ اب تو جناب خانقاہ میں پہنچ گئے ہونگے خداوند کریم وہاں کی حاضری باعثِ برکاتِ لامتناہیہ کرے آمین ؎

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی بیاد آر محبان بادہ پیما را

مجھ کو توی امید ہے کہ آنجناب وہاں پر اپنے اوقات کو مشاغل حقیقیہ میں صرف فرماوینگے جن کے متعلق ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں۔

البتہ ایک ضروری عرض محض اخلاص کی بنا پر کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ کسی غیر محل پر عمل نہ فرمائیں گے میں نے حسب الارشاد حضرت مولانا (تھانویؒ) دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے اصرار پر اس وقت آپ کو بیعت کر لیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی، روسیاہی۔ ناکامی پر نہایت درجہ گریہ کناں ہوں اور سخت شرمندہ۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے۔ اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے اُنس اور تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ وللہ الحمد اللّٰھم زد فزد اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا سے بھی بیعت کر لیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ مولانا دامت برکاتہم آپ کو نہ ٹالیں گے میں نے خود ان دنوں جب حاضر ہوا تھا عرض کیا تھا کہ آپ جب تشریف لائیں اور درخواست کریں تو جناب ان کو ضرور بیعت کر لیں قواعد طریقت کے اصول پر بیعت کر لینا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے اسی کی بنا پر فیض کی زیادہ تر امید ہے

مجھ روسیاہ کو بھی کبھی کبھی دعوات صالحہ سے یاد فرما لیا کریں نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دعا کی التجا کر دیا کریں۔

(ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ دیوبند ۲۰ ربجمادی الاول ۱۳۴۵ھ) (حکیم الامت ص ۹۰)

اس گرامی نامہ کا جواب عبدالماجد صاحب کی بجائے حضرت تھانویؒ نے یہ دیا:۔

"مخدومی و مکرمی مولانا حسین احمد صاحب دامت فیضہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

عبدالماجد صاحب کے نام پر گرامی نامہ آیا۔ اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا گو اس وجہ سے کہ میں اس کا

مخاطب نہیں۔ مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں۔ لیکن چونکہ اخیر تعلق مجھ سے ہی ہے نیز اس میں خود کو مخاطب بنانے کی یاد دہانی بھی ہے۔ اس لیے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مجملاً تو یہی عذر ہے۔ جو زبانی عرض کیا تھا۔ اور قدرے مفصلاً یہ عرض ہے۔ کہ اس باب میں مولوی صاحب کا مشورہ ہے اس لیے امید ہے کہ اس مشورہ سے رجوع فرمائیں گے۔ وہ مشورہ یہ ہے کہ میری خشونت و سوء خلق تو مشہور ہے مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت و دلجوئی جو صمیم قلب سے ہے وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبب ہے کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ وہ اس رعایت سے محروم کر دیئے جائیں۔ دوسرے گو ان کو مجھ سے موانست کافی ہے لیکن نفع کا مدار اعظم مناسبت ہے۔ اس کو میں پہلی ملاقات میں طے کر چکا تھا۔ اور اسی بنا پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا تھا جس کا میں شکر گزار ہوں اور اگر ان بناؤں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں تو میں بھی ان کی تقویت پر زور نہیں دیتا۔ لیکن جب اول بار میں بہ قول خود میری خاطر منظور تھی۔ سو اب بھی میری خاطر ملحوظ فرمائی جائے اور جس طرح کام چل رہا ہے چلنے دیا جائے کہ آپ ان کے مخدوم رہیے اور مجھ کو خادم رہنے دیجئے۔ اس جدید تبدل میں میری اور ان کی دونوں کی پریشانی مضمر ہے۔ جس کا گوارا کرنا اخلاق سامی سے بعید اور بہت بعید ہے اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے اور میری طرف سے محض انکار ہے تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حکم فرمانا جو ان کی قدرت سے خارج ہے۔ تکلیف مالایطاق ہے۔ جو ہر پہلو سے منفی ہے۔ والسلام

ناکارہ ننگ انام۔ اشرف برائے نام از تھانہ بھون جمادی الاول ۱۳۴۸ھ (حکیم الامت ص ۹۲-۹۱)

یہ خط و کتابت عین اختلافات کے زمانہ یعنی ۱۹۲۹ء کی ہے۔ اس لیے عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"سیاسی اختلافات مولانا حسین احمد سے اس وقت بھی تھے۔ اس پر بھی اس وقت تک ان کا پورا لحاظ و احترام قائم تھا"
(حکیم الامت ص ۱۸۳)

زمانہ گزرتا گیا۔ اور اس کے ساتھ سا تھ اختلافات کی خلیج بھی وسیع ہوتی گئی۔ پورے آٹھ سال بعد بھی ان ہر دو حضرات..... کے درمیان عزت و عظمت کے وہی قابل رشک نظارے دیکھے گئے۔ عبدالماجد صاحب اس بات کی خود شہادت دیتے ہیں:-

"تھانہ بھون اور دیوبند کے سیاسی مسلک میں اختلاف کچھ آج سے نہیں۔ مدت دراز سے بالکل واضح و غیر مخفی تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں کے ذاتی تعلقات بڑے خوشگوار اور شگفتہ تھے نہ شفقت میں کوئی کمی حضرت تھانوی ؒ کی جانب سے تھی اور نہ احترام و بزرگداشت میں کوئی فرق مولانا حسین احمد کی طرف سے"
(حکیم الامت ص ۵۱۰)

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ جن اکابر کو دانستہ یا نادانستہ ایک دوسرے کا سخت ترین مخالف ظاہر کیا جاتا تھا۔ ان میں کس درجہ التفات و ارتباط تھا اور ان کے اختلافات بھی کیسے اصول صحیحہ کے موافق اور حدود شرعیہ کے اندر تھے جس کی کسی دوسرے مکتبہ فکر میں مثال ملنی مشکل ہے۔ بقول عبدالماجد صاحب دریا بادی:

افراط و تفریط

"قوم عجیب افراط و تفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے۔ کسی سے خوش ہوئے تو اسے پوجنے لگے۔ خفا ہوئے تو گالیاں دینے لعنت برسانے لگے۔ گویا ان کا لیڈر

مسلمان

یا میر فرشتہ ہو۔ اگر فرشتہ نہیں ہے تو پھر شیطان کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ توازن و اعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے اور اشخاص و رجال کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں شیعیت اور خارجیت دونوں بے اعتدالی کی پیداوار ہیں اور اہل سنت کا مذہب جو بین بین اور سارے پہلوؤں کے درمیان ایک حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا افسوس کہ وہ خود اب اس بدبختی کا شکار ہوا جا رہا ہے۔" (حکیم الامت صـ۹۱)

جماعت اسلامی

لکھنؤ کے مشہور ماہنامہ "الفرقان" کے ایڈیٹر اور جماعت اسلامی کے سابق رکن مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے مودودی صاحب کو تحریک اسلامی میں شرکت اور اس کے موافق شریعت ہونے کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے حضرت کی خدمت میں بریلی سے آنا چاہا اور اجازت چاہی تو حضرت نے صاف لکھ دیا کہ:-

"اگرچہ کوئی اعتراض شرعی لحاظ سے بظاہر نہ وارد کیا جا سکے۔ لیکن میرا ذوق اس تحریک کو قبول نہیں کرتا۔ یہی زبانی بھی عرض کروں گا لہٰذا اس ضرورت کے لیے زحمت سفر نہ فرمائی جاوے۔" (خاتمۃ السوانح صـ۲۴)

صاحب قال کو کیا علم تھا۔ کہ "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید" چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا موصوف اس تحریک میں شریک رہ کر اس میں قابل اعتراض امور کا خود مشاہدہ کرکے ذاتی تجربہ کے بعد اس سے الگ ہو گئے اور بزبان حال اعتراف کر لیا کہ:-

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله

علیحدگی کی خبر سن کر خود ہم نے بھی انہیں اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے خط لکھا کہ کیا آپ اس جماعت کے امیر میں روحانیت کے بجائے انانیت دیکھ کر تو علیحدہ نہیں ہوئے تو مولانا موصوف نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲ شوال المکرم ۱۳۶۲ھ میں لکھا کہ:-

"بعد سلام مسنون

جماعت اسلامی کے نظام سے میری علیحدگی کے بارہ میں آپ کا فکر ایک حد تک صحیح ہے۔"

تخیل پاکستان

پاکستان کے لفظ سے دنیا پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں چوہدری رحمت علی ہوشیارپوری کی زبانی آشنا ہوئی جبکہ چند نوجوانوں کو خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال علامہ اقبالؒ نے مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا جس کو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں نصب العین کے طور پر ایک قرارداد

ایک حضرت تھانوی کا انتقال ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰ جولائی میں ہوا۔ ۲ سیرت اشرف صـ۵۲۶ تا صـ۵۲۷

کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ مگر علامہ اقبالؒ کے خطبہ اور لاہور قرار داد میں لفظ پاکستان کہیں استعمال نہیں ہوا بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تمسخر و استہزا کے طور پر اچھالا۔ جو قائداعظم کی کوششوں سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آ گیا۔

تاریخی مغالطہ

اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ کے مذکورہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا۔ بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔ جون ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم جو ابتداً کانگرس کے بہت بڑے حامی تھے، کے معتمد خاص بلکہ دست راست حضرت اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید باتمیز مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے اور اپنی اس اولیں ملاقات کا حال اپنی کتاب "نقوش و تاثرات" میں ان الفاظ میں درج کیا :-

"۱۹۲۸ء تھا۔ اور خاطب روزنامہ ہمدرد، کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت گورنمنٹی آدمی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جانے۔ بہر حال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلوخلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ تمیز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی۔ وہ اس کے" کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی۔ نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر۔" (نقوش و تاثرات ص۳۳)

یہ اعتراف و انکشاف ہندوستان کے اس عظیم صحافی کا ہے۔ جو شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے ہم خیال نہ تھے۔ بلکہ کانگرس کی حامی جماعت سے تعلق رکھتے ہے۔ اور آج اب بکانگرس کو بالخصوص اور عام دنیا کو بالعموم "یہی باتیں" سنانے میں ہندو پاکستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آپ کے لیے ان کا یہ انکشاف موجب حیرت ہو۔ کیونکہ یہ بات علامہ اقبالؒ کے اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظر عام پر لائی جا رہی ہے مگر کسی بات کا علم میں نہ آنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ واقعات انسان کی طرح جھوٹ بول سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو عقیدت کے پردہ میں زیادہ دیر تک چھپایا جا سکتا ہے۔[1]

نظامِ پاکستان کا خاکہ

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت تھانویؒ بھی ویسا ہی نظامِ پاکستان چاہتے تھے جس کا نقشہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اپنے خطبات و اعلانات میں پیش کیا تھا اور جس کا قوم آج تک مطالبہ کر رہی ہے۔

---

[1] سیرت اشرف از منشی عبدالرحمٰن ص ۷۴۵ تا ۷۴۸

اس سوال کا جواب عبدالماجد صاحب دریابادی کی اس اولین ملاقات کی تفصیل سے ملتا ہے جو انہوں نے جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے کی اور جس کے ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ :-

"پاکستان کا تخیل - خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں میرے کان میں پڑیں حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔" (نقوش و تاثرات صـ۲۳)

مرکز اور امام کی ضرورت

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لیے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال جہاد ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہؓ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے۔ لیکن غلبہ نہ ہوا جب ہجرت ہوئی۔ قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اٹھا کر دیکھ لو۔ کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی۔ اگر نماز روزہ اور طاعت ہوگی۔ تو غلبہ ہوگا۔ اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے۔ اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔ بس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال نہ ہوگا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہو سکتی۔ اور جہاد کے لیے مرکز ضروری ہے۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المومنین ہو اور جس کو امیر المومنین بنایا جائے۔ اس کے اندر تین صفات ہوں۔ ایک تدین یعنی وہ دیندار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔" (آثار رحمت صـ۱۰۱)

چونکہ قائداعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی۔ اس لیے آپ نے ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے متصف ہو جائیں جو ایک امیر المومنین کے لیے ضروری ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی یہ تمام جدوجہد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرارداد پاکستان پاس کرنے سے پہلے کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیل پیش کیا۔ بلکہ اس کے حصول کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں میں بھی آپ کا مرتبہ السابقون الاولون کا ہے۔

قائداعظم کی دینی تربیت

حضرت تھانویؒ کے مرید خاص اور قائداعظم کے یار غار نواب جمشید علی خاں صاحب جن کے پاس اکثر قائداعظم اپنی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کے ہمراہ موسم سرما میں باغپت جا کر رہا کرتے تھے اور جو انہیں حضرت تھانوی کے مواعظ و ملفوظات سنایا کرتے تھے کہتے ہیں :-

"یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائداعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانویؒ کا فیضان تھا اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا

جیسی بڑے مسلمان کی بدولت تھا۔ مولوی شبیر علی صاحب تھانوی نے قائداعظم کو حضرت والا کے قریب لانے میں بڑا کام کیا۔ قائداعظم بانیت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت خلوص اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند وجوہات کی بنا پر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی

قائداعظم پر آخر زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا۔ اور جس کو ہم سب نے دیکھا وہ حضرت رحمۃ اللہ کی ہی جوتیوں کا صدقہ تھا"
(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی ص ۹۲)

داستانِ شکوۂ لیگ

آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی معرفت سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب نے حضرت تھانوی کو مسلم لیگی امیدوار شیخ صادق حسن کی حمایت حاصل کرنے کے لیے خط لکھا اس کا جواب حضرت نے یہ دیا

(یہ تاریخی اور بصیرت افروز مکتوب سر سکندر حیات خاں کے خط کا صرف جواب ہی نہ تھا۔ بلکہ ارباب مسلم لیگ کے شکوہ کی مکمل داستان بھی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا)۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ صادر ہوا۔ احقر تو مسلم لیگ کا ہمیشہ حامی ہے اور وہ حمایت الحمد للہ کہ کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی دنیوی اصلاح میں اس وقت مسلم لیگ ہی میں شامل ہونے میں سمجھ رہا ہوں۔ اور کانگرس میں داخل ہونے میں دینی و دنیوی دونوں کا نقصان خیال کرتا ہوں۔ لیکن ہر مسلمان جانتا ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے اور تاریخی واقعات و شواہد سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک مسلمان دین اور مذہب پر قائم رہے اور اس قدر پختگی سے قائم رہے۔ کہ لوگ ان کو مجنوں سمجھتے تھے۔ ان کو دین کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل کی دھن تھی۔ اس وقت تک دنیوی اعتبار سے بھی مسلمان ہر طرح کامیاب رہے اور تمام دنیا میں ان سے آنکھ ملانے والا کوئی نہ تھا۔ اور جب سے اس میں کمی آئی۔ اسی وقت سے ذلیل ہوتے ہوتے اب ان کی ذلت کی انتہا ہو چکی ہے۔ اور تمام سمجھدار حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی ماضی کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ مگر نہ معلوم اس کا مفہوم کیا سمجھ لیا ہے۔ کہ اس کو فرماتے سب ہیں۔ جانتے سب ہیں۔ مگر دین کی باتوں سے گریز ہے۔ کہتے ہیں۔ مگر عمل نہیں کرتے۔ سو اگر حضرات لیگ دینداری کی طرف توجہ فرماتے۔ تو آج لیگ کی ترقی سے تمام اقوام خائف ہوتیں۔ مگر نہ معلوم کون سی چیز مانع ہے۔ کہ اس طرف نہیں آتے۔ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ پٹنہ میں ایک پیام بھیجا تھا۔ جو وہاں پڑھا بھی گیا تھا۔ اور سب حضرات کو تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ اس میں صرف دو چیزوں کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ اول نماز کی پابندی کو لیگ کے مقاصد میں شامل کیا جاوے۔ دوسرے وضع اسلامی کو لیگ کے ہر ممبر پر لازمی قرار دیا جاوے۔ نماز کا ارکان اسلام میں اہم ترین رکن ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ اور وضع خاص رکھنا تو ایسی چیز ہے کہ دنیا کے تمام سیاست دان اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جرمنی کا لباس الگ ہے جاپان کا الگ ہے۔ فرانسیسی کا الگ وعلیٰ ہذا۔ اور فوجی وردی تو لازمی طور پر الگ ہوتی ہے۔ اگر جرمنی سپاہی مثلاً انگریزی وردی پہن کر جرمن فوج میں شامل ہو۔ اور ویسے ہر طرح وفادار اور مستعد ہو۔ لیکن صرف وردی کی تبدیلی کی وجہ سے وہ مستوجب سزا کا ہوگا وعلیٰ ہذا۔ تو کیا مسلمانوں کے لیے جو حق تعالیٰ کی فوج ہے۔ کوئی خاص وضع اور امتیاز ضروری نہیں ہے؟ ہے اور ضروری ہے۔!

لیکن افسوس کہ حضرات لیگ نے ان دونوں باتوں کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ اگر ان باتوں کی طرف توجہ فرماتے۔ تو دین کی اور باتیں بھی اور آج دنیا میں بھی مؤثر ہیں۔ میں اور بتلاتا۔ مگر مجھے واقعی حضرات لیگ سے یہ شکایت ہے کہ مولویوں کو صرف الیکشن کے وقت پوچھا جاتا ہے اور ان کے فتوؤں پر عمل کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کی بات کی طرف کوئی کان نہیں دھرتا۔ ہم اگر ذاتی منافع کے لیے کچھ بھی لکھیں تو بیشک نہ سنئے۔ نہ مانئے۔ لیکن اگر ان حضرات کو ہم پر اعتماد ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم فتویٰ صحیح دیتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ الیکشن ہی کے لیے صحیح ہوتا ہے۔ دوسرے وقت وہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ میری غرض لیگ کی حمایت سے یہی تھی کہ اس میں بحمد اللہ سمجھدار۔ عالی دماغ مسلمان ہیں۔ تو ان حضرات سے جب دینداری کے لیے کہا جاوے گا۔ تو بہت جلد مان لیا جاوے گا۔ تو گویا لیگ کی حمایت دین کی حمایت تھی اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اصل چیز یعنی دین ہی سے بے تعلقی اور بے توجہی ہے۔ تو بجز خاموشی کے اور کیا کروں۔ آپ ہی انصاف فرماویں کہ اب میرا کیا جی چاہے! یہاں تک تو وہ امور عرض کئے تھے۔ جن کی طرف حضرات لیگ کو متوجہ کر چکا ہوں اور پھر بھی انہوں نے عمل نہیں کیا۔

اب دو نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ جن سے میں بہت پریشان ہو رہا ہوں ایک تو لیگ کا علامہ مشرقی سے تعاون اور دوسرا ذمہ داران لیگ کا علماء کے وقار اور ملازم کے برباد کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ مشرقی کی کتابیں میں نے دیکھی ہیں اور جہاں تک ہو سکا میں نے اس کے اقوال کی تاویل بھی کی۔ مگر وہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اس کے عقائد جن کی رفتہ رفتہ وہ خاموشی سے تبلیغ کر رہا ہے صریح کفر ہیں اور چونکہ مسلم لیگ اس وقت تک مسلمانوں میں مقبول جماعت ہے۔ مگر خاکساروں کی جماعت کی وجہ سے لوگ لیگ سے بھی بدظن ہو رہے ہیں۔ جس کا مجھے اس طرح علم ہے کہ اکناف ہند سے ان لوگوں کے سوالات میرے پاس آ رہے ہیں۔ جو اب تک مسلم لیگ کے سرگرم اور حامی ممبر تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ لیگ جب خاکساروں سے تعاون کرتی ہے۔ تو اب مسلم لیگ میں داخل رہنا جائز ہے یا نہیں؟ غرض ان خاکساروں سے ملنے کی وجہ سے لیگ بھی بدنام ہو رہی ہے۔ اور جو شخص اب لیگ کی جدید حمایت کرے گا۔ وہ بھی بدنام ہوگا۔ دوسری چیز لیگ والوں کا بلا کسی استثناء کے علماء کے وقار کو تباہ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگر کانگرسی علماء سے بچایا جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اختلاف مسلک کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر بلا کسی استثناء کے علماء کے اثر کو مٹانے کی سعی کے معنے تو مذہب کو مٹانے کی سعی کرنا ہے۔ اور جو جماعت دین کو مٹانے کی فکر میں ہو۔ آپ ہی انصاف فرماویں کہ اس سے میں کہاں تک تعاون کر سکتا ہوں۔

مجھے بھی افسوس ہے کہ مجھے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہے اور سر سکندر حیات خاں صاحب کے ارشاد کے بعد مجھے ایک ایسی تحریر لکھنا پڑی جو بظاہر خلاف تہذیب ہے۔ مگر مسلمانوں کی اصل تہذیب چونکہ دین ہے۔ اور دین کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ ان حالات میں میں اس ارشاد کی تعمیل سے عذر کروں۔ اس لیے مجھے امید ہے۔ وہ معاف فرماویں گے۔ اور اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرماویں گے۔ تو شاید وقت آجائے اور لیگ خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل کرنا شروع کر دے۔ تو میں لیگ کا ہر وقت خادم ہوں۔ خیر میں ایک دم تنزل کر کے یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اور وزیر صاحب کی خدمت میں بھی جن سے مجھ کو ان کے غائبانہ اوصاف خصوصی اسلامی حمیت سن کر مدت سے خاص محبت ہے وہ عرض یہ ہے اگر پابندی شرعی وضع کو منافاۃ لیگ کا جزو بنانا کسی دنیاوی مصلحت کے خلاف کہا جاوے۔ یا ہمت سے بالا خیال کیا جاوے۔ تو کم از کم ان چیزوں کو تو ممنوع قرار دیا جاوے جن سے لیگ کی دنیوی قوت کو یا بلفظہ دیگر اسلامی مفاد کو صدمہ یا ضعف پہنچتا ہو جن کی طرف میں نے اس خط میں اشارہ کیا ہے۔ اور اگر ف انہ کرے یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو پھر میں کسی کی آزادی میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا

رئیس المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۹۲ھ / ۱۰۰۵ء ○ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء
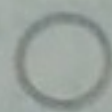
...ترک کے اندر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اثر نقل کیا ہے۔ اس کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کی تمام الجھن ختم ہو جائے گی۔ حضرت مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کے مطابق مطالعہ کیا تو میری تمام الجھنیں دُور ہو گئیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا بیان ہے کہ تیرہ دفعہ آپ نے صحیح بخاری شریف کے صرف متن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ جب کہ اس کے حاشیہ اور بین السطور پر بالکل نظر نہ تھی۔ ہر دفعہ ایسے علوم و حقائق کا انکشاف ہوتا کہ اس سے پہلے قلب میں گزرے ہی نہ تھے۔

حضرت شاہ صاحب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بے حد مداح تھے ابن تیمیہؒ کو حافظ الدنیا اور جبال علم کے معزز القاب سے یاد کرتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ کے مقابلے میں حافظ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری کے علوم اور ان کی تحقیقات کو زیادہ دقیق سمجھتے تھے درس میں ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے خواب میں حافظ بدرالدین عینیؒ کو دیکھا اور ان سے بطور شکایت کے کہا کہ ابن حجر کے مقابلہ میں جو طرز آپ نے اختیار کیا ہے۔ اس سے علماء کو بہت دقت ہوتی ہے حافظ عینی نے جواب دیا کہ حافظ ابن حجر سے دریافت کرو کہ انھوں نے یہ طرز کیوں اختیار کیا تھا؟ حافظ عینی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے صرف مدافعت کی ہے ابتدا ابن حجر سے ہوئی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں عینی کے اس جواب پر خاموش ہوا۔ ان معلقات پر عینی کے جوابات سے شاہ صاحب مطمئن نہ تھے۔ آپ تفسیر حدیث شرح الفاظ اور نقول کبار میں زیادہ مکمل سمجھنے کے باوجود نظم و ترتیب میں پسند نہ کرتے تھے۔

کئی ایک بزرگوں سے سُنا کہ حضرت شاہ صاحب بعض دفعہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک شخص کعبۃ اللہ کے پردوں کو پکڑ کر دعا کر رہا تھا کہ خداوند تعالیٰ مجھے بخاری کا ملکہ عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ منٹگمری نے فرمایا کہ یہ شخص خود شاہ صاحبؒ تھے۔ یہ بات بطور تحدیث نعمت ان کی زبان پر آجاتی تھی مگر اپنے نام کا اخفا کر جاتے تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمنؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند ہمیشہ حضرت شاہ صاحب کو چلتا پھرتا کتب خانہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ فرمایا کرتے تھے کہ۔

> "مجھے جب مسئلہ فقہ میں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر کوئی چیز مل گئی تو فبہا ورنہ پھر حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا ہوں۔ شاہ صاحب جو جواب دیتے اسے آخری اور تحقیقی پاتا اور اگر حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا۔ اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا۔"

مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا اور جو ایک مرتبہ سُن لیا وہ ضائع ہونے سے محفوظ اور مامون ہو گیا گویا کہ اپنے زمانہ کے زہریؒ تھے۔ امام زہریؒ جب مدینہ منورہ کے بازار سے گزرتے تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے کسی نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ میرے کانوں میں جو داخل ہو جاتا ہے۔ وہ نکلتا نہیں۔ اس لیے بازار سے گزرتے وقت کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں۔ تاکہ بازار کی یہ خرافات میرے کانوں میں داخل نہ ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک دفعہ دیوبند کے قبرستان میں پھر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں علم کی قبر کے پاس پھر رہا ہوں۔ یہ قبر حضرت شاہ صاحب کی تھی۔ مطالعہ کے سلسلہ میں فنون عصریہ، فلسفہ جدیدہ، ہیئت جدیدہ حتیٰ کہ فن رمل اور جفر کی کتابوں کو بھی بغیر مطالعہ کے نہ چھوڑا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے درس کی خصوصیات

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت کے درس کی شان عجیب تھی جسے اب دکھلانا تو ممکن نہیں۔ البتہ بتلانا ممکن ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"درسِ حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیثِ نبوی کی مُراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے۔ حدیث

محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس لیے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں۔ اور حدیث کا جو مفہوم ابو حنیفہؒ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشا ہے۔ جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے۔ بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایت حدیث سے امام ابو حنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں

اس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرت ممدوح اور ایک اہل حدیث کے مابین ہوا۔ اہل حدیث عالم نے پوچھا کیا آپ ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں۔ میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں اس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقہ حنفی ہی کی تائید کر رہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد کلیۃً ابو حنیفہ کے اجتہاد کے مطابق پڑتا ہے۔ اس طرز جواب سے سمجھانا یہی منظور تھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لیے حدیث کو استعمال نہیں کرتے بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اس کا اخراج کیا دیتے ہیں۔ اور طریق استخراج پر مطلع کر دیتے ہیں۔ بہر حال اکابر دیوبند کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقلد بھی تھے۔ مگر اس تقلید میں محقق بھی تھے۔ وہ مسائل میں پابند فقہ حنفی بھی تھے۔ مگر اس پابندی کو بصیرت و تحقیق سے اختیار کیے ہوئے تھے۔ جیسے مسئلہ تقدیر میں اہل سنت کا مذہب بندہ کے جبر و اختیار کو جمع کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے۔ مگر مجبور فی الاختیار ہے۔ اسی طرح مسائل فقہیہ میں۔ حضرت شاہ صاحب کا رنگ یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں۔ مگر محقق فی التقلید ہیں اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں۔ وہاں مسائل کو تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کے ساتھ بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

ایک امریکن مصنف نے اپنی معروف کتاب "ماڈرن ان انڈیا" میں زیر عنوان "دیوبندیوں کا اسلام" اہل دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقہ اپنے مختصر عنوان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

"حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل دیوبند) اپنے کو مقلد کہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے محققانہ انداز سے سمجھتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی تنقیح و تحقیق کرتے ہیں کہ اس دعوائے تقلید کے ساتھ وہ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں" (انتہی بمعناہ)

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ حضرات مجتہد فی التقلید اور محقق فی الاتباع ہیں۔ کورانہ تقلید یا جامد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں اور لم یخروا علیہا صما و عمیانا کے سچے مصداق ہیں۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحر ذخار ہونے کی وجہ سے درس حدیث صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا۔ اس میں استطراداً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم و فن کی بحث آتی تھی۔ اگر معانی و بلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم معانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لیے واضع نے وضع کیا تھا۔ معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لیے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی۔

غرض اس نقلی اور روائتی فن (حدیث) میں نقل و عقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی کہ بلا بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہٖ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور سائنس وغیرہ تمام علوم جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا اور اس لیے جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم و فن کا مذاق لے کر اٹھتا تھا۔ اور اس میں یہ استعداد

کے یہاں جاکر دیکھے"

اندازہ کیجیے جن حضرات کی تعریف و توصیف انور شاہ جیسے محدث و فقیہہ کی زبان سے ہو رہی ہو۔ انکا مقام کتنا بلند ہوگا۔ اس کا مجھ جیسے ژولیدہ تصور
بھی نہیں کر سکتے حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اسی کتاب میں اپنے اپنے مقام پر آ رہا ہے حضرت
رائے پوری علیہ الرحمۃ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے پیر و مرشد تھے۔ انکا ذکر شیخ عبدالقادرؒ کے حالات میں ملاحظہ فرمایئے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری فرماتے تھے کہ کچھ دنوں میں نے بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ہے۔ میں ایک دفعہ سنہری مسجد
مدرسہ امینیہ میں گیا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب ایک حجرے میں دروازہ بند کئے ذکر دو ضربی جہر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اللہ، اللہ، اللہ، اللہ، دیر تک
اسم ذات کرتے رہے۔ اس وقت عمر اکیس بائیس سال کی ہوگی۔ نیز فرمایا جب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بازار نکلتے تو سر پر رومال ڈال کر آنکھوں کے
سامنے پردہ کر کے نکلتے۔ مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔

عارف باللہ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت شاہ صاحب کا نام اور شہرت سنی۔ دعا فرمایا کرتے کہ زندگی میں
شاہ صاحب کی زیارت ہو جائے۔ ایک دفعہ لاہور حضرت کی تشریف آوری کی خبر سن لی۔ کار بھیج کر دعوت دی۔ حضرت نے پہلے تو انکار فرمایا۔ لیکن مولانا احمد علیؒ
کے اصرار پر منظور فرما لیا۔ شرق پور پہنچے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرق پور کو مشرف فرمایا۔ حضرت میاں صاحب بہت ہی ممنون ہوئے۔ حضرت کے سامنے
دو زانو ہو کر بیٹھے اور کہا کہ آپ نائب رسول ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جناب کے چہرۂ مبارک پُر انوار کو دیکھتا ہی رہوں۔ گفتگو فرماتے رہے اور حضرت شاہ صاحب
خاموش سنتے رہے۔ کہیں کہیں کچھ ارشاد فرماتے رہے۔ میاں صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مجھے نجات کی ان شاء اللہ توقع ہو گئی ہے۔ حضرت جب واپس ہونے
لگے تو برہنہ پا پختہ سڑک تک ساتھ مشایعت کے لیے تشریف لائے۔ جب موٹر چلنے لگی تو پچھلے پاؤں واپس ہوئے فرمانے لگے کہ

"دیوبند میں چار نوری وجود ہیں۔ ایک ان میں سے حضرت شاہ صاحب بھی ہیں" [1]

دیوبند میں شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ شرقپور گئے تھے۔ میاں صاحب کو کیسے پایا۔

فرمایا:-

"میاں صاحب عارف ہیں اور صحیح معنیٰ میں عارف ہیں۔ (حیات انور" بروایت مولانا محمد انوری)

حضرت مولانا محمد انوری ہی رقمطراز ہیں کہ،

بہاول پور شہر میں جامع مسجد و دیگر مقامات پر قادیانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لیے علماء کو بھیجتے رہتے تھے۔ دو دفعہ احقر کو بھی بھیجا۔ ان ایام میں
اس قدر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چہرۂ مبارک پر انوار کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بار بار دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں
لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں۔ حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی۔ بہاولپور جامع مسجد میں جمعہ کی نماز حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ پڑھایا کرتے تھے
بعد نماز کچھ بیان بھی ہوتا تھا ہزاروں ہزار کا مجمع رہتا تھا پہلے جمعہ میں فرمایا کہ

حضرات! میں نے ڈابھیل جانے کے لیے سامان سفر باندھ لیا تھا کہ یکایک مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کا
خط دیوبند موصول ہوا کہ شہادت دینے کے لیے بہاولپور آ جائیے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بہاولپور
کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی۔ شاید یہ بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانب دار ہو کر بہاول پور میں آیا تھا۔"

[1] یہ روایت حضرت میاں صاحب کے انہی اصحاب صوفی محمد ابراہیم صاحب نے حضرت میاں صاحب کی سوانحعمری خزینۂ معرفت میں بھی لکھی ہے۔ بہت افسوس کا مقام ہے کہ شرقپور کے موجودہ صاحبزادوں نے خزینۂ معرفت کی نئی اشاعت میں اس روایت کو حذف کر دیا ہے۔

بروایت حضرت مولٰنا محمد ادریس کاندھلوی :-

نورِ تقوٰی کا یہ عالم تھا کہ جو شخص بھی دیکھتا، وہ اوّل نظر میں یقین کر لیتا کہ یہ خدا کا کوئی نیک بندہ ہے حق یہ ہے کہ نورِ تقوٰی اجلٰی بدیہیات میں سے ہے مگر حقیقت کی تنقیح بہت دشوار ہے اور درجہ اتصاف کی دشواری کو تو پوچھو ہی مت۔ وانھا لکبیرۃ الاعلی الخاشعین الذین یظنون انھم ملٰقوا ربھم وانھم الیہ راجعون۔ شاہ صاحب اگر کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور باہر سے کوئی اجنبی مجلس میں داخل ہوتا تو یہ دیکھتے ہی کہ سمجھ لیتا تھا کہ اس مجلس میں سب سے بڑا عالم اور متقی یہی شخص ہے۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نُور!

کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور!

یہ ناچیز (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) جب بھی حضرت شاہ صاحب کو دیکھتا تو یہ شعر زبان پر آتا۔

اَلْمُسْلِمُوْنَ بِخَیْرٍ مَا بَقِیْتَ لَھُمْ ۔۔۔ وَلَیْسَ بَعْدَکَ خَیْرٌ حِیْنَ تَفْتَقِدُ

جب تک آپ زندہ ہیں۔ اس وقت تک مسلمان خیر و برکت میں ہیں اور تیرے گم ہونے کے بعد کوئی خیر نہیں۔ طبقات شافعیہ میں ہے کہ یہ شعر کسی نے امام سمانی کو دیکھ کر پڑھا تھا۔ شاہ صاحب چونکہ اس زمانے کے امام بخاری تھے۔ اس لیے یہ ناچیز ان کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتا تھا۔

شکل و صورت اور لطافت طبع

قدرت نے جس طرح حضرت شاہ صاحب کو اقلیم علم و عمل میں اجارہ داری عطا فرمائی تھی۔ اسی طرح جسمانی ہیئت اور قد و قامت اور شکل و صورت میں بھی ایک خاص امتیاز عطا فرمایا تھا۔ مولٰنا سعید احمد ایم اے اکبر آبادی کا بیان ہے کہ مجھ کو ہندوستان، مصر و حجاز اور دوسرے ممالک عربیہ کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ لیکن جو وجاہت، جو وقار و متانت جو دلکشی اور جاذبیت میں نے حضرت الاستاذ میں پائی۔ وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے الگ اور سب سے نمایاں رہتے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہیں پر جا کر ٹھیرتی اور پھر جمتی تو اس طرح کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتی۔ کشمیری النسل تھے۔ اس لیے خوب کھلا ہوا۔ سپید رنگ، کشیدہ و دراز قامت چوڑا چکلا سینہ، دوہرا اور گدازجسم بڑی بڑی مگر رسیلی اور شرمیلی نگاہیں۔ کشادہ و فراخ پیشانی طویل مگر ستواں بینی، بڑے بڑے کان پُر گوشت اور فربہ ہاتھ ریشم اور حریر کی مانند نرم و سبک جلد چلتے تھے تو معلوم ہوتے تھے کہ علم کا ایک کوہ گراں سبک گامی کر رہا ہے۔ بیٹھتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک آفتاب نظام شمس سے وابستہ ستاروں کو اپنے گرد لیکر بیٹھ گیا ہے۔ کبھی سفید اور کبھی سبز سر پر عمامہ اور قامت بالا پر سبز قبا! دیکھنے والے ڈر ڈر کے دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کہ فرمان نبوی ہے۔ العین حق۔ غرض کوئی ایک ادا ہو تو اس کا ذکر کیجئے۔ کوئی ایک خوبی ہو تو اس کو بیان کیا جائے۔ جہاں یہ عالم ہو کہ :-

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم! ۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

وہاں خاموشی کو ہی ترجمانی دل کا منصب تفویض کر دینے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

اسی حسن و جمال ظاہری و باطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی بہت زیادہ تھی۔ بہت صاف اور اُجلے کپڑے پہنتے تھے۔ غذا میں سادگی پسند تھے۔ البتہ تازہ پھلوں اور بٹیر کے عاشق تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ بیس سال میری زندگی میں ایسے گذرے ہیں کہ میں نے پرندوں کے علاوہ اور دوسرا گوشت کھایا ہی نہیں۔ میٹھے خربوزوں کے بہت شوقین تھے۔ اگر میٹھے خربوزے میسر آجائیں تو اور کھانا بہت کم کھاتے تھے۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بہت معترف تھے۔ ان کے علم کی عظمت و شان کو بہت وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ حافظ ابن تیمیہ جبال علوم میں سے ہیں۔ ان کی رفعت شان اور جلالت قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو سر اٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے سے گر جائیگی۔ لیکن باایں ہمہ

استوا علی العرش میں اگر وہ یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہیں گھسنے دوں گا۔

ایک دفعہ عصر مغرب کے درمیان بخاری شریف کا درس زور و شور سے ہو رہا تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین ہی ختم ہو گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا۔ جاؤ تم بھی گھر کا راستہ لو۔ طلبہ حیران ہوئے کہ بھائی شمس الدین کون اور کب آئے اور کب رخصت ہو گئے؟ حیرانی دیکھ کر فرمانے لگے۔ جاہلین! دیکھتے نہیں۔ وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں۔ اب کیا اندھیرے میں پڑھو گے؟ کیا وہ لطف کا سبق ہوگا؟

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر بہل انداز سے۔ فرمایا کہ جاہل تجھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں۔ جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا۔ وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ مارے گا اور وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ مارے۔ گویا یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلہ سند تجھ تک پہنچ جائے گا۔

ایک دفعہ مسائل فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آگیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ فرمانے لگے مسئلہ تو یہی ہے مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے (اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب ہی مسجد دارالعلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے تم نے کبھی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے؟ جو چالیس برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی؟ جاہلین وہ ہم ہیں۔ ہم برس کا نابالغ میں ہوں (اس وقت تک حضرت کی شادی نہیں ہوئی تھی) اشارہ اسی طرف تھا۔

ایک دفعہ ڈاکٹر علاؤ الدین میرٹھی تحفۃً کا برف لیکر آئے۔ حضرت مہتمم صاحب مولانا محمد احمد مرحوم نے اس کو بلایا اور شاہ صاحب سمیت دوسرے اکابر کھانے لگے۔ کھانے کے دوران شاہ صاحب نے پوچھا کہ ڈاکٹر جی! اس برف میں کتنا کما لیتے ہو؟ کہا کہ ساٹھ روپے۔ مسکرا کر فرمانے لگے کہ تو پھر تمہیں دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ضرورت نہیں (ان دنوں حضرت کی تنخواہ ساٹھ روپے تھی)

بہرحال شاہ صاحب علمی وعملی کمالات رکھنے کے ساتھ ساتھ خوش طبع بھی تھے۔ مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی جس میں غیر متعلق فضول اور دنیوی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا۔ اگر کسی نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو منع فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ جاؤ۔ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لیے فارغ نہیں۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت کرتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصہ مطالعہ کتب میں گزرتا تھا۔ ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ فتح الباری کا (جو تیرہ جلدوں کی کتاب ہے) تیرھویں دفعہ مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لیے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا۔ مطالعہ کا اشتغال مسلسل ہے اور درس کا مستقل۔ اس لیے ہر سال درس میں نئی نئی تحقیقات آتی رہتی ہیں۔

اخلاق

علم و فضل کی بلندی کے تناسب سے اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے۔ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی سائل حضرت کے پاس آیا ہو اور نامراد گیا ہو۔ جیب میں جو کچھ ہوتا۔ اٹھنی یا روپیہ سائل کے حوالہ کر دیتے۔ ایسی بات کرنے سے احتراز کرتے جس سے کسی کی دلآزاری ہو۔ ایک دفعہ امرتسر تشریف لے گئے۔ وہاں کے ایک نامی گرامی بیرسٹر بربنائے عقیدت حاضر ہوتے لیکن داڑھی مونچھ صاف ہونے کی وجہ سے بھینچے بھینچے سے بیٹھے۔ شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ آپ نے بھانپ لیا اور فرمایا بیرسٹر صاحب آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے۔ لیکن غرض و غایت دونوں کی ایک ہی ہے یعنی دنیا کمانے میں اگر مولوی ہو کر داڑھی نہ رکھوں تو کوئی مجھے کھانے کو نہ دے۔ اور اسی طرح اگر آپ بیرسٹر ہو کر داڑھی صاف نہ کرائیں تو ہر کوئی کہے کہ ابے ان کو بیرسٹر کس نے بنا دیا۔ یہ تو ملا جی ہیں۔ تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام پر روٹی نہ ملے۔ جب ہم دونوں کی غرض ایک ہے، تو محض اختلاف فعل پر آپ شرمندہ کیوں؟

امت کے برابر انھوں نے کام کیا۔ بعینہٖ اسیطرح شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اس امتِ محمدیہ علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والسلام کے ان جامعہ افراد میں سے ایک تھے۔ جنھوں نے بیک وقت مختلف محاذوں پر کام کیا اور جن کے نورِ معرفت نے ہر شعبۂ زندگی میں برقی لہر دوڑا دی۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم اجمالی طور پر مختصراً ختمِ نبوت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ختمِ نبوت کے سلسلہ میں کام کرنے کے کئی تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ خالص علمی انداز میں ردِ مرزائیت کیلئے ایک جماعت ہو۔ جو نہایت سنجیدگی اور متانت سے اس کام کو سرانجام دے۔ ایک صورت یہ تھی کہ شعلہ نوا مقرروں کی ایک کھیپ تیار کی جائے۔ جو اپنی شعلہ زائی اور آتش بیانی سے عوام کو اس تحریک کے خفیہ مقاصد سے آگاہ کرے اور حسبِ ضرورت قربانی سے بھی گریز نہ کرے۔ ایک پہلو کام کرنے کا یہ تھا کہ کسی ایک بڑی شخصیت کو ردِ مرزائیت کا مبلغ بنا دیا جائے۔ جس کا ایک ایک لفظ خرمن قادیانیت کے لیے صاعقۂ برق ثابت ہو۔ ایک انداز کام کرنے کا یہ تھا کہ اگر مرزائی متکلمین تحریر کے ذریعے تبلیغ کریں تو ان کے مقابلہ کرنے والے تحریر میں ان کا جواب دیں۔ ایک شعبہ کام کرنے کا یہ تھا کہ مناظروں میں انکو شکست دی جائے۔

بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو حضرت شاہ صاحب نے ان تمام محاذوں پر بطورِ خود سالارِ اعلیٰ کے فرائض انجام دے اور ہر موقعہ وجگہ کے لیے کام کرنے والے افراد کی تربیت کی اور انکو آگے لائے۔

علمی میدان میں شاہ صاحب نے علماء کے لیے عربی اور فارسی میں مختلف رسائل لکھے۔ جو ردِ مرزائیت میں اصولی انداز پر حرفِ آخر ہیں اور اسی طرح علماء کی تربیت کی کہ وہ اس محاذ پر علمی رنگ میں کام کریں چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، حضرت مولانا سید محمد بدرِ عالم صاحب میرٹھی، مہاجر مدنی جیسے یگانۂ روزگار اہلِ قلم کو اس طرف متوجہ کیا۔ عوامی سطح پر کام کرنے کے لیے مجلسِ احرارِ اسلام کو متوجہ کیا اور لاہور انجمن خدام الدین کے جلسہ پر اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب اور شعلہ نوا جادو بیان مقرر مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کو اس بارے میں امیرِ شریعت کا خطاب دیا اور سب سے پہلے خود ان کی بیعت کی اور اسی مجلس میں پانچ سو جید علماء نے حضرت کی اقتداء میں بخاری علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر بیعت کی اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت امیرِ شریعت کی قیادت میں مجلسِ احرار نے ردِ مرزائیت پر جو کام کیا۔ وہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ اسی طرح فلسفی شاعر علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو مرزائیت کے خدوخال سے آگاہ کیا اور انھوں نے جیسا کہ مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی کے حوالہ سے گزشتہ سطور میں گزر چکا ——— ردِ مرزائیت پر جو کام کیا۔ وہ حضرت علامہ کشمیری کی توجہ کا اثر تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا اس مسئلہ پر خصوصی توجہ فرمانا علماء وخواص کے لیے کافی تھا۔ مزید برآں علامہ اقبال، جیسے عظیم مفکر وشاعر کی توجہ خصوصی اس طرف مبذول کر دینے نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ آخری کام یہ تھا کہ اگر کہیں مرزائی مبلغ مناظرہ کا کھیل کھیلیں۔ تو اس میدان میں بھی ان کی سرکوبی کی جائے۔

فیروزپور میں مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظرہ طے پایا اور عام مسلمانوں نے جو فنِ مناظرہ سے ناواقف تھے۔ مرزائیوں کے ساتھ بعض ایسی شرائط پر مناظرہ طے کر لیا۔ جو مسلمان مناظرین کے لیے خاصی پریشان کن ہو سکتی تھیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے صدر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ صاحب کے مشورہ سے مناظرہ کے لیے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ، حضرت مولانا سید محمد بدرِ عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی تجویز ہوئے۔ یہ حضرات جب فیروزپور پہنچے تو مرزائیوں کی شرائط کا علم ہوا کہ انھوں نے کس طرح دجل سے من مانی شرائط سے مسلمانوں کو جکڑ لیا ہے۔ اب دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو ان شرائط پر مناظرہ کیا جائے یا پھر انکار کر دیا جائے۔ پہلی صورت مضر تھی۔ دوسری صورت مسلمانانِ فیروزپور کے لیے سبکی کا باعث ہو سکتی تھی کہ دیکھو تمہارے مناظر بھاگ گئے۔ انجام کار انہی شرائط پر مناظرہ کرنا منظور کر لیا گیا اور حضرت شاہ صاحب کو تار دیدیا گیا۔ اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا اور عین اسی وقت دیکھا گیا۔ کہ حضرت شاہ صاحب بنفسِ نفیس حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تشریف لا رہے

امامِ انقلاب حضرت مولانا عُبَیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء ○ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء

"بھر چونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاولپور کی دیہاتی مساجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔

سید العارفین کے خلیفہ

اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا۔ جہاں سید العارفین کے خلیفہ اول مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں یہیں میں نے عبد القادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچیں) شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خانپور سے کوٹ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نووارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دار العلوم دیوبند

صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔

حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہند

دیوبند دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہندؒ کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ میں ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا۔ اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمدؒ صاحب دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبد العزیز ثانی ہوگا"۔

چند دوستوں نے مبشر خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔

رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا۔ جسے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے۔ جن میں جمہور اہل علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات نا ممکن الحصول نہیں بلکہ راسخین فی العلم انھیں علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابو داؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

جہان آباد دہلی

بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبد الکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کر لی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر احمد صاحب کی خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی ان سے سُنے۔

حالات سندھ

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ کو دہلی سے سیدھا بھر چونڈی ضلع سکھر پہنچا۔ اس تمام سفر میں آتا و رفتاً لاہور نہیں اترا اور مسجد چونیاں نہیں گیا۔ میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔

سید العارفین کے دوسرے خلیفہ

شوال ۱۳۰۷ھ میں سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابو الحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ وہ میرے لیے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس آخر وقت تک میرے گھر رہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں

کو ایک کمیٹی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ سے وابستہ رہے۔

دار الارشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آ کر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ الاخوان چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے نہیں چل سکتا تھا۔ اس لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۹۰۱ء میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہو گیا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن یمانی امتحان کے لیے تشریف لائے اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیت کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ میں "نظارۃ المعارف" قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے ابو الکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل

۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو بتلایا گیا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انہوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی مستقل پروگرام وہ بھی نہ بتلا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک ممبر بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔

سیاحت روس

۱۹۲۳ء میں ترکی جاتا ہوا۔ سات مہینے ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولیات بہم پہنچائیں۔ یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہ پہچان سکتا تھا۔

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی شکل میں ہے۔ اس زمانہ کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اوّل انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقا جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی۔ سوشلسٹ بھی ہیں اور نیشنلسٹ بھی، سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکرگزار رہوں گا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کرسکتا۔ فللّٰہ الحمد وحدہٗ

جدید ترکیا

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لیے سفیر ترکیا متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ لگا سکے۔ یہ غلط ہے کہ میں اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے تخمیناً تین سال ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے عمل کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

ہمارا پروگرام

یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ الاستاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک علمی خواہش کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہوں۔

اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرنے کے لیے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا، اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت کے لیے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلہ افکار ہوا اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں نہ اس کا اچھا بدل تبلا سکتے ہیں۔ وہ کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار برس پہلے زمانہ میں لا کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے۔ وہ میرے لیے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔ لیکن اس بنا پر پولیٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ کلمة الحکمة ضالة المومن حیث وجدها فهو احق بها۔

مکہ معظمہ

۱۳۴۴ھ موسم حج پر مکہ معظمہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر میں مؤتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۴ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ ہو گیا۔ اگر کبھی کسی جزوی طور پر امداد کی درخواست میں نے کی تو حکومت نے اسے پورا کر دیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیائے امور حارج نہیں ہوئے۔ اس لیے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جزاھم اللّٰہ خیرا

علمائے مکہ سے استفادہ

مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی (حاجی علی جان والے) دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی، مرحوم تیسرے ابوالشرف مجددی۔ ان کے کتب خانہ سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ الحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں تقریباً ۱۱-۱۲ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے، اس زمانہ میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بااطمینان حل کر سکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے۔ ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک علمی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔ میں نے امام ولی دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات الٰہیہ، سطعات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ۔ ان کی کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عبقات اور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی

مفتئ اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۲ھ
۱۸۷۵ء

۱۳۷۲ھ
۱۹۵۳ء

جب حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں قید کر لیا گیا تھا تو اس موقع پر بھی آپ نے اپنے استاد محترم کی محبت میں ایک عربی قصیدہ لکھا تھا۔[1]

سیاسی تحریکات میں شرکت

۱۸ اگست ۱۹۱۷ء کو ملک معظم (برطانیہ) کا وہ مشہور اعلان شائع ہوا جس میں ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد لارڈ مانٹیگو (وزیر ہند) ہندوستان آئے۔ ان کے سامنے مسلم لیگ اور کانگریس کا متحدہ سمجھوتہ "میثاق لکھنؤ" پیش کیا گیا۔ اس پر چونکہ حضرت مفتی صاحب کے زیر انفرادی حیثیت سے تنقید کر چکے تھے لہٰذا اس موقع پر حضرت مفتی صاحب زیر قیادت علماء کرام نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ سیاسی تحریکوں میں شریک ہو کر مسلمانوں کی صحیح راہنمائی نہیں کریں گے، تو ان کی طرف سے مزید غلطیاں سرزد ہونگی

مسلم لیگ میں شرکت

چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر علماء مسلم لیگ کے اس گیارہویں اجلاس دہلی منعقدہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں بکثرت شریک ہوئے جو شیر بنگال مولوی فضل حق کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل علماء شریک ہوئے

۱: حضرت مفتی کفایت اللہ

۲: حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ

۳: مولینا عبدالباری فرنگی محلیؒ

۴: مولانا آزاد سبحانی

۵: مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ

۶: مولانا عبداللطیف دہلویؒ

۷: مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ[2]

مسلم لیگ کے لیڈر علماء کی شرکت سے بہت خوش ہوئے چنانچہ کرسیٔ صدارت کی طرف سے ایک تجویز پیش ہوئی جس میں علماء کرام کی شرکت پر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔

جشنِ صلح کا مقاطعہ

اس کے بعد ۱۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس بھی مولوی فضل الحقؒ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں بہت سے علماء شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں حضرت مفتی صاحب نے برطانیہ کے جشن صلح کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس کے الفاظ یہ تھے:۔

"یہ جلسہ ان دل دوز واقعات کو پیش نظر رکھ کر جو سلطنت ترکی، خلافت، مقامات مقدسہ اور سلطنت ایران کے متعلق اس صلح کے نتیجہ کے طور پر پیش آئے، مذہبی نقطۂ نظر سے تجویز کرتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جشن فتح میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیئے۔"

یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہو گئی اس کی حمایت میں حضرت مفتی صاحب نے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے:۔

"شرعاً ایسی حالت میں جب کہ مقامات مقدسہ خلیفۃ المسلمین کے قبضے سے باہر ہیں اور بغداد شریف بیت المقدس و نجف اشرف وغیرہ غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں مسلمان کسی طرح ایک ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے،

---

[1] رسالہ شیخ الہند مطبوعہ ۱۹۱۸ء [2] مسلمانوں کا روشن مستقبل

ہوا۔ اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔

آئین اور دستور کی تشکیل اور آئندہ طریق کار میں علماء کا اختلاف تھا مگر اس موقع پر مفتی صاحب نے اپنے تدبر اور بے مثل ذہانت کا ثبوت دیا۔ آپ نے ان اختلافات کو رفع کر کے چند گھنٹوں میں جمعیۃ علماء ہند کے لئے متفقہ آئین و دستور اور آئندہ کے لئے طریق کار پیش کر دیا جسے تمام علماء نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔

اس زمانے میں امرتسر ہی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس بھی کانگریس کے پنڈال میں منعقد ہوا۔ ان جلسوں میں علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) بھی شریک ہوئے تھے جو نظر بندی سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے تھے اور وہیں ان کی پہلی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی تھی۔

حضرت مفتی صاحب اپنے استاد حضرت شیخ الہند کی زندگی میں جمعیۃ علماء ہند کے عارضی صدر رہے وہ مالٹا میں نظر بند رہنے کی وجہ سے صدارت نہیں کر سکے اس لئے حضرت مفتی صاحب ان کی وفات تک عارضی صدر رہے اور ان کی زندگی میں مستقل صدر بننا قبول نہیں کیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۱۹ برس تک صدر رہے، مگر اس عرصے میں کبھی آپ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کے صدر نہیں بنے بلکہ ہم عصر دوستوں کی صدارت میں کام کرنا آپ کی طبیعت کا خاص وصف رہا۔

حضرت مفتی صاحب کی زیر قیادت جمعیۃ علماء ہند نے برصغیر پاک و ہند کی آزادی کامل کا نصب العین اپنے پیش نظر رکھا اور اس مقصد کے لئے آپ نے علماء کو متحد کرنے اور ان میں صحیح قسم کا سیاسی شعور پیدا کرنے میں انتھک محنت کی۔ چنانچہ اس کے سالانہ اجلاس اسی مقصد کے لئے ہوتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے یہ اجلاس تقریباً ہر سال ہندوستان کے مختلف بڑے شہروں میں ہوتے تھے۔ اس کے بعض اجلاس بڑے شاندار اور تاریخی اہمیت کے تھے۔ ان میں سے کانپور کے اجلاس میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے خطاب کیا تھا۔ نیز اس کے جو اجلاس مراد آباد، جون پور، دہلی، گیا اور امروہہ میں ہوئے تھے وہ بھی اہم تھے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کے پشاور میں اجلاس ہوئے وہ بہت معرکہ آرا تھے۔ ان اجلاس میں بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ اور بازار قصہ خوانی میں حکومت کی فائرنگ کی سخت مذمت کی گئی۔ اس کے نتیجہ میں اس فائرنگ کے خلاف جو غیر سرکاری تحقیقات کرنے والی پٹیل کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس کے ایک رکن حضرت مفتی صاحب تھے۔

رولٹ ایکٹ

حضرت مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ بل کے خلاف جب ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی تھی تو آپ نے اس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپ اس مقصد کے لئے حکمت عملی کے ساتھ پوشیدہ کام کرتے رہے۔

شدھی کی تحریک

تحریک خلافت کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کی، اور ہزاروں ملکانوں کو جو مسلمان تھے مرتد کر کے ہندو بنا لیا تو حضرت مفتی صاحب کانگرس اور ہندو رہنماؤں سے بعض معاملات میں اتحاد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے۔

تبلیغی وفد

آپ نے اس موقعہ پر سب سے پہلا تبلیغی وفد ان علاقوں میں روانہ کیا جہاں آریہ سماج کی شدھی کی تحریک

کا نور تھا۔ اس وفد کے صدر مولانا محمد عرفان مرحوم (مدیر اوّل اخبار الجمعیۃ) اور نائب صدر مولانا وحید حسن صاحب ٹونکی[1] (مدرس مدرسہ امینیہ) تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خود بھی ایک وفد لے کر بمقام اچھیرہ جا پہنچے اور وہاں کے مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچایا۔

تبلیغی خدمات

حضرت مفتی صاحب کا اندازِ خطابت اور طرزِ تخاطب اس تبلیغی دورہ میں دیہات والوں کی سطح اور ذہنیت کے مطابق ہوتا تھا۔ وہ آپ کی دل نشیں اور سیدھی سادی گفتگو سے متاثر ہو کر دوبارہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس فتنۂ ارتداد کے زمانہ میں حضرت مفتی صاحب کو یہ خبر ملی کہ فلاں گاؤں پورے کا پورا مرتد ہو گیا ہے لہٰذا حضرت مفتی صاحب نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ وہ فوراً گاؤں پہنچ کر صورت حال معلوم کریں۔ اس زمانے میں ملکانہ قوم کے دیہاتوں میں آریہ سماج کی شدھی کا بہت زور تھا، اس لئے مسلمانوں کی تبلیغی جماعت کا وہاں پہنچنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا تھا تاہم مولانا احمد سعید صاحب جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آریہ سماج اُن سے یہ کہتے تھے ——

تمہارے باپ دادا سب ہندو تھے۔ مسلمانوں نے اگر تم کو زبردستی مسلمان بنایا اور تمہاری چوٹیاں کاٹیں —— یہ سُن کر حضرت مفتی صاحب وہاں پہنچے اور جلسے کا اعلان کرا کر ان سب لوگوں کے سامنے آپ نے یوں تقریر ارشاد فرمائی۔

مؤثر تبلیغی تقریر

آج اس گاؤں میں آ کر اور ایک بہادر قوم کے سپوتوں سے مل کر میں بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ ملکانہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ممتاز قوم ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تمہارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی ہے۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی لوگ تمہیں اگر بہکاتے ہیں کہ تمہارے باپ دادا کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا اور ان کی گردنیں پکڑ پکڑ چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ کیا واقعی تمہارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟ مجھے یقین نہیں آتا! دیکھو بھئی! یہ لوگ جھوٹ بولتے اور دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے باپ دادوں سے کوئی آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے۔ کیا تم اپنے سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادوں کی روحوں کو صدمہ نہیں پہنچا رہے ہو؟

آپ کی اس تقریر نے نفسیاتی طور پر اُن کے دلوں پر اس قدر اثر کیا کہ اس گاؤں کے تمام اشخاص ازسرِنو مسلمان ہو گئے۔

مذہب کی حمایت میں کلمۂ حق

شدھی اور سنگٹھن کی تحریک کی وجہ سے تمام ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے لہٰذا گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس دن کا برت شروع کیا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمام فرقوں کی ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں صدر جلسہ

---

[1] مولانا وحید حسن خاں صاحب بہت بڑے عالم اور معقولات، منطق اور علم کلام کے زبردست فاضل تھے اس لئے عقلی دلائل سے اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے بہت موزوں تھے۔ وہ مولانا محمود حسن خاں مؤلف معجم المصنفین اور مولانا وحید الحسن خاں محدث ندوۃ العلماء کے بھانجے تھے اور بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ راقم الحروف کے نہایت شفیق استاد تھے۔ آخر زمانے میں وہ کرنال کے ایک تبلیغی کالج میں مبلغوں کی ایک جماعت تیار کر رہے تھے کہ اچانک انتقال کر گئے۔

نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کے احکام کو خارج کر دیں۔ اس موقعہ پر اکثر ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اس تجویز کی حمایت کی ۔۔۔ مگر ہزاروں کے اس مجمع میں صرف مفتی صاحب کی ذات تھی جس نے اس متفقہ تجویز کی پُرزور مخالفت کی اور شریعت کے صحیح احکام کی حمایت میں آپ عظیم ترین شخصیتوں سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ چنانچہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:۔

بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ اسلام کا کھلا ہوا روشن اصول ہے۔ ہمیں اس کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہے۔ مگر ہندوستان کے موجودہ فسادات اس عقیدہ کے نتائج نہیں ہیں کیونکہ اس سزا کو جاری رکھنے کا حق صرف سلطانِ اسلام کو ہے۔ پس موجودہ حالات میں اسلامی حدود کے جاری ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔[1] اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے۔ تبلیغ اس کے خمیر میں داخل ہے۔

اس طرح آپ نے تمام مخالفتوں کے باوجود حکم حق کہہ کر علمائے حق اور اسلام کی لاج رکھ لی۔ بقول اقبالؒ ؎

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مؤتمر حجاز

جب سلطان ابن سعودؒ نے حجاز مقدس میں سے شریف مکہ کی حکومت ختم کر دی تو دنیائے اسلام کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد کرنے کی تجویز پیش ہوئی اور اسی کے مطابق ایک مؤتمر عالم اسلامی مورخہ ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء کو شریف شرف عدنان کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں تمام اسلامی ممالک کے منتخب وفود شریک ہوئے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے ارکان مندرجہ ذیل تھے۔

۱: حضرت مولینا مفتی کفایت اللہؒ (صدر وفد) ۲: مولانا عبد الحلیم صدیقی (پرائیویٹ سیکرٹری صدر وفد)
۳: مولینا محمد عرفانؒ (سیکرٹری وفد) ۴: علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (رکن وفد)
۵: مولینا احمد سعیدؒ (رکن وفد) ۶: مولانا نثار احمد (رکن وفد)

حضرت مفتی صاحب نے سلطان ابن سعود سے مطالبہ کیا کہ مؤتمر عالم اسلامی میں حجاز کے لئے حکومت کی تشکیل کا مسئلہ بھی زیر بحث آئے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بھی ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ آخر کار ۱۴ مئی ۱۹۲۵ء کو جمعیۃ علماء کا وفد اور جمعیۃ خلافت کا وفد بذریعہ اکبر جہاز بمبئی سے روانہ ہوا۔ خلافت کے وفد مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

۱: مولانا سید سلیمان ندویؒ (صدر وفد) ۲: مسٹر شعیب قریشی (سیکرٹری وفد)
۳: مولانا شوکت علیؒ رکن ۴: مولانا محمد علی رکن

اس عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس میں ہند، مصر، جاوا، فلسطین، بیروت، شام، سوڈان، نجد، حجاز، روسی ترکستان، افغانستان، ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے وفود شامل تھے۔

مؤتمر عالم اسلامی کی سبجکٹ کمیٹی میں مندرجہ ذیل ارکان کو شامل کیا گیا۔

---

[1] مفتی اعظم کی یاد ص ۹۱-۹۲

یہ پھٹے ہوئے کپڑے سینا صرف سیاسی قیدیوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ اخلاقی قیدیوں کے کپڑے بھی (آپ) سیا کرتے تھے۔

اسی ملتان جیل میں آپ نے عربی زبان میں ایک فصیح و بلیغ نظم لکھی جس میں آپ نے جیل کے افسر میجر فضل الدین کو تہنیت عید بھیجی اور اس میں آپ نے سچے جذبات کا وہ پورا نقشہ کھینچا ہے جو عید کے موقع پر ایک قیدی کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی اسلامی حمیت اور آزادی حاصل کرنے کے مصمم عزم کا اظہار بھی کیا ہے۔ [1]

مارچ ۱۹۳۲ء میں ملتان جیل سے مولانا احمد سعید صاحب حضرت مفتی اعظم سے پہلے رہا ہوئے تو حضرت مفتی صاحب نے اردو نظم میں اپنے جذبات کا اظہار فرمایا۔

استغناء اور خودداری

اس زمانے میں مخالف حضرات یہ کہا کرتے تھے کہ مفتی صاحب اور جمعیۃ العلماء کے دیگر ارکان کو کانگریس سے تنخواہ ملتی ہے اور ان کی تمام تحریکات کانگریس کے فنڈ سے چلتی ہیں مولانا ابو الغیاث شیخ کریم الدین میرٹھی جو جنوبی ہند میں پندرہ سولہ برس بطور سفیر جمعیۃ کا کام کرتے رہے ہیں، اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مالی امداد سے انکار

۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند پر ایسا تنگی کا دور آیا کہ فنڈ میں بالکل روپیہ نہ رہا۔ کئی ماہ کی تنخواہیں چڑھ گئیں۔ اس وقت موتی لال نہرو نے کانگریس فنڈ سے مالی امداد کرنے کی پیشکش کی اس زمانے میں حضرت مفتی صاحب گرفتار ہو چکے تھے مگر ابھی دہلی جیل ہی میں تھے۔ اس سلسلے میں جب آپ سے مشورہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا :-

"جنگ آزادی کے میدان میں، ہم کسی دوسرے کے سہارے پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ استخلاص وطن کی جدوجہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے اگر ہم جماعت کو نہیں چلا سکیں گے تو دفتر کو بند کر دیں گے"۔

اور ویسے بھی حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح اور دیگر اکابر جمعیۃ کی زندگیوں کو دیکھا جائے، تو ان کی زندگی اس الزام کا قطعی انکار کرتی نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کا تقویٰ، کردار، خلوص، للّٰہیت اور ملی و قومی غیرت بے مثال تھی۔ اس کی ایک مثال وہ ہے کہ جب آزادی کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کو ہندوستان کا سب سے بڑا سول اعزاز پدم بھوشن دیا جانے لگا تو آپ نے انکار کر دیا حالانکہ آزادی کے بعد اپنے ملک کی حکومت سے اس طرح کا اعزاز ملنا آپ کی خدمات کا اعتراف تھا اور آپ کا یہ حق بنتا تھا، لیکن جو لوگ ہمیشہ سنتِ پیغمبر پر عمل پیرا رہے ہوں اُن کی نگاہ ہر وقت اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے) پر رہتی اور زخارف دنیا کی، ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ہفت اقلیم کی دولت بھی پیش کرے تو ٹھکرا دیتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اور حضرت مدنی رح ایسے ہی خوددار اور اللہ والے لوگ تھے۔

---

[1] مفتی اعظم کی یاد ص ۱۶۴ - ۱۶۵

حضرت مفتی صاحب کے لئے کانگریس سے مالی امداد لینا تو بہت بڑی بات ہے ۔آپ خود جمعیۃ العلماء کی تحریکات اور اس کے دیگر کاموں کے لئے اس کے فنڈ سے کوئی پیسہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے بلکہ جمعیۃ العلماء کے کاموں ، اس کی تحریکات اور جلسوں کے لئے جو سفر کرتے تھے اس کے مصارف بھی آپ خود اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور اگر کبھی ہاتھ تنگ ہوتا تو سفر کو ملتوی کر دیتے تھے ۔

حکومت کی پیش کش

جب آپ نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا اور اس میں روز افزوں ترقی ہونے لگی تو آپ کے ساتھ آپ کے لاکھوں معتقدین اس تحریک میں شریک ہوگئے تھے ۔اس لئے حکومت برطانیہ نے آپ کو تحریک سے الگ رکھنے کے لئے ہر قسم کے دباؤ ڈالنے شروع کئے ۔ آخر میں حکومت کی طرف سے وائسرائے کونسل کے ایک رفیع ممبر میاں سرفضل حسین نے یہ پیام آپ تک پہنچایا ۔

"حکومت برطانیہ یہ درخواست کرتی ہے کہ آپ سیاسی تحریکات سے کنارہ کش ہو جائیں ۔اس کے صلہ میں حکومت آپ کو بطور ہدیہ مدرسہ صغد رجنگ کی شاہی عمارت اور اس کا ملحقہ میدان پیش کرے گی اور آپ کی ذاتِ خاص کے لئے ہبہ کرے گی ۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ حکومت برطانیہ کی حمایت یا پراپیگنڈہ کریں ۔ نہیں بلکہ آپ صرف اتنا کریں کہ خاموش رہیں اور سیاسیات سے الگ رہیں ۔"

حضرت مفتی صاحب کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف اپنے ایک مضمون میں مذکورہ بالا پیام کی یہ عبارت تحریر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :۔

یہ ایک رازدارانہ پیام تھا جو والد مرحوم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے بیان کیا تھا اور آج پہلی مرتبہ صفحۂ قرطاس پر آرہا ہے ۔[1]

ضمیر فروشی سے انکار

میاں سرفضل حسین کے اس پیام کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا :۔

"میں آزادئ وطن کی تحریک میں ذاتی منفعت کے لئے شریک نہیں ہوا ہوں ۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ ۔ کوئی لالچ میرے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا ۔"

پہلے مسلمان پھر ہندوستانی

حضرت مفتی صاحب اور دیگر ارکان جمعیۃ العلمائے ہند کے بارے میں یہ غلط فہمی اب تک پائی جاتی ہے کہ وہ دیگر بعض کانگریسی مسلمانوں کی طرح کانگریس کے اندھا دھند

---

[1] مفتی اعظم کی یاد ص ۲۲۲

متقلد تھے اور انہی کی طرح "پہلے ہندوستانی اور بعد میں مسلمان تھے"۔ مگر یہ الزام قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ آپ کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمن واصف اپنی مرتبہ کتاب "مفتی اعظم کی یاد" میں پُر زور طریقہ سے اسکی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

حضرت مفتی صاحب کی کسی تحریر یا تقریر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے برخلاف اُن کا نظریہ یہ تھا کہ ـــــ مسلم پبلک کا اوّلین فرض ہے کہ وہ سیاسی ترقی کی رفتار میں مذہبی آزادی کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھے اور پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی یا عربی، ایرانی، چینی وغیرہ کے اصول کو لازم سمجھیں۔ (ملاحظہ ہو) مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت مطبوعہ دی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۱۷ء۔

اور آخر عمر تک آپ اس پر قائم رہے۔

مصر کی مؤتمر فلسطین

جب برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کیا اور ایک حصہ میں یہودیوں کی سلطنت قائم کر دی تو فلسطین کے عوام میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے برطانیہ کے خلاف سخت تحریک چلائی کی، جسے حکومت برطانیہ نے تشدد آمیز مظالم سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا حضرت مفتی صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کے زیر نگرانی "مجلس تحفظ فلسطین" قائم کی اور فلسطین کے مظلوموں کے لئے چندہ جمع کیا۔

علاوہ ازیں تمام ہندوستان میں تقسیم فلسطین کے خلاف ۲۶ اگست ۱۹۳۸ء کو "یوم فلسطین" منایا گیا۔ احتجاجی جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ اس کے بعد قاہرہ میں عالم اسلام کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش ہوئی چنانچہ مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ میں جناب علی علوبہ پاشا کی صدارت میں یہ مؤتمر فلسطین منعقد ہوئی۔ اس مؤتمر میں مصر، شام، عراق، ایران، ہندوستان، لبنان، حجاز، اردن، یوگوسلاویہ، پولینڈ، رومانیہ، ترکی غرضیکہ تمام عالم اسلامی کے تقریباً ساڑھے تین ہزار نمائندے شریک ہوئے۔

جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے نمائندے مندرجہ ذیل علماء تھے۔

۱: حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب (صدر) ۲: مولانا عبدالحق مدنی (رکن) ۳: مولانا محمد یوسف بنوری (رکن)

مصر کا سفر

حضرت مفتی صاحب اپنے ارکان وفد کے ساتھ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ پہنچ گئے۔ قاہرہ میں حضرت مفتی صاحب کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ مولانا محمد یوسف فرماتے ہیں کہ:

"ہم نے حضرت مفتی صاحب کے استقبال کا جو نظارہ قاہرہ میں دیکھا (ہمارے دل مسرت کی وجہ سے اُچھل رہے تھے اور ہمارے سر فخر کی وجہ سے بلند ہو رہے تھے) اتنا عظیم الشان استقبال دنیا کے کسی نمائندے کا نہیں کیا گیا مفتی اکبر زندہ باد، ہندی وفد زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگائے جا رہے تھے۔ ایک عظیم الشان جلوس کی صورت میں آپ کو قیام گاہ تک لے جایا گیا۔"

۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو شام کے ۵ بجے مؤتمر شروع ہوئی۔ اتنے بڑے اجلاس میں یہ شرف آپ کے حصہ میں آیا کہ صدر کے دائیں جانب جو کرسی تھی وہ آپ کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ سبجکٹ کمیٹی کے ارکان میں آپ کا نام سب سے پہلے رکھا گیا تھا۔ سبجکٹ کمیٹی کے ۱۸ ممبر تھے جن میں سے تین ہندوستانی تھے۔ یعنی حضرت مفتی صاحب، مولانا محمد عرفان اور ڈاکٹر عبدالرحمن صدیقی

تھے۔ مطلب یہ کہ جو سوال پوچھا جاتا تھا اس کا جواب "ٹو دی پوائنٹ" (TO THE POINT) ہوتا تھا۔ اس کی عبارت عام مفتیوں کی طرح زیادہ پیچیدہ اور طویل نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا فتویٰ نویسی کا انداز نہ صرف عوام میں مقبول ہوا بلکہ سرکاری عدالتیں بھی اسے بہت پسند کرتی تھیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی اور نکاح طلاق کے معاملات میں حضرت مفتی صاحب کے فتووں کو ترجیح دیتی تھیں۔ ذیل میں آپ کے فتووں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

بلیک مارکیٹ

ایک دفعہ بلیک مارکیٹ کے بارے میں یہ استفتار آیا:۔

"بلیک مارکیٹ کے متعلق شرع کیا کہتی ہے۔ یعنی بلیک کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور یہ کسی حالت میں بھی جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً آج کل کپڑے اور آٹے پر راشن ہے تو اس کی بلیک کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مفصل تحریر فرمائیں۔

آپ نے اس کا سلیس اور مختصر یہ جواب تحریر فرمایا:۔

"بلیک مارکیٹ کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں مخلوق کے ساتھ ناانصافی اور بے رحمی ہے اور جھوٹ بولنے کا بھی قوی امکان ہے۔"

اللہ محمد کے سپرد

ایک بات یہ دریافت کی گئی:۔

" بہت سے لوگ کسی چیز کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے یہ کلمے کہتے ہیں "اللہ محمد کے سپرد" مثلاً کوئی خطرہ کی جگہ جاتا ہے تو اس کے عزیز و اقارب کہتے ہیں "اللہ محمد کے سپرد" یہ کلمات کہنے درست ہیں؟ (ایسے موقع پر) کیا کہنا چاہیے؟

الجواب: "اللہ محمد کے سپرد" یہ الفاظ نہ کہنے چاہئیں۔ صرف "اللہ کے سپرد" کہنا ٹھیک ہے۔

فوٹو کھینچنا

فوٹو کھینچنے کے متعلق حضرت مفتی صاحب سے فتویٰ اس طرح دریافت کیا گیا:۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے متعلق کہ فوٹو کھینچنا اور کھینچوانا شرعی نقطہ نظر سے کیوں حرام ہے؟ جب کہ زید یہ کہتا ہے کہ۔ متحرک کو ہم ساکن کر دیتے ہیں یعنی شیشے میں دیکھنے سے جو ہماری صورت نظر آتی ہے اُسے ہم مستقل کر دیتے ہیں تو وہ فوٹو کہلاتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں حرام ہے؟ اس سے ایک یادگار بھی قائم رہتی ہے۔

الجواب: تصویر بنانا اور اس کو استعمال کرنا شریعت مقدسہ نے ناجائز قرار دیا ہے۔ فوٹو لینا بھی تصویر بنانے کا ایک طریقہ ہے۔ پس وہ ناجائز ہے جب کہ اس سے جان دار کی تصویر بنائی جائے۔ ہاں مکانات اور غیر ذی روح مناظر کا فوٹو لینا جائز ہے جیسا کہ ان کی ہاتھ سے تصویریں بنانی جائز ہیں۔ شریعت مقدسہ نے جان داروں کی تصویریں بنانا اور فوٹو لینا ایک مصلحت سے حرام فرمایا ہے کہ غیر اللہ کی تعظیم اور توقیر کا شائبہ بھی مسلمانوں میں نہ رہے۔"

ان دو تین مثالوں سے واضح ہو گا کہ مفتی صاحب فتویٰ دیتے وقت کوئی لمبی چوڑی اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ آسان سے آسان الفاظ میں شریعت کا حکم واضح فرما دیتے تھے اور یہی ان کا کمال تھا۔

گزار دی۔ مفتی صاحب شاہجہان پور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بھی شاہ جہان پور میں ہی ہوئی۔ اس کے
بعد دیوبند میں انہوں نے اپنی تعلیم کو تکمیل تک پہنچایا۔ دہلی آئے اور اپنی تمام زندگی علم دین کی خدمت کرنے میں گزار دی۔
مدرسہ امینیہ میں وہ درس دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کی تنخواہ بیس پچیس روپے ماہوار تھی۔ اس وقت مدرسہ امینیہ
سنہری مسجد میں تھا۔ بعد میں جب مدرسہ امینیہ کشمیری بازار منتقل ہوگیا تو وہاں درس دینے لگے۔ وہ ایک معمولی تنخواہ پر اپنا
گذر کرتے رہے۔ (در حقیقت حضرت مفتی صاحب نے اُن علماء کو آنکھوں سے دیکھا تھا جو اپنی خوشی سے غریبی کی حالت میں
اپنی زندگیاں بسر کیا کرتے تھے) وہ عالم دین تھے اور دین کا اشارہ تھا کہ وہ ملکی اور قومی کام بھی کریں۔ چنانچہ اس کام میں وہ
کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں اُس وقت سے برابر ان
کی زندگی کو پرکھتا رہا۔ اُن کی ہمت، جرأت اور استقامت کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ وہ طوفانی دور تھا کہ بڑی بڑی
شخصیتیں اس دور میں بہہ گئیں لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے عزم، ہمت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا اور ان
طوفانوں کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑی۔ انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ
زندگی کے آخری لمحات تک انہوں نے اس راستہ سے قدم نہیں ہٹایا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی روح ہم
سے قریب ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہندوستان کی تاریخ میں اُن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اخلاق و عادات اور کچھ متفرق حکایات

آپ نہایت سادہ طبیعت، خاموشی پسند تھے۔ وقار اور متانت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے آپ کے رعب سے کانپتے، اور
احباب و رفقاء آپ کی ہیبت سے ڈرتے تھے۔ خوش اخلاق اور مرنجاں مرنج تھے۔ اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے۔ ہنرمند
ایسے تھے کہ کوئی کام آپ کے لئے مشکل نہ تھا۔ خط نہایت عمدہ اور دلفریب تھا۔ آپ کا کمال خوشنویسی بالکل وہبی اور محض عطیہ
ربانی تھا۔ خوشنویسی کی مشق آپ نے کبھی نہیں کی۔ منشی محمد دین خوش نویس کے صاحبزادے مسٹر ضیاء الدین نے اپنی کسی کتاب میں
مفتی اعظم کے حالات لکھے ہیں۔ سنا ہے کہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ مفتی اعظم خوشنویسی میں میرے والد کے شاگرد تھے۔ یہ بالکل غلط ہے۔
حساب میں بڑی عمدہ مہارت تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے۔ شہرت و نمائش سے ہمیشہ متنفر رہے۔ عربی اور فارسی میں بہت عمدہ
شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی کچھ تھوڑی سی شاعری کی ہے۔ عربی ادب میں اور عربی مکالمے میں فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ
عرب کے علماء نے آپ کی زبان دانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کے علماء میں ہم نے آپ کو اہل زبان کی طرح شستہ
زبان بولتے سُنا۔

شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی مرحوم نے آپ کے متعلق فرمایا: ینبلج الحلم والوقار فی جبینہ۔
عالم اسلام کے اکثر زعماء سے آپ کے تعلقات اور خط و کتابت تھی۔ مفتی اعظم فلسطین آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سید
توفیق شریف مرحوم (شامی لیڈر) جب ہندوستان آتے تھے تو اکثر آپ کے دولت خانہ پر قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے لیڈر تو

تسلی دلانے کی کوشش کی کہ حضرت یہ تو صرف ضابطہ کی خانہ پری ہے ورنہ ہم نے عمر بھر میں نہ کسی سے سود لیا اور نہ کسی کو سود دیا۔ فرمایا کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں، آپ مجھے معاف کیجئے۔ آخر انہوں نے دوسرا پرونوٹ ٹائپ کرایا جب آپ نے دستخط فرمائے۔ قرض سے ہمیشہ بچتے تھے۔ وفات کے وقت آپ کسی کے مقروض نہ تھے۔

چند متفرق حکایات

ایک مرتبہ والئی چترال نے حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں ایک تار بھیجا جس میں دریافت کیا گیا کہ دہلی میں عید کا چاند ہوگیا یا نہیں۔ حضرت مفتی صاحب موجود نہ تھے۔ مدرسہ امینیہ میں چند چترالی طلبہ تھے۔ انہوں نے تار کا جواب دے دیا کہ چاند ہوگیا۔ اس کے مطابق صبح کو چترال میں عید کرلی گئی۔ والئی چترال نے حضرت کو خط لکھا کہ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے ایک بہت بڑے اختلافی مسئلے کو حل فرمادیا یعنی یہ کہ اگر چاند کی اطلاع بذریعہ تار کے معتبر نہ ہوتی تو آپ تار کا جواب نہ دیتے۔ حضرت مفتی صاحب نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے تار اور اُس کے جواب کی مجھے قطعاً خبر نہیں۔ کب آپ نے تار دیا اور کب میں نے اس کا جواب دیا۔ یہی بات تار کی خبر کے غیر معتبر ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی زبیدہ خاتون تھی جو اٹھارہ سال کی عمر میں وفات پاگئی۔ اس سے آپ کو بہت محبت تھی۔ جب وہ چار پانچ سال کی تھی، ایک مرتبہ گھر میں شلجم منگائے گئے۔ زبیدہ نے ان میں سے مٹی اور ریتہ پھوڑ کر رکھ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد والدہ نے وہ مٹی کوڑے پر پھینک دی۔ جب بچی کو اس کا علم ہوا تو مچل گئی۔ بلک بلک کر رونے لگی۔ والدہ نے بہت بہلایا، منایا، پھسلایا۔ آپ نے بھی بہت کچھ چپکا کرنے کی کوشش کی۔ گود میں لے کر بازار سے مٹھائی دلوائی مگر کسی طرح اُس کی ضد نہ گئی۔ گملوں میں سے مٹی نکال کر اُس کو دی گئی مگر وہ کہتی تھی کہ میں تو شلجم کی مٹی لوں گی۔ آخر آپ اس کو گود میں لے کر سبزی فروشوں کی دکانوں پر گئے اور کئی دکانوں سے شلجم کی مٹی جمع کرکے لائے جب وہ بہت خوش ہوئی۔ گھر میں آکر فرمایا کہ ماں باپ ان پھول سے بچوں اور خاص کر بچیوں کی کس قدر ناز برداری کرتے ہیں۔ کس محنت اور محبت سے پالتے ہیں۔ جب یہ دوسرے گھر جاتی ہیں تو وہ لوگ ان تمام محنتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ لڑکی کے ماں باپ کے دلوں کو کس قدر صدمہ اور دکھ پہنچاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک استفتار آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جارہی تھی۔ ایک شخص کا مکان اس کے متصل تھا۔ وہ اس کی توسیع میں حائل ہوتا تھا۔ مالک مکان سے کہا گیا کہ اپنے مکان میں سے تھوڑا سا حصہ مسجد کو دے دو۔ اس نے مسجد کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کئے۔ آیا وہ شخص کافر ہوا یا نہیں؟ مولوی محمد فاروق صاحب نے اس کا جواب لکھا کہ چونکہ مسجد شعائر اللہ ہے اور شعائر اللہ کی توہین کفر ہے لہٰذا وہ شخص کافر ہوگیا۔ جواب دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ ابھی سے کافر سازی شروع کردی۔ مفتی بن جاؤگے تو کیا کروگے۔ کیا تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص میں ننانوے باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات ایسی ہو جس سے اس کے اندر ایمان ثابت کیا جاسکتا ہے تو اُس کو کافر نہ کہو۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ اس سوال میں تو کھلی ہوئی توہین ہے پھر کفر کیوں نہیں ثابت ہوگا۔ فرمایا کہ پہلے اس بات کو ثابت کرو کہ وہ مسجد حقیقت میں مسجد ہی ہے۔ فرض کرو کہ وہ مسجد زمین مغصوبہ پر بنائی گئی ہو اور اس شخص کو یہ بات معلوم ہوگئی ہو۔ اس لئے اُس نے نامناسب یا توہین آمیز الفاظ کہے ہوں۔ اس لئے اتنی جلدی ایک مسلمان کے کفر کا حکم نہیں دینا چاہیئے۔

ایک دفعہ راقم الحروف (واصف) ریل کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہم رکاب تھا۔ جس ڈبے میں ہم دونوں تھے اُسی

میں دہلی کے سوداگروں میں سے دو معزز دولت مند حضرات بھی ہم سفر تھے اور ان کے قریب بھاری بھرکم قادیانی مولوی بھی بیٹھے تھے اور مرزا غلام احمد کی صداقت اور نبوت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک بڑا مولوی بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ بڑا لسان اور طرار معلوم ہوتا تھا۔ حضرت والد ماجد کچھ فاصلے پر تھے اور ان لوگوں کی گفتگو سُن رہے تھے۔ قادیانیوں کے مخاطب کبھی کبھی جواب دیتے تھے مگر پھر لاجواب ہو جاتے تھے۔ آخر حضرت نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر یہاں معاملہ دین کا ہے اس لئے خاموش نہیں رہ سکتا۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ابھی یہ جو فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور مرزا صاحب کی نبوت سے ختم نبوت میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا کیونکہ مرزا صاحب کی نبوت حضور ہی کی نبوت کا ایک جزو اور ضمیمہ ہے تو یہ فرمایئے کہ آپ علیہ السلام کے اس قول لا نبی بعدی میں تو کسی قسم کی نبوت کی تخصیص نہیں ہے۔ مطلق نبوت کی نفی ہے۔ ضمنی، غیر ضمنی، ظلی، بروزی کی تخصیص کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ لائے نفی جنس نے نبوت کے تمام اقسام اصناف کی نفی کر دی ہے۔ پھر بیچ میں نبوت ضمنی کیسی؟ قادیانی مولوی نے جواب دیا کہ جس طرح سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ اسی طرح ضمنی نبوت بھی ہوتی ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دائرہ عمل قیامت تک ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لئے آپ ہی کے دین کی تجدید کے لئے نبی آسکتا ہے اور اس سے آپ کے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرت مفتی اعظم نے فرمایا کہ نبوت کا چالیسواں حصہ اگر کسی کو عطا فرمایا جائے تو وہ شخص نبی نہیں بن جائے گا۔ انسان کی ایک انگلی کو انسان کا لقب نہیں دیا جا سکتا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ کے دعویٰ کے مطابق قیامت تک کے لئے نبی ہیں۔ پھر حضور کا یہ فرمانا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ بولئے جواب دیجئے۔

حضرت نے کئی مرتبہ فرمایا۔ بولئے جواب دیجئے۔ مگر ادھر ایسا سناٹا تھا کہ صدائے برنخاست۔ قادیانی اک دم مبہوت ہو گئے۔ بالکل جواب نہ دے سکے۔

پھر فرمایا کہ آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ حضور قیامت تک کے لئے نبی ہیں، خود اس امر کا اقرار ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد نبوت کا عہدہ کبھی کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ دوران نبوت میں کسی اور نبی کی بعثت کے کیا معنی اور اس کی ضرورت کیوں؟ بولئے جواب دیجئے مگر صدائے برنخاست۔ قادیانیوں پر اوس پڑ گئی اور شکست خوردگی کی وجہ سے چہرے زرد اور ہونٹ خشک ہو گئے اور بالکل ساکت وصامت ہو گئے۔ تو حضرت والد ماجد نے تقریباً ایک گھنٹے تک قادیانیت کے رد میں مسلسل تقریر فرمائی اس کے بعد دہلی کے ہم سفر حضرات نے دریافت کیا کہ حضرت آپ تعارف تو فرمایئے۔ فرمایا کہ مجھے کفایت اللہ کہتے ہیں۔ مدرسہ امینیہ کا مدرس ہوں۔ اس وقت کا منظر بڑا عجیب تھا۔ ڈبے کے تمام ہم سفر مسلمانوں نے یہ تقریر سُنی تھی۔ بہت شکریہ ادا کیا اور ان دولتمند حضرات نے کہا کہ حضرت ہم تو مذبذب تھے۔ آپ نے بروقت ہماری دستگیری کی اور اپنی اس کوتاہی پر بڑے نادم ہوئے، کہ دہلی میں رہتے ہوئے ہم شرف ملاقات سے محروم تھے۔ ادھر قادیانیوں کا حال یہ تھا کہ اِدھر اُدھر کی باتوں کا خیال بھی بھول گئے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب انگریزوں سے ترک موالات کا استفتاء پیش کیا گیا۔ تو نہایت انکسار نفس

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۶ھ
۱۸۷۹ء
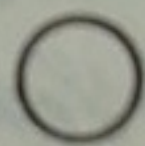
۱۳۷۷ھ
۱۹۵۷ء

عبدالرشید ارشد

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کی طرح حضرت مولانا مدنی کی شخصیت مسلمانوں میں مختلف فیہ ہے۔ اگر ایک جماعت کے نزدیک مولانا موصوف محبوب ترین مخدوم و رہنما تھے تو دوسرے گروہ کے نزدیک مبغوض ترین انسان۔ اور یہ بات ویسے کچھ فطری سی دکھائی دیتی ہے — جو انسان جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس کی مخالفت زیادہ ہوگی حضرت سید احمد شہیدؒ مسلمانوں کی ایک جماعت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کی نشانی تھے ان کا اخلاق وکردار، خلوص و عمل اس پایہ کا تھا کہ صحابہؓ کے بعد اس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔ اور دوسرے گروہ کے نزدیک وہ ہر کافر و مشرک اصلی سے بڑے آدمی تھے۔ یہی صورت حال مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ امت مسلمہ میں سے جس نے بھی کتاب و سنت کی راہوں پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنے علم و عمل کے اعتبار سے اس صدی کے نابغۂ روزگار انسانوں سے تھے۔ اور انہوں نے بچپن سے لیکر وفات تک جہد و عمل سے بھرپور زندگی گذاری ہے۔ ان کی ہمت مردانہ اور استقلال و استقامت کا ہر کوئی معترف ہے۔ دشمن و دوست سبھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مولانا غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اور عزم و ثبات کے اعتبار سے کوہ گران تھے۔ تحریک آزادی کے آخری دور میں مسلمانوں کی باہمی نظریاتی کشمکش اور سیاسی پیچیدگیاں کچھ اس طرح پیدا ہوگئیں کہ اس خارزار وادی میں کسی کا دامن ایسا نہیں رہا جو کانٹوں سے نہ الجھا ہو اور کسی کے تلوے زخمی ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اور پھر ہنگامی دور میں چونکہ جذبات کی فراوانی ہوتی ہے فضا میں ارتعاش ہوتا ہے۔ ہر کوئی تگ و دو میں مصروف ہوتا ہے لہذا کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ سکون کے ساتھ کسی فرصت میں حالات کا جائزہ لے کر کوئی صحیح فیصلہ کر سکے۔ مثل مشہور ہے کہ آٹھ دس دانشور ایک جگہ بیٹھے تھے۔ کہ اچانک دو آدمی ان کے سامنے آکر لڑنے لگے۔ ایک نے پستول چلایا اور دوسرا گر پڑا اس کے بعد دو تین آدمی آئے اور اس مقتول کو اٹھا کر لے گئے اور یہ سب کچھ آناً فاناً ایک دو منٹ میں ہوا، یہ تمام دانشور اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہوئے تو ہر ایک کا بیان مختلف تھا۔ تقریباً یہی حال تحریک آزادی پاک و ہند کے آخری دور کا تھا۔ جس میں جو کچھ ہوا وہ سب کچھ ان حالات کا تقاضا تھا ورنہ یہ صورت ممکن ہی نہیں کہ ایک طرف کے سارے لوگ بے ایمان، خود غرض، مفسد اور دوسروں کے آلۂ کار ہوں اور دوسری طرف کے سارے لوگ مخلص، نیک اور ایماندار ہوں۔ ایک نظریاتی کشمکش تھی۔ دو راہیں تھیں اپنے دلائل کے ساتھ قوم کے سامنے آرہی تھیں۔ ایک فیصلہ تھا جس کو قلم لکھ چکا اور سیاہی سوکھ چکی۔ ان حالات کا سہارا لے کر مدت بعد تک ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اخلاق و کردار، علم و عمل اور جہد و ایثار کو سامنے رکھ کر شخصیات کا مطالعہ کیا جائے۔ نظریات و خیالات میں ہمیشہ سے اختلاف چلا آیا ہے اور اگر یہ اختلاف نہ ہو تو زندگی ایک جمود سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس دنیا کی رونق اور آبادی اختلاف کی مرہون منت ہے۔

آئندہ سطور میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے حالات آرہے ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت مولانا کو دور سے دیکھا اور دور سے سنا وہ بھی سرسری۔ امید ہے کہ حضرت مولانا کے صحیح حالات جاننے کے بعد ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

حضرت مولانا کا خاندان

خاندانی تعارف خود حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے ایک خط سے جو انہوں نے ایک سائل کے جواب میں کہ کیا آپ سید ہیں؟ لکھا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"محترم المقام زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج شریف۔ والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یادآوری کا شکر گزار ہوں۔ میرے متعلق نسبی حیثیت سے سید ہونے کا انکار جن حضرات نے کیا ہے۔ وہ اس کے ذمہ دار ہیں میں تو اپنے نام کے ساتھ سید لکھتا بھی نہیں ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ مدار نجات نسب نہیں ہے۔ عمل ہے اگر نسبی حیثیت سے کوئی اعلیٰ درجہ کا عالی نسب ہے۔ مگر اعمال قبیح ہیں تو مثل پسر نوح علیہ السلام وہ راندہ درگاہ خداوندی ہے اور اگر چمار یا بھنگی زادہ ہے۔ مگر وہ مسلمان متقی ہے تو اس کی فرد و فلاح مثل حضرت بلال و صہیب رضوان اللہ علیہما ہے۔ میرے عمل اس ادعا کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے شرم آتی ہے

محترما! میں اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کا باشندہ ہوں۔ اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ کے بالکل متصل ہے تقریباً چار سو برس یا اس سے زائد سے ہمارے خاندان کی جائے سکونت ہے۔ وہاں کے اطراف و جوانب میں ضلع سلطان پور، اعظم گڑھ، اور فیض آباد کے دیہات اور قصبات میں صرف سادات اور بڑے ذات کے شیخ زادوں میں ہماری رشتہ داریاں صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ ہمارا آبائی پیشہ زمینداری اور پیری مریدی ہے۔ شاہانِ دہلی مغلیہ خاندان کے ابتدائی بادشاہوں نے یا ان سے پہلے بادشاہوں نے ہمارے اعلیٰ مورثوں کو ۵۲ گاؤں دیئے تھے جن میں سے سنہ ۱۸۵۷ء تک ۱۳ باقی رہ گئے تھے سنہ ۱۸۵۷ء میں ایک ہندو راجہ نے جس سے پہلے سے عداوت چلی آتی تھی۔ بڑوں کے انتقال اور بدعملی کی شامت کی وجہ سے سب پر قبضہ کر لیا۔ اور اللہ داد پور لوٹ لیا۔ ہمارے قدیمی کاغذات پر بھی قبضہ کر لیا۔ بے شمار خزانے، غلہ اور سامان اس نے لوٹا جس کو وہ ایک ماہ تک گاڑیوں میں منتقل کرتا رہا۔ اس کے حصار کے زمانہ میں عورتیں اور بچے بھیس بدل کر رشتہ داروں کے یہاں شہر ٹانڈہ کے بعض محلوں میں مامون تھے۔ پناہ گزین ہو گئے تھے اور دوسرے لوگ بھی نوکروں اور رعایا کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تھے بہرحال اگر کسی کو تفتیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد دور نہیں ہے۔ وہاں جا کر تفتیش کر کے حال معلوم کر سکتا ہے سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد صرف دو گاؤں ہمارے خاندان کے پاس رہ گئے تھے جن میں والد مرحوم کا ایک آنہ آٹھ پائی تھا جس کو فروخت کر کے والد مرحوم نے حجاز کا قصد کیا تھا۔

ہمارے مورث اعلیٰ جو کہ اللہ داد پور میں اولاً پہنچے ہیں۔ انکا نام شاہ نور الحق قدس سرہ العزیز ہیں۔ ان سے مجھ تک سترہ پشتیں گزری ہیں جن کا سلسلہ حسب ذیل ہے۔

حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی بن سید جہانگیر بخش بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن بن شاہ محمد ماہ شاہی بن شاہ خیر اللہ بن شاہ صفت اللہ بن شاہ محب اللہ، بن شاہ محمود، بن شاہ لدھن بن شاہ قلندر بن شاہ منور بن شاہ راجو بن شاہ عبد الواحد بن شاہ محمد زاہد بن شاہ نور الحق قدس اللہ تعالیٰ

والسلام"

"چونکہ بدن میں حرکت پیدا ہوتی تھی۔ اس لیے لوگوں کے مطلع ہونے کا خیال اس امر کے باعث ہوا کہ بیرون شہر قریب مسجد اجابہ بعض افتادہ کھجوروں کی حائطوں میں تنہائی میں جب تک جی لگے ذکر کیا کروں۔ چنانچہ اس حالت پر ایک زمانہ گزرا۔ اس اثنا میں جو رویائے صالحہ اور حالتیں پیش آتی تھیں۔ گنگوہ شریف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں بذریعہ مکاتیب پیش کرتا رہتا تھا۔ الطاف بیکراں کے ساتھ ہمیشہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جوابات میں مفید ارشادات کے ساتھ اعانت فرماتے رہے۔ اسی اثنا میں ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ گیارہ حضرات اولیاء اللہ میں سے تشریف لائے ہیں اور فرمایا کہ ہم تجھ کو اجازت دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ ابراہیم ابن ادھم رحمۃ اللہ علیہا ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ ایک تہائی کھجور کا عنایت فرمایا اور کہا کہ باقی دو ثلث دوسرے مشائخ طریقت کے ذریعے سے تجھ کو دیئے جائیں گے۔ اس قسم کے بہت سے خواب دیکھے بالآخر غالباً ۱۹۰۱ء کے رمضان یا شوال میں گرامت نامہ پہنچا کہ تجھ کو ایک مہینہ کے لیے گنگوہ آنا چاہیئے۔ اس پر حضرت والد صاحب مرحوم نے ارادہ فرمایا کہ صرف مجھ کو گنگوہ شریف بھیجیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کو وہاں کی حاضری کا بہت زیادہ شوق تھا۔ وہ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ میں خفیہ طریقہ پر بقصد حاضری گنگوہ شریف روانہ ہو گئے۔ اگرچہ حضرت والد صاحب کا مقصد یہ تھا کہ بعد از حج جب کہ قوافل (قافلے) مدینہ منورہ سے جدہ واپس ہوں گے۔ اس وقت مجھ کو بھیجیں گے۔ مگر بھائی صاحب کی تنہائی کی بنا پر حکم فرمایا کہ تو بھی چلا جا۔ بھائی صاحب حج قریب ہوئے اور جہاز نہ ملنے پر کہ معظمہ چلے گئے۔ چنانچہ ہم دونوں نعمت حج اور عمرہ سے فیضیاب ہونے کے بعد جدہ واپس ہوئے مگر دخانی جہازوں کا کرایہ زیادہ تھا جس کے ہم متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ بالآخر اوائل محرم ۱۳۱۹ھ میں بادبانی جہاز (دبغلہ) مسقط جانے والا جس نے تقریباً سوا مہینہ کے بعد مسقط پہنچایا۔ مسقط سے ہر ہفتہ میں دخانی جہاز کراچی جاتا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد وہ جہاز آیا۔ دو روپیہ فی ٹکٹ پر کراچی پہنچنا ہوا اور پھر اوائل ماہ ربیع الاول میں گنگوہ شریف کی حاضری نصیب ہوئی۔ اس اثنا میں تمام راہ میں میرے مشاغل سلوک برابر جاری رہے اور بفضلہ تعالیٰ رویائے صالحہ اور مختلف احوال وارد ہوتے رہے۔ گنگوہ شریف پہنچنے پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت زیادہ عنایات فرمائیں۔ والد صاحب مرحوم کے خطوط سے چونکہ حضرت کو پوری کیفیت معلوم ہو چکی تھی۔ اس لیے یہاں انتظار تھا۔

بھائی صاحب مرحوم سہارنپور سے بالا بالا حاضر خدمت ہوئے اور میں نے عرض کیا کہ میں پہلے دیوبند جاؤں گا۔ اور وہاں سے خدمت اقدس میں حاضر ہوں گا۔ بھائی صاحب مرحوم سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں کے لیے ہم نے ایک ایک جوڑا کپڑا تیار کرا رکھا ہے۔ مگر حسین احمد کے حاضر ہونے کے بعد دوں گا۔ چنانچہ جب میں دیوبند سے براہ نانوتہ پیدل حاضر ہوا۔ تو وہ جوڑے جو کہ ابھی جدید تھے۔ ہر ایک کو عطا کئے گئے۔ چونکہ اس میں کرتا پاجامہ ٹوپی ہی تھی۔ اس لیے بھائی صاحب مرحوم نے عرض کیا کہ حضرت ہم دونوں اپنے اپنے عمامے لاتے ہیں اور پیش کر دیتے ہیں۔ جناب انکو بھی ہمیں دے دیں۔ فرمایا کہ اس کو پھر دیکھا جائے گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بکمال شفقت آخری شغل سلوک تلقین فرمایا۔ میں نے اپنے رویائے کو جو کہ راستہ میں دیکھے تھے۔ تنہائی میں پیش کیا جن میں سے ایک یہ تھی کہ میں حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں اور اس سے پہلے ایک مقدار کھجوروں کی حضرت کے یہاں لطور ہدیہ پیش کر چکا ہوں۔ تو

حضرت نے فرمایا کہ تم خود اگر ان کھجوروں کو تقسیم کردے۔ میں نے عرض کیا حضرت یہ کھجوریں تو میں آپ کے لیے لایا ہوں میرے یہاں تو اس کی دوکان ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا نہیں میں جانتا ہوں کہ کن مشقتوں سے کھجوریں حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اس خواب کو سن کر فرمایا۔ حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں سے تجھ کو اجازت ہو گئی۔ میرے یہاں سے بھی عنقریب ہو جائے گی۔

چونکہ اجازت وخلافت میرے گمان میں بھی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو اس کا خواستگار نہیں ہوں۔ اس پر خالبا سکوت فرمایا۔ بارگاہ رشیدی کی حاضری میں بفضلہ تعالیٰ معنوی نعمتیں بہت حاصل رہیں۔ ایک شب پندرہ دن کے بعد۔ بعد عشاء میں حضرت کی کمر دبا رہا تھا۔ بین النوم والیقظہ کی حالت ہوئی اور سنا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ تجھے چالیس دن بعد اجازت ہوگی۔ اس کے ٹھیک ۴۰ دن بعد حضرت نے بعد عصر فرمایا کہ اپنے عمامے لے آؤ۔ بھائی نے دو عمامے حاضر کئے۔ حضرت نے ہر دو کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے دست مبارک سے باندھے۔ اس کے بعد بھائی صاحب نے فرمایا، جانتے ہو کیسی دستار تھی؟ بھائی صاحب نے فرمایا۔ یہ دستارِ فضیلت تھی۔ فرمایا نہیں یہ دستارِ خلافت ہے تم دونوں کو مجھ سے اجازت ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ خدمت میں رہنا ہوا۔ مگر بہت جلد افتراق جسمانی کی نوبت آگئی۔ افسوس کہ اپنی تن پروری اور نفس پرستی ہمیشہ میدان عمل میں سد راہ ہوتی رہی۔ جس کی بناء پر ناقص رہا۔ ورنہ نعمائے الٰہیہ نے کبھی بخل نہ فرمایا اور نہ حضرت مرشدی قدس سرہ العزیز کی توجہات اور حضرت شیخ الہند کی برکات نے افاضہ سے کوتاہی کی

سودہ گشت از سجدہ راہ بتاں پیشانیم ❀ چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہیم

از نکتۂ مقصود نہ شد فہم حدیثے ❀ لادین ولا دنیا بیکار بما ندیم

حضرت شیخ الہند کی خدمت میں اگرچہ زیادہ رہنا نصیب ہوا۔ مگر باوجود ان کی توجہات کے اپنی نالائقیوں نے گل کھلانے میں کمی نہ کی۔ غرضیکہ میں اپنے اسلاف اور اکابر کرام کے لیے ننگ وعار ہی رہا اور حضرات اہل چشت اور دیگر مشائخ اہل طریق کا صحیح معنوں میں بدنام کرنیوالا۔ تاہم مجھ کو افضال خداوندی سے امیدیں ہیں کہ مثل سگ اصحاب کہف مجھ کو اپنے اولیائے کرام کے فیوض سے مستفید بزیکار قدر عنایت فرمائیں گے اور اپنے بھائیوں سے امیدوار ہوں کہ دعوات صالحہ اور توجہات وہم سے اس روسیاہ کی دستگیری فرمائیں گے۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

(از سلاسل طیبہ)

اسارتِ مالٹا اور حضرت شیخ الہند کی معیت

مشک از ز چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے ❀ مشک بن جاتا ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تقریباً سولہ سترہ سال مسجد نبوی درس حدیث دیتے رہے۔ تشنگان علوم دین ہزاروں کی تعداد میں اس چشمہ صافی سے سیراب

اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد اسلامیانِ ہندوستان کے سب سے محبوب قائد حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جنکو پوری قوم نے متفقہ طور پر اب شیخ الہند کہنا شروع کر دیا تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد تمام خاندان تمام معتقدین، تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا کہ حضرت شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں۔

اس زمانہ میں سیاسی تحریکات کا شباب تھا، لیڈروں کا شمار نہ تھا۔ مگر تمام سیاسی لیڈروں نے حضرت شیخ الحرم کو شیخ الہند کا جانشین تسلیم کیا اور ہر اخبار جو حضرت مولانا مدنی کا نام شائع کرتا تھا، آپ کے نام کے ساتھ جانشین شیخ الہند ضرور لکھتا تھا۔

چنانچہ آپ نے صحیح صحیح جانشین ہونیکا پورا پورا ثبوت دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سنبھال لیا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ کی طرح خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دینے لگے اور عدم تشدد کے راستے پر چل کر حکومت برطانیہ کے خلاف ملک وقوم کی سیاسی تحریکات میں جوشِ عمل کی روح پھونکنے لگے۔

مقدمۂ کراچی

اگرچہ ابھی مالٹا سے تشریف لائے ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے۔ مگر یہ سرفروش رہنما اور کتاب وسنت کا ترجمان پھر ملک وملت کے لیے عظیم قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔

چنانچہ ۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی خلافت کانفرنس ہوئی جس میں حضرت شیخ نے ایک تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ

"گورنمنٹ برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی اعانت کرنا سب حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچادے"

شرکاء کانفرنس نے یہ تجویز پسند کی اور پاس کر دی۔ یہ تجویز اخبارات میں آئی۔ کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ غرض پورے ملک میں شور مچ گیا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت شیخ اور شرکائے کانفرنس گرفتار کر لیے جائیں گے۔ مگر فوری گرفتاری عمل میں نہ آئی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند میں گرفتاری کی افواہ پھیلی اور دیوبند کے تمام لوگ مضطرب وبے چین ہو گئے۔ ہر شخص کی زبان پر تھا کہ ہم حضرت کو گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔ بعد دوپہر ایک انگریز افسر کچھ مسلح پولیس لے کر دیوبند پہنچا اور شام کو حاکم پرگنہ اور مقامی تھانیدار کو لے کر مسلح پولیس کے ساتھ نکلا۔ عوام کو فوراً پتہ چل گیا فوراً بازار بند ہو گئے اور لوگ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں میں انگریز افسر کے خلاف اتنا اشتعال پھیلا کہ وہ اس کو قتل کرنے پر تیار ہو گئے اور سرکاری افسر جو وارنٹ لے کر آئے تھے، مکوں اور تھپڑوں سے حملہ کر دیا۔ اتنے میں حضرت شیخ اور دوسرے ذمہ دار حضرات آگئے اور انھوں نے بمشکل تمام افسروں کو بچا کر تہ خانہ میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ پولیس باہر تھی۔ مگر ان کو حکم دینے والے بند تھے۔ مجمع مطالبہ کر رہا تھا کہ انکو ہمارے حوالے کر دو۔ حضرت مدنی نے ان جوشیلے عوام کو پند ونصیحت کے سرد جام پلا کر ٹھنڈا کیا اور ان کو اس شرائط پر راضی کیا کہ پولیس اب رات کو گرفتار نہیں کریگی۔ بلکہ صبح کو ہم خوشی خوشی اپنے محبوب قائد کو جلوس کی شکل میں اسٹیشن پر پہنچا کر ریل میں بٹھائیں گے۔ ڈپٹی کلکٹر اور انگریز افسر نے یہ شرائط مان لیں اور لوگ رات کے گیارہ بجے منتشر ہو گئے۔

لیکن انگریز افسر نے سہارنپور اطلاع بھیجدی کہ دن میں مولانا مدنی کو گرفتار کرنا ناممکن ہے۔ فوراً گورا یا گورکھا فوج بھیجدی جائے تاکہ رات ہی رات انکو گرفتار کر کے دیوبند سے لے جایا جا سکے۔ ورنہ قصبہ میں اتنا بڑا ہنگامہ ہوگا جس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملے گی۔ چنانچہ سہارنپور سے رات ہی ایک سپیشل گاڑی میں گورا اور گورکھا فوج پہنچ گئی۔ سب ہی لوگوں کو یقین تھا کہ رات کو ضرور فوج آئے گی۔ کچھ لوگ پہرہ دے رہے تھے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہو گیا کہ فوج نے شہر کے اہم مقامات اور شاہراہیں روک دی ہیں اور حضرت شیخ کے مکان کا پورا محاصرہ کر لیا۔ حضرت شیخ گھر سے باہر تشریف لائے اور اپنے

کانگریس کے ساتھ باضابطہ تعاون برائے مکمل آزادی

حضرت شیخ نے اس دوران پانچ چھ برس بنگال اور آسام میں بسر کیے تھے۔ آپ جس زمانہ میں سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اسی زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم انقلاب آیا اور بزرگوں میں اختلاف پیدا ہوا، اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیتیں دارالعلوم سے علیحدہ ہوگئیں۔ ان حالات میں دارالعلوم میں جو اتنا بڑا خلا پیدا ہوا، اُسے پُر کرنے کے لیے حضرت صاحب مولانا حافظ محمد احمدؒ، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم کی نظر حضرت شیخ پر پڑی۔ ان حضرات نے حضرت کو دارالعلوم بلاکر بے حد اصرار کیا کہ آپ دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئیں۔ حضرت کا انکار تھا۔ مگر ان حضرات کے بے حد اصرار پر صدر مدرسی کا منصب اس شرط پر قبول کیا پر تیار ہوگئے کہ آپ سیاسی تحریکات میں بدستور حصہ لیتے رہیں گے۔ دارالعلوم کی جانب سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بہرحال آپ دیوبند تشریف لے آئے اور پورے ہندوستان میں اسلامیانِ ہند کی سیاست کی سرپرستی و قیادت کرتے رہے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر فرماتے تھے کہ مکمل آزادی کے بغیر ہندوستان کے مصائب کا حل ناممکن ہے۔

چنانچہ کانگریس یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نازک وقت میں حضرت مدنی کی ذات گرامی قدر تھی۔ جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے۔ وہی برسرِ اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اور مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لیے کانگریس کی شرکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جمعیت علماء ہند کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مرادآباد میں کیا گیا۔ جنگ آزادی کی خاطر کانگریس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا۔ کہ اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اس بارے میں تعاون کیا جائے اور جمعیۃ علماء ہند نے ایک مستقل دائرہ حربیہ قائم کیا۔

حضرت مدنی اور سلوک و تصوّف

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حیات طیبہ جب ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر صحابہؓ بہت سی صفات کے جامع تھے وہ بیک وقت صف شکن مجاہد تھے، عالم دین تھے، مدبر و سیاست دان تھے، عمال حکومت تھے، مرشد و شیخ تھے۔ اپنی گوناگوں صفات و خصوصیات کی بنا پر ان میں ایک ایک کئی کئی کے برابر تھا یہی وجہ تھی کہ تعداد میں قلیل ہونے کے باوجود کسی شعبہ حیات میں کسی کلیدی جگہ کے لیے بھی کام کے افراد کی کمی نہ تھی۔ انھیں حضرات کرام کے بارے میں علمائے امت کا بیان ہے:

بالليل رهبان وبالنهار فرسان — رات مصلے پر گزرتی اور دن گھوڑے کی پیٹھ پر

اس امت مرحومہ میں بعد میں بھی ایسے ایسے جامع لوگ پیدا ہوتے رہے۔ جو بیک وقت زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کر سکتے تھے اور کرتے رہے۔ اس آخری دور میں حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید انھی لوگوں میں سے تھے جو بیک وقت مسند ارشاد و ہدایت کے نشین بھی تھے اور معرکہ جنگ کے جانباز سالار بھی۔ دارالعلوم دیوبند نے بھی ایسی کئی شخصیتیں پیدا کیں جن میں سر فہرست نام بانیان دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ امت میں ایسے لوگ تو بے شمار پیدا ہوئے جنھوں نے کسی خاص شعبہ میں مہارت حاصل کی اور شہرت و عزت کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔ مگر جامع انسان خال خال پیدا ہوئے۔

دوسرے بزرگوں کے حالات اسی کتاب میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ یہاں پر حضرت مدنی کے حالات اختصاراً ذکر کیے جا رہے ہیں۔ حضرت کے رسوخ فی العلم والسیاسۃ کے متعلق شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا شعبہ تہذیب اخلاق کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی بہت

حق کی طرف توجہ کا یہ حال کہ ایک قدم شریعت و سنت کے خلاف نہیں اٹھتا۔ منہ پہ اگر کوئی تعریف کرتا ہے تو کھڑے ہو کر اسے روک دیتے ہیں۔ مجال نہیں کہ سٹیج پر کوئی شاعر شیخ کی مدح میں کوئی قصیدہ پڑھے۔ جہاں کسی نے تعریف میں زبان کھولی اور جمالی درویش کا جلال بھڑک اٹھا۔ بندگی کا اتنا گہرا رنگ کہ اگر کوئی عقیدت کے جوش میں ہاتھ چومنے کے لیے ذرا جھکے تو ہاتھ کھینچ لیں۔ کسی کو پیر دبانے کی اجازت نہ دیں اور خود رات کو سوتے میں اپنے مہمانوں کو ہمیشہ دبا دیا۔ پھر توجہ الی الحق کا یہ عالم کہ بندگانِ الٰہی کو انگریزی سامراج کے ظلم کی چکی میں پستا ہوا دیکھا تو پوری قوت سے آزادی وطن کے لیے میدان میں اتر آئے۔ ذکرِ الٰہی اور محبتِ رسول پر وعظ فرمایا تو دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا۔ برطانوی سامراج کے مذموم ارادوں اور انسانیت سوز مظالم پر تقریر کی تو کروڑوں میں حریت و آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔

پھر آزادی کی جدوجہد، کسی لالچ میں نہیں، کسی عہدے کے لیے نہیں، صرف بندگانِ الٰہی کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے۔ وطن عزیز کی پیشانی سے غلامی کا داغ مٹانے کے لیے اور صرف "حبِ وطن" کی سنتِ رسول کو زندہ کرنے کے لیے!

کسے معلوم تھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستی سے ناپاک وطن کو ظلم و ستم سے بھرے دشمن۔ وطن یعنی مکہ کو پاک اور محبوب فرمایا تھا۔ مکہ کو چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

ماا طیبک بلد واحبک مکہ! تو کس قدر پاک ہے اور مجھے محبوب ہے۔

یہ محبتِ وطن کا اعلان تھا۔ اسی سنت کو، اس مجاہد نے زندہ کر کے دکھایا۔ اس پر ملک و وطن میں بڑی بڑی بحثیں ہوئیں مگر وہ اپنی جگہ مطمئن تھا اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم بن سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادی وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے وطنیت اور قومیت کے نعرہ پر اس شیخ مجاہد کو مطعون کیا تھا۔ انھوں نے پاکستان میں پاکستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم کہا۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو فراموش کر سکتی ہے؟

یہ مدنی درویش کی جامع صفاتِ شخصیت کے چند نقوش ہیں۔ جب کوئی اللہ کا بندہ اس ولی کامل مردِ مجاہد، غازی اسلام کے حالات پر کچھ لکھنے بیٹھے گا تو وہ بتائے گا کہ۔

حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کون تھے اور کیا تھے؟

مسندِ ارشاد و ہدایت پر بیٹھ کر شیخ مدنی نے جو کام کیا۔ وہ اتنا زیادہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے کہ ایک شیخ الحدیث، سیاسی لیڈر، اور مدبر و مفکر اپنی ان بے پناہ مصروفیات سے اتنا وقت کیسے نکال لیتا تھا کہ مسترشدین پر بھی توجہ دے سکے اور اپنے لاکھوں مریدوں کے حالات کوائف معلوم کر کے ان کی تربیت کر سکے لیکن یہ ہماری جہل ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جب اپنے کسی بندے سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کے وقت میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ دوسرے اسلامی ممالک تک حضرت مدنی کے مرید پھیلے ہوئے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ حضرات جنھیں حضرت سے آگے مرید کرنے کی اجازت ہے جنھیں خلفائے مجاز کہتے ہیں۔ صرف ان کی تعداد ایک سو ساٹھ تک پہنچتی ہے۔

مکارم اخلاق

حضرت مدنی کی زندگی کا یہ باب بہت وسیع ہے۔ اس سلسلہ میں آپکے فضائل و محاسن کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔ حضرت نے لمبی عمر پائی اور اتنے لمبے عرصہ میں کروڑوں انسانوں سے ملاقات ہوئی۔ ہر کہ و مہ آپ کے حسنِ اخلاق کا مداح نظر آتا ہے اور ہر کوئی حضرت کی تواضع، انکساری اور حسن خلق کا نیا قصہ سناتا ہے اور اگر ان تمام واقعات کو جمع کیا جائے جو مختلف لوگ بیان کرتے ہیں۔ تو صرف انکو قلم بند کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیئے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا تاثر ملاحظہ فرمایئے۔

اور اپنا مرتبہ سے زیادہ مزہ آیا ہے۔

تواضع اور انکساری

انسان کی انسانیت اور برتری و سربلندی کا اصلی راز تواضع اور انکساری میں مضمر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رفعت و سربلندی عطا فرماتے ہیں۔" یہی تواضع وانکساری اصل شانِ عبدیت ہے۔ جو شخص بھی اپنی حقیقت کا شناسا ہوگا۔ وہ مجسمہ تواضع ہوگا اور کبر و غرور سے بالکل مبرا ہوگا جو عبدیت کے بالکل منافی اور متضاد ہے۔

حضرت مدنی کے متعلق گزشتہ سطور میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر گزر چکی ہے کہ خادم کو مخدوم بنا کر چھوڑتے تھے۔ واقعۃً حضرت مدنی تواضع اور انکساری کا ایک مجسمہ تھے۔ کبھی صدر مقام پر نہ بیٹھتے تھے اور ہمیشہ نشست کے لیے مجلس کا گوشہ اختیار فرماتے تھے۔ ہر ایک چھوٹے بڑے کو "آپ" کے لفظ سے خطاب فرماتے تھے اور ہمیشہ اس انداز سے گفتگو فرماتے تھے کہ گویا چھوٹا اپنے بڑے سے گفتگو کر رہا ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ گفتگو کا یہی انداز تھا۔ گویا ان کی نظروں میں سب بزرگ تھے اور یہ خورد۔ ہر کام کے لیے خود سبقت کرتے اور ہر محنت و مشقت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے۔

غایتِ تواضع اور انکساری کی وجہ سے اپنے مخالفین و معاندین کا بھی ہمیشہ اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور کسی کو بُرے لفظ سے یاد نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ برطانیہ جس کی عداوت و نفرت آپ کی فطرت بن چکی تھی۔ اس کو بھی ہمیشہ "ہماری مہربان گورنمنٹ" فرمایا کرتے تھے۔ اگرچہ اس لفظ "مہربان گورنمنٹ" میں پورا طنز ہوتا تھا اور بعد کی تقریر میں گورنمنٹ برطانیہ کی تمام مہربانیوں کا راز فاش ہوتا تھا۔ حضرت مدنی کی یہی خاکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوق خدا کو آپ کا گرویدہ اور شیدائی بنا رکھا تھا اور آپ ہر ایک کے سردار اور سرتاج بنے ہوئے تھے۔

اس انتہائی خاکساری کے باوجود حضرت مدنی وقار و تمکنت کا کوہِ طور یا کوہ نور تھے۔ ایک خاص نوع کا ہیبت و جلال چہرے پر عیاں تھا۔ باوجودیکہ حضرت مدنی ہنس ہنس کر باتیں فرمایا کرتے تھے۔ مگر مخاطب کا دل اندر سے لرزتا رہتا تھا اور بمشکل بات کی جا سکتی تھی۔ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی فرماتے ہیں۔ "میرا حال تھا جو اپنی نالائقی کی وجہ سے تمام بزرگوں سے بات کہنے کا عادی تھا حتیٰ کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی بے دھڑک جو جی میں آتا تھا کہہ دیتا تھا اور حضرت تھانوی کی جانب سے کبھی کسی گرانی یا ناگواری کا کبھی اظہار نہیں ہوا۔

میں نے اکثر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ سُنا ہے "حضرت مدنی سے ڈر لگتا ہے۔" بارہا ایسا ہوا کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کسی خاص مقصد اور بات کے لیے دیوبند گئے۔ وہاں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلف ملاقات ہوئی اور ہنس ہنس کر باتیں ہوئیں۔ مگر مقصد کی بات زبان پر نہ آئی اور واپسی کے بعد فرمایا۔ "حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔"

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ لباس کے معاملہ میں سنت کا اور کھدر پہننے میں بہت متشدد تھے۔ اور ہمیشہ ساری عمر کھدر پہنا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی اشیاء استعمال دیسی استعمال کرتے تھے۔ اور ملنے جلنے والوں سے بھی یہی پسند کرتے تھے کہ وہ دیسی کپڑا پہنیں اور دیسی اشیاء استعمال کریں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انگریز اور اس کے ساختہ اشیاء سے نفرت مقصود تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت کا منشا تھا کہ ہمارے معاشرہ میں سادگی اور بے تکلفی آ جائے تاکہ زینت و لباس پر جو ہمارے ہاں بے اندازہ اخراجات اٹھ جاتے ہیں۔ وہ کم ہوں اور اس دیسی لباس کے بارے میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی میت کو لٹھے وغیرہ کا کفن دیا جاتا تو اس کا جنازہ پڑھنے تو تشریف لے جاتے تھے مگر پڑھاتے نہیں تھے۔

بعض جلیل القدر مشائخ طریقت محض اس لیے کھدر پہننے کا اہتمام فرماتے تھے کہ شاید حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو جائے اور ملاپ کرنے سے ان کو گرانی اور ناگواری ہو۔

ایک دن مولانا رشید احمد نبیرہ حضرت حاضر ہوئے تو ان کو بلا کر کہا کہ یہ چار منی آرڈر فارم لے لو اور منی آرڈر کرا دو۔ ان میں سے ایک کسی لڑکی کے نام تھا۔ جس نے خط آیا تھا کہ میرے پاس سکول کی اس ماہ کی فیس نہیں ہے۔ اگر جمع نہ کرائی تو نام خارج ہو جائے گا۔ آپ بہت سخی ہیں ملتجی ہوں۔ حضرت نے فیس کی رقم سے کچھ زائد بھیجی تھی اور تسلی دی تھی۔ اور اسی طرح مستقل امداد چاہنے والوں کو اس سخت بیماری کی حالت میں نہیں بھلے نے مہمانوں کے متعلق مسلسل صاحب زادہ کو ہدایت دیتے رہتے تھے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔

وصال سے تین دن قبل تنفس اور سینے کی تکلیف ختم ہو گئی۔ عام خیال تھا کہ صحت ہو گئی۔ اب کمزوری باقی ہے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ حق تعالیٰ نے ہوں نے زندگی کے بعد حیات مقدس کی شمع کو ایک بار بھڑکا دیا ہے اور کچھ دیر بعد اس تاریک دور میں علم و عرفان کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے گا۔

تین چار دن قبل کھانے پینے سے رغبت ختم ہو گئی۔ ایک دو چمچے کسی چیز کے کھا لیتے۔ ان ہی دنوں ایک دن فرمایا۔ سردا نہیں ملتا۔ عرض کیا مل جائے گا۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود کہیں سے نہ مل سکا۔ فرمانے لگے، زندگی میں پہلی بار کسی چیز کی خواہش کی تھی —

اللہ اللہ کتنی بڑی بات فرما دی۔ دراصل حضرت کی زندگی اس قسم کی خواہشات سے بہت بلند و بالا تھی۔ بالآخر یہ خواہش پوری ہو گئی۔ کراچی اور لاہور سے سردا آ گیا۔ کراچی سے مولانا سجاد حسین کی معرفت اور لاہور سے مولانا حامد میاں نے بھیج دیا۔

ایک دن حضرت کو معلوم ہوا کہ ارشد سلسلہ روزے رکھتے اور چار بجے مخلصین کے ساتھ دعائے صحت کرتے ہیں۔ اس پر مولانا اسعد کو بلا کر ڈانٹا۔ کہ بری صحت کے لیے یہ لوگ اپنی صحت کیوں خراب کرتے ہیں۔ ایک رات قبل سر ترنم آواز سے یہ شعر گنگناتے رہے۔

الٰہی میری زندگی ہے کیسی — نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

آخری دن صحن میں چارپائی لائی گئی۔ اور یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ غیر اختیاری طور پر پوری کرائی۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتقال سے چند گھنٹے قبل دو صحابیوں کے ہمراہ مسجد نبوی تک تشریف لائے تھے اور جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس جہان سے تشریف لے گئے۔ تقریباً اسی وقت اس محب رسول ہندی نژاد حسین احمد مدنی کا تین بجے بعد ظہر انتقال ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال بھی ۱۳ جمادی الاول بروز جمعرات بعد نماز ظہر ہوا۔ اور یہی وقت و تاریخ و مہینہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کا ہے۔

قرب و جوار کے شہروں میں اسی وقت فون پر یہ وحشت ناک خبر پہنچ گئی۔ لوگ دیوانہ وار دیوبند پہنچ گئے۔ دور دراز کے لوگوں کا خیال تھا کہ جمعہ کو بعد جمعہ تدفین عمل میں آئے گی۔ مگر صاحب زادہ مولانا محمد اسعد نے فرمایا کہ ابا جان ساری عمر سنت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اور حضور کا ارشاد ہے کہ تدفین میں عجلت کی جائے۔ ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔ اگرچہ حضرت کی یہ وصیت نہیں ہے۔ تاہم ان کی خوشی اسی میں ہے اور اس متبع سنت کی میت کے احترام کا تقاضہ ہے کہ آخری راحت گاہ پر جلد سے جلد پہنچایا جائے۔ دیر لگا کر مسافر کی منزل کھوٹی کرنا مسافر کا احترام نہیں۔ بلکہ اس کی شان میں ایک قسم کی گستاخی ہے۔

بہرحال صاحبزادہ محترم نے فرمایا کہ تاخیر سے حضرت کی روح کو اذیت دینا نہ قرین انصاف ہے نہ تقاضائے احترام۔ مختصر یہ کہ اگرچہ مرکز علماء یعنی دارالعلوم کی شان اور خود حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق و اتباع سنت کا لحاظ کرتے ہوئے جلدی کی گئی۔ مگر تب بھی اپنے ہوش و حواس سنبھالنے اور غسل و کفن کے انتظام میں تقریباً ۸ گھنٹے لگ گئے۔

دیکھا گیا۔

بہرحال اللہ تعالٰے حافظ و ناصر ہے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر جس زمانہ میں سر سکندر حیات کی حکومت نے ایک مقدمہ چلا رکھا تھا جس میں پھانسی کی سزا کا اندیشہ تھا اور لوگ سخت پریشان تھے۔ اس وقت کچھ لوگ نہایت متفکرانہ انداز میں حضرت کی خدمت میں دعا کے لیے پیش ہوتے۔ حضرت سب کی سنتے رہے۔ آخر میں کچھ فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ راہِ حق میں قربان ہونا تو بہت بڑی سعادت ہے۔ اس میں فکر کی کونسی بات ہے۔ "بہرحال اللہ تعالٰی حافظ و ناصر ہیں" ان الفاظ سے بخوبی حضرت کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے کہ راہِ حق میں یہ خوفناک سزا بھی حضرت کے لیے ایک مرغوب شے ہے۔ بہرحال کچھ ہی دنوں بعد حضرت کی یہ اجمالی پیشین گوئی پوری ہوئی اور شاہ صاحب موصوف بری ہو گئے۔

آپ اطمینان سے اچھی طرح کھایئے ~~چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست~~ کے مصداق آپ کا خوانِ کرم اپنے پرائے ہر ایک کے لیے کشادہ رہتا تھا۔ مہمانوں کا ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا اور لطف یہ کہ چھوٹا بڑا، امیر، غریب، حاکم، محکوم، بلا امتیاز بندہ و آقا سب ایک دسترخوان پر حلقہ کی شکل میں بیٹھے ساتھ ساتھ کھاتے نظر آتے تھے۔ حضرت کی عجب شان ہوتی تھی۔ سنت کے مطابق نمازی کی سی شکل میں بیٹھے بیٹھے کھانا تناول فرماتے رہتے تھے اور نگاہیں چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں۔ جس مہمان کے سامنے روٹی ختم ہونے لگتی تھی۔ فوراً اپنے پاس سے گرم روٹی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ مہمان نوازی کے سنت کے مطابق اور اس خیال سے کہ کوئی مہمان بھوکا نہ رہ جائے، کھانا آخر تک کھاتے رہتے تھے۔ حالانکہ سب سے کم کھاتے تھے۔

ایک مرتبہ کھانے کے موقع پر ایک صاحب جو بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔ دوسرے حضرات کے سفید پوش اور معزز ہونے کی وجہ سے مرعوب ہو کر کھانے کے حلقے سے پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت نے دیکھا تو ساتھ کھانے کے لیے فرمایا۔ اتفاق سے وہ ایسے صاحب کے پاس آ بیٹھے جو بہت معزز اور سفید پوش تھے۔ اور ان کے ساتھ بیٹھنے سے کچھ کبیدہ سے معلوم ہوتے تھے۔ اول الذکر اس چیز کو محسوس کر کے کچھ پریشانی کے ساتھ مرعوب ہو کر کھاتے رہے۔ حضرت نے اس کو بھانپ لیا اور ان سے فرمایا کہ آپ اُٹھیے۔ وہ نہ اُٹھے۔ تو دوبارہ فرمایا اُٹھیے آپ اٹھیے۔ اب وہ اٹھے۔ تو حضرت نے ان کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور فرمایا۔ آپ اطمینان سے اچھی طرح کھایئے۔ پھر فرمایا کسی کو کیا معلوم کہ اللہ تعالٰی کے یہاں ان بوسیدہ حال لوگوں کا کتنا اونچا درجہ ہوگا۔ سفید پوش پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ نہایت شرمندہ ہوئے اور بعد میں ان صاحب سے معافی مانگی۔

یہ پچاس روپلے ماہوار بھیجتے رہے مہمان نوازی کی اس وسعت پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ بہت سے ضرورت مندوں، یتیموں، اور بیواؤں کی امداد کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا تھا۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ جب تک حجاز میں رہے۔ حضرت ہمیشہ ان کو پچاس روپلے ماہوار ارسال فرماتے رہے۔ جو، سما کا یہ سلسلہ اس قدر پوشیدہ رہتا تھا کہ بہت سے قریبی حضرات کو بھی اطلاع نہ ہوتی تھی۔

یہی کھانا کافی ہو جائے گا حضرت مولانا عبد السمیع صاحب مدرس دار العلوم نے مشکوٰۃ شریف کے درس کے دوران کتاب المعجزات کے ضمن میں حضرت کا ایک واقعہ قسم کھا کر سنایا تھا۔ اس موقعہ پر سے زیادہ

طالب علم موجود تھے۔ انھوں نے بیان فرمایا کہ میں نے ایک روز حضرت کی دعوت کی۔ اتفاق سے اس وقت مہمان تھوڑے تھے۔ حضرت شیخ نے دعوت قبول فرمائی۔ جب کھانے کا وقت آیا تو مہمان زیادہ آگئے۔ حضرت شیخ تمام مہمانوں کو لے کر تشریف لے آئے۔ مہمانوں کی کثرت دیکھ کر دیکھ میں پریشان ہوا۔ حضرت نے محسوس فرمالیا۔ مجھے علیحدہ لے گئے۔ میں نے عرض کیا۔ تھوڑی دیر ٹھہریے۔ میں اور انتظام کرلوں۔ حضرت نے فرمایا یہی کھانا کافی ہو جائے گا اور آپ کے ارشاد کے مطابق تمام روٹی اور ترکاری آپ کے پاس لاکر رکھ دی گئی۔ روٹیوں پر کپڑا ڈھک دیا گیا۔ اب حضرت شیخ اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیتے رہے۔

مولانا عبد السمیع صاحب قسم کھا کر فرماتے تھے کہ وہی کھانا سب کو کافی ہوگیا۔ گھر والوں نے بھی کھالیا اور کچھ بچ بھی رہا۔

(مولانا قاری حافظ سید طاہر حسن صاحب مدرس مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ)

میں تنہا نہیں کھا سکتا

تقسیم ہند کے بعد حضرت مدنی رح سلہٹ کی بجائے ٹانڈہ میں مقیم تھے۔ مئی اور جون کا رمضان تھا۔ گرمی شباب پر تھی۔ لو چل رہی تھی۔ اوسطاً ستر مہمان روزانہ آتے تھے۔ اہل خانہ نے آپ کی پیرانہ سالی اور موسم کے تقاضہ کے بموجب یہ مطالبہ کیا کہ آپ سحر کے وقت کوئی میٹھی چیز نوش فرمالیا کریں۔ تاکہ تشنگی کا غلبہ نہ ہو مگر پیکر سنت نے برجستہ فرمایا کہ میرے مہمان صرف روٹی اور سالن کھائیں اور میٹھی چیزیں میں کھاؤں۔ اگر مہمانوں کے لیے انتظام ہو سکتا ہے تو میں بھی کھا سکتا ہوں۔ ورنہ میں تنہا نہیں کھا سکتا۔ بدرجہ مجبوری گھر والوں نے سب کے لیے کبھی میٹھے چاول۔ کسی دن شیرا اور کسی دن سویوں کا انتظام کیا۔

اور سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ بخار اور کسی مرض میں مبتلا ہونے پر حکیم یا ڈاکٹر نے پرہیز بتلایا۔ بہیم اصرار پر چند دنوں تو پرہیزی کھانا کھالیتے۔ چند دن بعد اگر پرہیزی کھانا دسترخوان پر آتا تو اس کو دوسرے کھانوں میں ملا دیتے اور وہی کھانا نوش فرماتے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے۔ جو دنیا میں بالکل انوکھی ہے۔ اتباع سنت اگر ولایت ہے تو حضرت مدنی اس دور کے سب سے بڑے ولی تھے۔

ساری رات عبا اوڑھ کر گزار دی

استاد العرب والعجم کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد سے بارہ بجے تک حدیث کی سب سے بڑی مہتم بالشان کتاب بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔ مولانا فیض اللہ، حضرت مرحوم لالٹین دکھانے پر مامور تھے انکا بیان ہے۔ ایک رات حضرت نصف شب کو سردی کے موسم میں مہمان خانہ میں تشریف لائے۔ دیکھا کہ ایک خستہ حال بوسیدہ کپڑے میں ملبوس چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ان سے پوچھو کہ کیوں بیٹھے ہیں۔ اور پھر خود ہی جاکر پوچھا تو اس مہمان نے جواب دیا کہ کسی صاحب نے مجھے دسترخوان سے اٹھا دیا اور میرے پاس لحاف بھی نہیں ہے۔ حضرت پر بڑا اثر پڑا۔ بار بار انکا نام پوچھا۔ مگر پتہ نہ چلا۔ فوراً اندر تشریف لے گئے اور کھانا لیکر خود باہر تشریف لائے اور جب تک اس مہمان نے کھانا نہیں کھایا۔ آپ باہر ہی بیٹھے رہے۔ سارے مہمان اور اہل خانہ سو چکے تھے۔ حضرت اندر گئے اور اپنا بستر اٹھا لائے اور اس کو بچھا دیا اور خود ساری رات عبا اوڑھ کر گزار دی مولانا فیض اللہ جو حضرت کے شاگرد ہیں۔ کا بیان ہے کہ میں نے بہت اصرار کیا اور چاہا کہ اپنا بستر لے آؤں اور حضرت آرام فرمائیں۔ مگر اس پیکر سنت نے گوارا نہ کیا۔

مراد ما نصیحت بود و گفتیم

آپ ایک دفعہ بریلی تشریف لائے کہ جلسہ سے خطاب کریں۔ موتی پارک میں بعد مغرب تقریر تھی۔ پنڈال بھر چکا تھا۔ صرف حضرت کی انتظار تھی۔ مولانا تشریف لائے۔ معززین شہر ساتھ تھے۔ پارک سے باہر معاندین کا زبردست ہجوم تھا۔ جو اپنے مخالفانہ فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا۔ اور حضرت کو روکنا چاہا۔ مگر حضرت برابر بڑھتے

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۵ھ
۱۸۸۵ء

۱۳۶۹ھ
۱۹۴۹ء
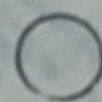
ان میں سے ایک تھے۔ نظر و مطالعہ کی وسعت فکر کی دقت و سلامت اور زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت و حلاوت کی صفات اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان میں جمع کر دی تھیں، کم از کم اس عاجز نے تو ابھی تک ان میں ان کا ثانی نہیں دیکھا بارہا اپنے پر یہ گزرا ہے کہ کسی علمی اشکال کو لے کر حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضری ہوئی اور اس وقت برجستہ جو کچھ فرما دیا، وہی اس اشکال کا آخری اور شافی جواب تھا کبھی کسی مسئلے کی سند کی تلاش و جستجو میں رجوع کیا گیا تو فوراً جواب ملا کہ فلاں فلاں کتاب میں اس کی تفصیل موجود ہے، جن حضرات کو حضرت موصوف سے علمی استفادے کا موقعہ ہوا ہوگا انھیں اس میں شک نہیں ہو سکتا۔ کہ ذہانت و ذکاوت، فکر کی دقت و متانت اور دماغ کے سلجھاؤ میں، وہ آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ اسی طرح اپنے مدعا کو بہترین اسلوب اور نہایت دلنشین انداز میں بیان کرنے اور دقیق سے دقیق، علمی حقیقتوں کو آسان کر کے سمجھا دینے کا جو خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو عطا فرمایا تھا۔ وہ ان کے لیے ان کے رب کا خاص عطیہ تھا۔

ایک معبر ناقد نے مولانا کی بعض تقریریں سن کر ایک زمانہ میں کہا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ جب مولانا غیبی حقیقتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے سمجھانے اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیب اب شاید غیب نہیں رہیگا بلکہ شہود بن کر سامنے آ جائیگا" (الفرقان ماہ صفر ۱۳۶۹ھ دسمبر ۱۹۴۹ء ص ۴)

یہ ہیں وہ خیالات جو مولانا محمد منظور صاحب نے علامہ عثمانی کے متعلق تحریر کیے ہیں اور جو حقیقت سے لبریز ہیں۔ ہم نے ان کی اس عبارت کو اسی لیے پیش کیا کہ قاری ان کے متعلق ہمارے اس مقالے کو شاعری یا کتاب المدائح نہ سمجھ بیٹھے۔

شریعت کے مزاج کلی سے علامہ کی واقفیت

علامہ کی یہ علمی شان کہ ہر مشکل سے مشکل شریعت کے مسئلے کو وہ پیش نظر افتادہ حقیقت کی طرح سمجھا دیتے تھے۔ اس لیے تھی کہ وہ شریعت کے مزاج سے پورے طور پر واقف تھے اور ان کی انگلیاں قرآن و سنت، فقہ اور کلام کی نبضوں اور ان کی دھڑکنوں سے بخوبی شناسا تھیں۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"دو چار بڑی بوٹیوں کی خاصیت جاننے سے کوئی شخص طبیب نہیں بن سکتا، جب تک کہ طب کے مزاج کلی سے پوری طرح واقفیت نہ ہو، وہ طبیب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح چند مسائل جاننے سے انسان عالم نہیں بن جاتا۔ جب تک کہ شریعت کے مزاج کلی سے واقفیت حاصل نہ کرے۔

عہد تعلیم

علامہ عثمانی حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب عثمانی دیوبندی کے فرزند جلیل القدر تھے۔ ان کے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بنائے دار العلوم دیوبند میں برابر کے شریک تھے۔ ان کی تمام تر زندگی علمی زندگی تھی جس زمانے میں علامہ عثمانی ۱۰ محرم الحرام ۱۳۰۵ھ مطابق، ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت مولانا فضل الرحمان صاحب خاص ضلع بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ اس محکمے سے پنشن لینے کے بعد وہ دیوبند مقیم ہو گئے اور ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۲۵ھ تک انھوں نے بیالیس سال تک مدرسے کی خدمات انجام دیں۔

علامہ عثمانی کی ۱۳۱۰ھ میں بسم اللہ ہوئی اور حافظ نامدار صاحب دیوبندی کے سر ان کی بسم اللہ کا سہرا بندھا۔ اردو کی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا محمد لیسین صاحب فارسی درس سے فارسی کی تمام کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں عربی کا آغاز کیا اور ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں تمام دورے کے طلبہ میں اول رہ کر فراغت حاصل کی۔ علامہ اپنے عہد طالب علمی ہی میں بڑے ذہین اور فطین مشہور ہو گئے۔ اسی زمانے میں طلبہ کو مسلم وغیرہ کی مختلف کتابیں پڑھاتے۔

بڑے شہروں میں آپ کی زبردست تقریریں ہوئیں۔ تحریک خلافت میں حصہ لینے اور جلسوں میں تقریروں سے علامہ کی ملک میں اور دھوم مچ گئی۔

جمعیۃ العلماء میں شرکت

تحریک خلافت جب شباب پر آئی تو جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں ڈالی گئی۔ ان میں ہندوستان کے ہر فرقے اور طبقے کے علماء شامل ہوئے۔ علامہ عثمانی کی شخصیت کے پیش نظر ان کو جمعیۃ العلماء ہند کی ورکنگ کمیٹی اور مجلس منتظمہ کے لیے منتخب کیا گیا۔ آپ جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے دہلی کے سالانہ جلسے میں علامہ عثمانی نے ترک موالات پر اپنا زبردست خطبہ دیا جو اس وقت چھپ چکا تھا۔ یہ جلسہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا جو ابھی ابھی مالٹا کی اسارت سے آزاد ہو کر ہندوستان واپس ہوئے تھے۔ ملک میں خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس لیے آپ نے اس میں حصہ لیا۔

شیخ الہند کے ہمراہ علامہ عثمانی اور دورۂ ہند

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان کے تمام شہروں سے جلسوں میں شرکت کے لیے باصرار دعوت دی جاتی تھی۔ ان تمام جلسوں میں تقریباً علامہ عثمانی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ دہلی، میرٹھ، مرادآباد، علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، غرضیکہ ہر جگہ علامہ بحیثیت نمائندہ تقریریں فرماتے اور یہ شرف ان کے لیے استاذ محترم کی نیابت کا بہت بڑا شرف تھا۔

جامعہ ملیہ کے افتتاح پر شیخ الہند سخت بیمار تھے۔ اسی عالم میں علیگڑھ پہنچے۔ علامہ عثمانی نے ہی خطبہ لکھا اور انہوں نے ہی پڑھا۔

خلافت اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت اور تقریروں نے علامہ کی شخصیت میں اور چار چاند لگا دیئے۔ اس طرح موصوف جمعیۃ العلماء میں شریک رہے۔ تاآنکہ مسلم لیگ کے نصب العین نے کانگریس سے علیحدہ اپنا زبردست محاذ قائم کر لیا۔

علامہ عثمانی اور مسلم لیگ

حضرت موصوف کا رجحان ابتداء سے ہی اس طرف تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی نمائندہ جماعت اور قطعاً طور پر کانگریس سے علیحدہ ہو کر اپنے حقوق کی نگرانی کرے اور ایسی جماعت مسلم لیگ ہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا علامہ کانگریس میں اس وقت تک شرکت کرنے کو گوارا نہیں فرماتے تھے۔ جب تک کہ ان سے حقوق نہ منوا لیے جائیں۔ لیکن جمعیۃ العلماء جو کانگریس کے ساتھ متحد تھی۔ وہ آزادیٔ ہند کی خاطر یہ نصب العین رکھتی تھی کہ ہندوستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر انگریزوں سے آزادی حاصل کر لینی چاہیئے۔ دشمن کو گھر سے نکالنے کے بعد آپس میں حقوق کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اور جمعیتی علماء کا یہ خیال بھی تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے بعد اسلامی حکومتوں کو ہندوستان پر قبضہ دلانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

لیگ اور کانگریس کا اختلاف

لیکن لیگ کے قائد مسٹر محمد علی جناح نے بالآخر ہندو اور کانگریس کے حالات کے پیش نظر ۱۹۴۵ء کے الیکشن کے لیے مسلم لیگ کو علیحدہ الیکشن لڑنے اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور اس طرح دونوں کا سخت مقابلہ ٹھن گیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نظریہ پاکستان پیش کر چکی تھی۔ علامہ عثمانی بھی لیگ میں شریک ہو گئے۔

حضرت عثمانی اور مسلم لیگ کو ترقی

ہندوستان میں علماء کی دو جماعتیں بن گئیں جن میں سے بہت سے کانگریس میں شامل تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند دہلی قطعی طور پر کانگریس کی موید تھی۔ ان حالات میں جب کہ بڑے بڑے علماء کانگریس میں شامل تھے، مسلم لیگ کو مذہبی طور پر سخت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ایسے نازک وقت میں کسی موثر اور متقدر عالم کی تائید کی سخت ضرورت تھی۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب ہمیشہ سے ہی کانگریس کے مخالف تھے۔ مولانا شبیر احمد صاحب بھی کانگریس سے منقبض ہی رہتے تھے۔ اس لیے آپ نے لیگ میں شرکت کا بروقت اعلان فرمایا۔ جس سے لیگ کو بہت تقویت پہنچی۔

کل جمیعۃ العلمائے اسلام کی صدارت

۱۹۴۵ء میں جمیعۃ العلماء کے مقابلے میں کل جمیعۃ العلماء اسلام کی بنیاد پڑی اور اس کا شاندار اجلاس کلکتے میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس اپنی نوعیت کا نہایت عظیم الشان اور تاریخی اجلاس تھا۔ بے شمار عوام و خواص اس میں شامل ہوئے۔ علامہ عثمانی بیماری کی وجہ سے خود تشریف لے جا سکے۔ البتہ آپ نے اپنا ایک تحریری پیغام بھیجا جو جلسے میں پڑھا گیا۔ بس اس پیغام سے مسلمانوں پر جو اثر ہوا۔ وہ بجلی کی طرح تمام مسلمانانِ ہند میں پھیل گیا۔ اس بیان کو چھپوا کر ہندوستان کے طول و عرض میں شائع کیا گیا۔ جس سے مسلمانوں میں کانگریس کے خلاف اور لیگ کے موافق جوش پھیل گیا۔ علامہ کی شرکت نے مسلم لیگ کو بے حد تقویت پہنچائی اور کانگریس کو زبردست دھکا لگا۔ جمیعۃ علماء ہند کو بھی سخت نقصان پہنچا اور اکثر مسلمانوں کی نظر میں اس کا وقار پیلا سا نہ رہا۔

میرٹھ کانفرنس

پھر میرٹھ میں لیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت علامہ شبیر احمد صاحب نے کی۔ آپ نے اس میں ایک زبردست خطبہ صدارت پڑھا جس نے ملک کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اور آپ نے مسلم لیگ کو ووٹ دے کر کامیاب بنانے کا فتویٰ دیا جس کے نتیجہ میں لیگ کو زبردست کامیابی ہوئی اور لیاقت علی خاں مرحوم بھی آپ کی کوششوں کے نتیجے میں الیکشن میں کامیاب ہوئے۔

جمیعۃ العلمائے اسلام کا اجلاس لاہور میں

۱۹۴۶ء میں علامہ عثمانی کی صدارت میں جمیعۃ العلمائے اسلام کا اجلاس لاہور اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں ہوا۔ یہ اجلاس اس لیے زبردست اہمیت کا مالک تھا کہ پنجاب میں یونینسٹوں کی وزارت تھی اور وزیر اعظم خضر حیات تھے علامہ عثمانی نے اس اجلاس میں ہمارا پاکستان کے نام سے ایک بسیط و طویل خطبۂ صدارت پڑھا جس سے مسلمانانِ پنجاب کو صحیح راہ نظر آئی اور ان کا جوش مسلم لیگ کے حق میں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ہندوستان کا دورہ

تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کو تقویت پہنچانے کے لیے آپ نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور تقریریں کیں جس سے اب لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مان لی گئی اور مسلمانوں کی اکثریت لیگ کے ساتھ ہو گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر علامہ عثمانی لیگ میں شامل نہ ہوتے تو مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے یہ باور کرانا دشوار ہو جاتا کہ مسلم لیگ نہ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے۔ بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی اس میں شرکت کرنا ضروری ہے۔

بہرحال علامہ عثمانی کی لیگ میں شرکت بہت ہی بابرکت ثابت ہوئی۔

لیگ میں شرکت کی وجہ

علامہ عثمانی نے قائد اعظم سے تعاون کرنے کا جو اقدام کیا۔ اس میں جو عوامل کار فرما تھے۔ ان میں سے سب سے بڑا یہ تھا کہ وہ لیگ میں اس بنا پر شریک ہوئے کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائیگی

دستور ساز اسمبلی میں مولانا عثمانی کی ممبری

متحدہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے لیے علامہ عثمانی بنگال سے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ اس لیے آپ دستور ساز اسمبلی کے وکیع ممبر بھی تھے جب پاکستان کی منظوری برطانیہ کی پارلیمنٹ نے دیدی تو یہ بات طے ہو گئی کہ مسلم لیگ کی حمایت اور تائید کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے ان صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے۔ پاکستان بنا دیا جائے اور جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوستان میں شامل کر دیئے جائیں۔ اس فیصلے سے کانگریس اور لیگ

کی کشمکش ختم ہو گئی۔

علامہ عثمانی اور سرحد کا ریفرنڈم

اسی نظریے کے ماتحت کانگریس نے مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد میں چونکہ کانگریس کی وزارت ہے اور وہاں کے لوگ کانگریس میں شرکت کو پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ان سے اس معاملے میں استصواب کر لیا جائے کہ آیا وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں۔

یہ مرحلہ پاکستان کے لیے بڑا نازک تھا۔ اس مقصد کے لیے قائد اعظم کی نظرِ انتخاب علامہ عثمانی پر پڑی۔ آپ نے صوبہ سرحد کا سخت گرمی میں دورہ کیا اور وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں تقریریں کر کے ان کو وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ چنانچہ ریفرنڈم ہوا اور صوبہ سرحد کی اکثریت نے پاکستان میں اپنی شمولیت کا ووٹ دیا اور سرحد کی فتح کا سہرا علامہ عثمانی کے سر بندھا۔

علامہ کی یوم آزادی پر کراچی میں آمد

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پہنچ رہے تھے۔ تاکہ پاکستان کو آزادی کا حکم سنا کر حکومت کی ذمہ داری مسلم لیگ کے سپرد کر دی جائے۔ علامہ چونکہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ اس لیے اس حیثیت سے آپ انڈیا واپس نہ جا سکے اور جانا مناسب بھی نہ تھا۔ ورنہ شہید کر دیئے جاتے۔ بہرحال آپ نے پاکستان میں مستقل قیام کیا۔

مہاجروں کی آمد اور علامہ کی خدمت

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ہندوستان سے مسلمانوں کا زبردست انخلاء شروع ہوا۔ اور قتل کا بازار گرم ہو گیا۔ آپ نے مہاجرین کی زبردست خدمات انجام دیں۔ علاوہ ازیں حکومت کا بھی بہت ساتھ دیا۔ اس طرح آپ حکومت اور قوم دونوں کے ہر دلعزیز ہو گئے۔

مسئلہ کشمیر

ستمبر ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان کے لیے یہ مسئلہ نہایت ہی نازک صورت حال اختیار کر گیا۔ علامہ نے شرعی حیثیت سے کشمیر میں جہاد کا فتویٰ دیا۔ مجاہدین کشمیر کے لیے امداد کی اپیل کی۔ اور ان کی طبی اور مالی اعانت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

قرارداد مقاصد

آپ مسلسل پاکستان اور اہل پاکستان کی رہنمائی فرماتے رہے۔ لیکن آپ کا سب سے بڑا جو منتہائے نظر تھا۔ وہ پاکستان میں اسلامی قانون کا اجرا تھا۔ اس کے لیے آپ نے دستور ساز اسمبلی میں رہ کر اور باہر پبلک میں بڑی کوشش کی۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے۔ آپ نے ڈھاکے میں جمعیۃ العلمائے اسلام پاکستان کا جلسہ منعقد کرایا اور اس جلسے میں ایک معنی خیز خطبہ صدارت دیا جس کے نتیجہ میں مسٹر لیاقت علی نے "قرارداد مقاصد" کی تجویز پیش کی کہ پاکستان کا قانون اسلامی قانون ہو گا۔ علامہ نے اسمبلی میں اس ریزولیوشن اور تجویز کی زبردست تائید کی۔ غرض یہ ہے کہ قرارداد مقاصد کا سہرا بھی علامہ شبیر احمد عثمانی کے سر رہا۔

وفات

دنیا میں کوئی رہا نہ رہ جائے گا۔ علامہ عثمانی اس پیری میں کام کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس پر آئے دن بیماری کے حملے۔ چنانچہ قدرت نے آپ سے جو کام لینا تھا۔ اس کی تکمیل کے بعد آپ کو بتاریخ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء اپنے جوار رحمت میں بلا لیا۔ جب کہ آپ وزیر اعظم بہاولپور کی دعوت پر جامعہ عباسیہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے بہاولپور تشریف لے گئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ حضرت علامہ عثمانی کی تربت اطہر پر ہزار ہزار رحمتوں کی بارش نازل فرمائے۔ اور ان کو جنت الفردوس میں صالحین و ابرار کے زمرے میں جگہ عنایت فرمائے کہ ایسے عالم لاکھوں میں کوئی کوئی ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

کہتے ہیں اور روم مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آتی تھیں۔ ۶۰۲ء سے لے کر ۶۱۴ء کے بعد تک ان کی حریفانہ زور آزمائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جیساکہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تصریحات سے ظاہر ہے ۵۷۰ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۰ء میں آپ کی بعثت ہوئی۔ مکہ والوں میں جنگِ روم و فارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں اسی دوران میں نبی کریم صلعم کے دعوائے نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کے لئے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کردی ...... آخر ۶۱۴ء کے بعد جب کہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے تقریباً پینتالیس ۴۵ سال اور بعثت کے پانچ سال گزر چکے خسرو پرویز (کیخسرو ثانی) کے عہد میں فارس نے روم کو ایک مہلک اور فیصلہ کن شکست دی۔ شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ الخ (قرآن کریم تفسیر عثمانی ص۵۲۴ ص۶۰۷)۔

ضالّ کی حقیقت

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ط

اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سُجھائی اور پایا تجھ کو مفلسی میں پھر بے پروا کر دیا۔

(تفسیر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی آپؐ کے والد وفات پا چکے تھے۔ چھ سال کی عمر تھی کہ والدہ نے رحلت کی۔ پھر آٹھ سال کی عمر تک اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں رہے۔ آخر اس دُرِّ یتیم اور نادرۂ روزگار کی ظاہری تربیت و پرورش آپؐ کے بے حد شفیق چچا ابو طالب کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے زندگی بھر آپؐ کی نصرت و حمایت اور تکریم و تبجیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ہجرت سے کچھ پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔ چند روز بعد یہ امانت الٰہی، اللہ کے حکم سے انصار مدینہ کے گھر پہنچ گئی۔ اوس اور خزرج کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا، اور انہوں نے اس کی حفاظت اس طرح کی جس کی نظیر چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ جب حضرت جوان ہوئے تو قوم کے مشرکانہ اطوار اور بیہودہ رسم و راہ سے سخت بیزار تھے۔ اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا۔ عشقِ الٰہی کی آگ سینۂ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ وصول الی اللہ (اللہ تک پہنچنے) اور ہدایت خلق کی اس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفس قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اندر ہی اندر جوش مارتا تھا۔ لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے اس عرش و کرسی سے زیادہ وسیع قلب کو تسکین ہوتی۔ اس جوش طلب اور فرط محبت میں آپ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر مالک کو یاد کرتے اور محبوب حقیقی کو پکارتے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے غارِ حرا میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا۔ اور وصول الی اللہ اور اصلاح خلق کی تفصیلی راہیں آپ پر کھول دیں یعنی دین حق نازل فرمایا۔ وما کنت تدری ما الکتاب ولا[1]

---

[1] اور آپ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب اور ایمان کیا ہیں۔ لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے ہم جس کو چاہیں ہدایت دیں۔

(تفسیر) ہجرت سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ کفار کا مجمع تھا۔ اُنہوں نے آپ سے کوئی نشانی طلب کی آپ نے فرمایا کہ آسمان کی طرف دیکھو۔ ناگاہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا ان میں سے مغرب کی اور دوسرا مشرق کی طرف چلا گیا بیچ میں پہاڑ حائل تھا۔ کفار کہنے لگے کہ محمدؐ نے چاند پر یا ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اس معجزہ کو شق القمر کہتے ہیں۔ اور یہ ایک نمونہ اور نشانی تھی قیامت کی کہ آگے سب کچھ یونہی پھٹے گا۔ طحاویؒ اور ابن کثیرؒ وغیرہ نے اس واقعہ کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے اور کسی دلیل عقلی سے آج تک اس طرح کے واقعات کا محال ہونا ثابت نہیں کیا جا سکا۔ اور محض استبعاد کی بناء پر ایسی قطعی الثبوت چیزوں کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ استبعاد تو اعجاز کے لئے لازم ہے۔ روزمرہ کے معمولی واقعات کو معجزہ کون کہے گا۔۔۔۔ باقی یہ کہنا کہ شق القمر اگر واقع ہوا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا وجود کیوں نہیں۔ تو یاد رہے کہ یہ قصہ رات کا ہے۔ بعض ملکوں میں تو اختلاف مطالع کی وجہ سے اس وقت دن ہوگا اور بعض جگہ آدھی رات ہوگی۔ لوگ عموماً سوتے ہوں گے۔ اور جہاں بیدار ہوں گے اور کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوں گے تو عادۃً یہ ضروری نہیں کہ سب آسمان کی طرف تک رہے ہوں۔ زمین پر جو چاندنی پھیلی ہوگی بشرطیکہ مطلع صاف ہو۔ اس میں دو ٹکڑے ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر تھوڑی دیر کا قصہ تھا ہم دیکھتے ہیں کہ بارہا چاند گہن ہوتا ہے اور خاصہ ممتد رہتا ہے لیکن لاکھوں انسانوں کو خبر بھی نہیں ہوتی اور اس زمانہ میں آج کل کی طرح رصد وغیرہ کے اتنے وسیع و مکمل انتظامات اور تقاویم (جنتریوں) کی اس قدر اشاعت بھی نہ تھی۔ بہر حال تاریخوں میں مذکور نہ ہونے سے اس کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔ باایں ہمہ "تاریخ فرشتہ" وغیرہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ہندوستان میں مہاراجہ مالی بار کے اسلام کا سبب اسی واقعہ کو لکھتے ہیں۔ (القمر پارہ ۲۷ رکوع ۸)

بُت پرستوں، عیسائیوں، شیعوں، بریلویوں، پیر پرستوں اور قبر پرستوں کی فہمائش

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ۔ اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں۔

(تفسیر) یعنی زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی کا حصہ دار بناتا ہے کوئی اس کے لئے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتا ہے، کوئی اسے روح و مادہ کا محتاج بناتا ہے۔ کسی نے احبار و رہبان کو خدائی کے اختیارات دے دیئے ہیں۔ بہت سے تعزیہ پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی کے خس و خاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو مکدر کر رہے ہیں۔ ریا اور ہوا پرستی سے کتنے موحدین ہیں جو پاک ہوں گے۔ غرض ایمان کا زبانی دعویٰ کرنے کے بہت کم ہیں جو عقیدہ یا عمل کے درجہ میں شرک جلی یا خفی کا ارتکاب نہیں کرتے۔ (قرآن کریم صفحہ ۳۲۰، سورہ یوسف، ف، تفسیر عثمانی، پارہ ۱۳، رکوع ۶)

سلیمان علیہ السلام اور منطق الطیر

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا اور قائم مقام ہوا سلیمان داؤد کا اور بولا اے

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۔ جس اللہ نے سات آسمان تہہ بہ تہہ پیدا کئے۔

(تفسیر) حدیث میں آیا ہے کہ ایک آسمان کے اُوپر دوسرا آسمان، دوسرے پر تیسرا، اسی طرح سات آسمان اوپر نیچے ہیں۔ اور ہر ایک آسمان سے دوسرے تک پانسو برس کی مسافت ہے۔ نصوص آیات و احادیث میں یہ تصریح نہیں کی گئی کہ اوپر جو نیلگوں چیز ہم کو نظر آتی ہے وہ ہی آسمان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ساتوں آسمان اس کے اُوپر ہوں اور یہ نیلگوں چیز[۱] آسمان کی چھت گیری کا کام دیتی ہو۔

(قرآن کریم پارہ ۲۹ - سورہ ملک - صفحہ ۷۲۹ - فائدہ ۴)

سماعِ موتیٰ

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ۔ سو تو سُنا نہیں سکتا مُردوں کو۔

(تفسیر) مفسرین نے اس موقع پر سماعِ موتیٰ (مُردوں کے سُننے) کی بحث چھیڑ دی ہے۔ اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کے عہد سے اختلاف چلا آتا ہے اور دونوں جانب سے نصوصِ قرآن و حدیث پیش کی گئی ہیں۔ یہاں ایک بات سمجھ لو کہ یُوں تو دنیا میں کوئی کام اللہ کی مشیت و ارادہ کے بدوں نہیں ہو سکتا مگر آدمی جو کام اسباب عادیہ کے دائرہ میں رہ کر باختیار خود کرے وہ اس کی طرف منسوب ہوتا ہے اور جو عام عادت کے خلاف غیر معمولی طریقے سے ہو جائے اُسے براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ مثلاً کسی نے کسی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا یہ اس قاتل کا فعل کہلائے گا اور فرض کیجئے ایک مٹھی کنکریاں پھینکیں جس سے لشکر تباہ ہو گیا۔ اسے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے تباہ کر دیا حالانکہ گولی سے ہلاک کرنا بھی اس کی قدرت کا کام ہے ورنہ اس کی مشیت کے بدوں گولی یا گولہ کچھ بھی اثر نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (انفال رکوع ۲) یہاں خارق عادت ہونے کی وجہ سے پیغمبر اور مُسلمانوں سے "قتل و رمی" کی نفی کر کے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی۔ ٹھیک اسی طرح انک لا تسمع الموتیٰ کا مطلب سمجھو یعنی تم یہ نہیں کر سکتے کہ کچھ بولو اور اپنی آواز مُردے کو سُنا دو کیوں کہ یہ چیز ظاہری اور عادی اسباب کے خلاف ہے البتہ حق تعالیٰ کی قدرت سے ظاہری اسباب کے خلاف تمہاری کوئی بات مُردہ سُن لے اس کا انکار کوئی مومن نہیں کر سکتا اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقہ سے سننا ثابت ہو جائے گا۔ اس حد تک ہم کو سماعِ موتیٰ کا قائل ہونا چاہیے محض قیاس کر کے دوسری باتوں کو سماع کے تحت میں نہیں لا سکتے۔ بہر حال آیت میں اسماع (سنانے) کی نفی سے مطلقاً سماع (سُننے) کی نفی نہیں ہوتی (واللہ اعلم)۔

(قرآن کریم پارہ ۲۱ - سورہ روم - صفحہ ۵۳۱)

عِلم الغیب

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ ؕ تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ

---

[۱] قرآن و حدیث میں نیلگوں چیز کے آسمان ہونے کے متعلق کچھ ذکر نہ ہونے کے متعلق حضرت عثمانی کا اظہار ان کی شرعی اور اسلامی بے پناہ وسعتوں اور معلومات کا پتہ دیتا ہے۔ (انور)

میں پڑے مسلمان

(تفسیر) مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں، نہ کسی ایک کا علم کسی شخص کو بالذات بدون عطائے الٰہی کے ہو سکتا ہے اور نہ مفاتیح غیب اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو دی ہیں۔ ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرما دیا یا غیب کی خبر دے دی۔ لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن و سنت نے کسی جگہ ایسے شخص پر عالم الغیب یا فلاں تعلیم الغیب کا اطلاق نہیں کیا۔ علمائے محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح کے الفاظ کسی بندہ پر اطلاق کئے جائیں۔ واضح رہے کہ علم الغیب سے ہماری مراد محض ظنون و تخمینات نہیں اور نہ وہ علم جو قرائن و دلائل سے حاصل کیا جائے۔ بلکہ جس کے لئے کوئی قرینہ اور دلیل نہ ہو وہ مراد ہے (النمل - رکوع ۵)

ولو کنتُ اعلم الغیب کے ماتحت لکھتے ہیں:۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو نہ اپنے اندر اختیار مستقل رکھتا ہے نہ علم محیط۔ سید الانبیاء صلعم جو علوم اولین و آخرین کے حامل اور خزائن ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے۔ ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہے کہ میں دوسروں کو کیا خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں مگر جس قدر اللہ چاہے اتنے ہی پر میرا قابو ہے اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت سی وہ بھلائیاں اور کامیابیاں بھی حاصل کر لیتا جو علم غیب نہ ہونے کی وجہ سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں۔ نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھ کو پیش نہ آیا کرتی۔ مثلاً "افک" (بہتان عائشہ) کے واقعہ میں کتنے دنوں تک حضور کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب و قلق رہا۔ حجۃ الوداع میں تو صاف ہی فرما دیا اِستَقبَلتُ من امری ما استدبرتُ لما سُقتُ الھدیَ (اگر میں پہلے سے اس چیز کو جانتا جو بعد میں پیش آئی تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا۔ اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن کی روک تھام علم محیط رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب تر واقعہ ہے کہ حدیث جبرئیل کی بعض روایات میں آپ نے تصریحاً فرمایا کہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے جبرئیل کو واپسی کے وقت تک نہیں پہچانا۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تب علم ہوا کہ جبرئیل تھے۔ یہ واقعہ بتصریح محدثین بالکل آخر عمر کا ہے۔ اس میں قیامت کے سوال پر المسئول عنھا باعلم من السائل ارشاد فرمایا ہے گویا بتلا دیا گیا کہ علم محیط خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اور "علم غیب" تو درکنار محسوسات و مبصرات کا علم بھی خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت نہ چاہے تو ہم محسوسات و مبصرات کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ بہرحال اس آیت میں کھول کر بتا دیا گیا۔ کہ اختیار مستقل یا علم محیط نبوت کے لوازم میں سے نہیں۔ جیسا کہ بعض جہلاء سمجھتے تھے۔ ہاں شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے۔ کامل ہونا چاہئے اور تکوینیات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانتے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں آپ کو اتنے بیشمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں۔ جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔

ان دونوں آیات کے علاوہ وعندہٗ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو کے ماتحت حضرت مفسر لکھتے ہیں کہ:۔ (پارہ ۹، سورہ اعراف، رکوع ۱۳)

مفاتح کو جن علماء نے مفتح بفتح المیم کی جمع قرار دیا ہے انہوں نے مفاتح الغیب کا ترجمہ غیب کے خزانوں سے کیا ہے اور جن کے نزدیک مفتح بکسر المیم کی جمع ہے وہ مفاتح الغیب کا ترجمہ مترجم رحمۃ اللہ کے موافق کرتے ہیں۔ یعنی غیب کی کنجیاں"۔ مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور ان کی کنجیاں صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ ہی ان میں سے جس خزانہ کو جس

قدر چاہے کسی پر کھول سکتا ہے۔ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اپنے حواس و عقل وغیرہ آلات ادراک کے ذریعہ سے علوم غیبیہ تک رسائی پا سکے یا جتنے غیوب اس پر منکشف کر دیئے گئے ہیں ان میں از خود اضافہ کرنے کو علوم غیبیہ کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں خواہ لاکھوں کروڑوں جزئیات اور واقعات غیبیہ پر کسی بندے کو مطلع کر دیا گیا ہوتا، تاہم غیب کی اصول و کلیات کا علم جن کو مفاتیح غیب کہنا چاہیے حق تعالےٰ نے اپنے ہی لئے مخصوص رکھا ہے۔ (پارہ ۷، رکوع ۱۳)

منطقیانہ مگر حکیمانہ استدلال میں وحی کی ضرورت

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ط — یہ کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا اور نہیں ہے یہ کہا کسی شاعر کا۔

(تفسیر) بلکہ یہ قرآن ہے اللہ کا کلام جس کو آسمان سے ایک بزرگ فرشتہ لے کر ایک بزرگ ترین پیغمبر پر اترا جو آسمان سے لایا وہ اور جس نے زمین والوں کو پہنچایا۔ دونوں رسول کریم ہیں۔ ایک کا کریم ہونا تم آنکھوں سے دیکھتے ہو اور دوسرے کی کرامت و بزرگی پہلے کریم کے بیان سے ثابت ہے (تنبیہ) عالم میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک جن کو آدمی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دوسری جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ عقل وغیرہ کے ذریعہ سے ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً ہم کتنا ہی آنکھیں پھاڑ کر زمین کو دیکھیں وہ چلتی ہوئی نظر نہ آئے گی لیکن حکماء کے دلائل و براہین سے عاجز ہو کر ہم اپنی آنکھوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ اور اپنی عقل کے یا دوسرے عقلاء کی عقل کے ذریعہ حواس کی ان غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کر لیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کی عقل بھی غلطیوں اور کوتاہیوں سے محفوظ نہیں۔ آخر اس کی غلطیوں کی اصلاح اور کوتاہیوں کی تلافی کس سے ہو۔ بس تمام عالم میں ایک وحی الٰہی کی قوت ہے جو خود غلطی سے محفوظ و معصوم رہتے ہوئے تمام عقلی قوتوں کی اصلاح و تکمیل کر سکتی ہے جس طرح حواس جہاں پہنچ کر عاجز ہوتے ہیں وہاں عقل کام دیتی ہے۔ ایسے ہی جس میدان میں عقل مجرد کام نہیں دیتی یا ٹھوکریں کھاتی ہے اس جگہ وحی الٰہی اس کی دستگیری کر کے ان بلند حقائق سے روشناس کراتی ہے۔ شاید اس لئے یہاں ماتبصرون وما لاتبصرون کی قسم کھائی۔ یعنی جو حقائق جنت و دوزخ وغیرہ کی پہلی آیات میں بیان ہوئے ہیں اگر دائرہ محسوسات سے بلند تر ہونے کی وجہ سے تمہاری سمجھ میں نہ آئیں تو اشیاء مبصرات اور غیر مبصرات یا بالفاظ دیگر محسوسات و غیر محسوسات کی تقسیم سے سمجھ لو کہ یہ رسول کریم کا کلام ہے جو بذریعہ وحی الٰہی دائرہ حس چیزوں کو اپنی عقل یا دوسروں کی تقلید سے مان لیتے ہیں تو بعض بہت اونچی چیزوں کو رسول کریم کے کہنے سے ماننے میں کیا اشکال ہے۔ (سورہ الحاقہ۔ رکوع ۲)

مستثنیات و تنبیہات

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ — اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے۔

(تفسیر) مشورہ سے کام کرنا اللہ کو پسند ہے۔ دین کا ہو یا دنیا کا۔ نبی کریم صلعم مہمات امور میں برابر صحابہ رض

شاد باش وشادزی اے سرزمین دیوبند

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کی ہمہ گیری اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ شبلی کے جانشین سید سلیمان ندویؒ۔ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت تھانویؒ کے مجاز ہوئے۔ شیخ الہندؒ نے جامعہ ملیہ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ برصغیر پاک وہند کے سب سے بڑے اشاعتی علمی ادارے کی بنیاد مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے رکھی۔ آجکل ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم سید ابوالحسن علی ندوی دارالعلوم کے ایک سرپرست حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے مرید باصفا ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے صدر شعبہ دینیات، دیوبند کے ایک معنوی فرزند مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے تحریک آزادی میں اتنا اہم رول ادا کیا کہ جس کی مثال مشکل ہی سے ملیگی اس دارالعلوم سے وابستہ ایک فرد سید عطاء اللہ شاہ بخاری اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب ہوئے۔ اور اسی دارالعلوم دیوبند کے ایک نامور بزرگ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی بدولت تحریک پاکستان کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور پھر جب پاکستان بنا تو اس نئی مملکت اسلامیہ کی پرچم کشائی کیلئے قائدِاعظم نے علامہ شبیر احمد عثمانی کو منتخب کیا۔ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی منتخب ہوئے! اور علامہ شبیر احمد عثمانی پاکستان کے شیخ الاسلام قرار پائے۔ اور انکے بعد آج تک کسی کو یہ لقب قوم نے نہیں دیا۔

مُبلّغِ اسلام حضرت مولانا محمّد الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء

○

۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء
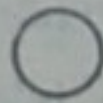
مجدد الف ثانی رح کی ذات گرامی، جن کے عظیم الشان کام کی بدولت آپ کو پورے ہزار سے کا مجدد مانا گیا۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ ایک قرن اور ایک زمانہ میں تجدید و احیائے دین کے لئے متعدد حضرات سے کام لیا گیا کیوں کہ حق تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے اور فرمایا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون قرن اوّل میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی بے پناہ قوت ایمانی کے باعث اپنی جانوں اور مالوں کی قربانی دے کر دین کے درخت کی آبیاری کی خلافت راشدہ کے بعد جب خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا گیا تو عمر بن عبد العزیز رح نے اپنے عیش و آرام کی قربانی دے کر ملوکیت کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ میں بدل دیا، بنو عباس کے دَور خلافت میں عجمیوں کا غلبہ ہوا اور قدیم یونانی فلاسفہ کے علوم عربی میں منتقل ہوئے تو حق تعالیٰ نے ان کے توڑ کے لئے مسلمان فلاسفر غزالی رح و فارابی وغیرہ پیدا کئے جنہوں نے فلسفیوں کی بے مائیگی کو عالم آشکارا کر کے علوم نبوت کی برتری ثابت کی۔ پھر اشراقیت اور ہندی ویدانت کا چرچا ہوا تو رومی، سنائی اور عطار رح جیسے صاحب دل صوفی اور شیخ عبد القادر جیلانی رح، خواجہ معین الدین اجمیری رح، اور شیخ شہاب الدین سہروردی جیسے کامل مشائخ پیدا کئے جنہوں نے اپنی روحانی قوت کے ذریعے جوگیوں اور سادھوؤں کے دجل و تلبیس کا پردہ چاک کیا اور دین حق کو سربلند کیا، پھر جب اسلامی تصوف میں بھی غلو کیا جانے لگا اور جاہل صوفی اسلام ہی کی تحریف کرنے لگے تو حق تعالیٰ نے امام ابن تیمیہ رح، حضرت مجدد الف ثانی رح، شاہ کلیم اللہ دہلوی رح اور شاہ ولی اللہ کے ذریعہ شریعت و طریقت کے تمام شعبوں کی تجدید کرائی۔ پھر ان کے تبعین میں شاہ اسماعیل شہید رح اور سید احمد شہید رح جیسے مجاہد پیدا فرمائے جنہوں نے دینی بے حسی اور پژمردگی کے دَور میں ایک بار پھر صحابہ رض کے دَور کی یاد تازہ کر دی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

غرضیکہ جس زمانہ میں جس قسم کے کام کی ضرورت تھی حق تعالیٰ نے اس زمانہ میں اُسی قسم کا کام اپنے خاص بندوں سے لیا۔ مرشدنا حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رح نے ایک مرتبہ ایک مجلس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہر زمانہ میں جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی لوگ اس طرف توجہ کرتے رہے ہیں۔ فرمایا ہمارے ایک استاد تھے انہوں نے فرمایا کہ صحابہ کے زمانہ میں لوگ دلائل کو نہیں جانتے تھے بس لڑائیاں ہی جانتے تھے اس زمانہ میں صحابہ رض نے اسلام پر دلائل نہیں بیان فرمائے صرف جنگ ہوتی تھی جنگوں ہی سے لوگ مسلمان ہوتے تھے ان پر دلائل نہیں پیش کئے جاتے تھے۔ بعد میں فلسفیوں کا زمانہ آیا، یونان میں فلسفی پیدا ہوئے وہ دلائل سے بات کرتے تھے ایسے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے فارابی وغیرہ کو پیدا فرمایا انہوں نے یونان جا کر پہلے ان کے فلسفہ کو سیکھا پھر عربی میں اس کا ترجمہ کیا۔ پھر لوگوں کو اس طرز سے دلائل کے ساتھ اسلام سکھایا۔"

ہمارے اس دَور میں مغربی و مادی علوم و افکار اور سائنسی ایجادات و انکشافات کا دنیا بھر میں چرچا ہوا تو حق تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کا یہ انتظام کیا کہ اپنے بعض مخلص بندوں کی اس طرف رہنمائی فرمائی کہ وہ بڑے پیمانے پر دینی مدرسے اور دار العلوم قائم کریں۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند میں دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور، اور دہلی، رام پور، گنگوہ، تھانہ بھون، کانپور، لکھنؤ وغیرہ میں مختلف دار العلوم قائم ہوئے جن کے ذریعے دین کی حفاظت و اشاعت کا کام لیا گیا اسی طرح اللہ کے بعض مخلص بندوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں، اپنے عبقری دماغوں اور روحانی قوتوں سے کام لے کر انفرادی طور پر اتنا کام

نے نئی سال بعد دوبارہ آپ نے مولانا محمد یحییٰ صاحب سے حدیث کا دورہ کیا۔

تعلق بیعت

گنگوہ کے قیام کے دوران ہی آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ محبت و عشق کی چنگاری آپ کے خمیر میں تھی، حضرت گنگوہیؒ سے ایسا قلبی تعلق پیدا ہوگیا کہ زیارت کے بغیر آپ کو چین نہ آتا۔ کبھی کبھی رات کو اٹھ کر صرف چہرہ دیکھنے کے لئے جاتے اور پھر آکر سو رہتے۔ حضرتؒ کو بھی آپ کے حال پر بڑی شفقت تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب میں ذکر کرتا تھا تو مجھے ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا، حضرت سے کہا تو حضرت تھرا گئے اور فرمایا کہ مولانا محمد قاسم نے یہی شکایت حضرت حاجی صاحبؒ سے کی تو حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ آپ سے کوئی کام لے گا[1]۔ ۱۳۲۳ھ میں حضرت گنگوہیؒ کا انتقال ہو گیا، مولانا کے حساس دل پر اس حادثہ نے گہرا اثر چھوڑا، فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے تو ساری عمر کا رونا اسی روز رو لیا جس روز حضرتؒ دنیا سے رخصت ہوئے[2]"۔ حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد آپ کا وقت زیادہ تر خلوت اور مراقبہ میں بسر ہوتا۔ اکثر اوقات حضرت شاہ عبدالقدوسؒ کے مزار کے قریب مراقب رہتے اور رات کا بیشتر حصہ نوافل میں گزارتے۔ اس عرصہ میں حضرت گنگوہیؒ کے بڑے بڑے خلفاء سے برابر کا تعلق رہا۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اور دوسرے بزرگوں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہم سے بھی برابر استفادہ کرتے رہے اور ان حضرات کا بھی مولانا سے خصوصی تعلق قائم رہا۔ اس زمانہ میں آپ نے بڑا مجاہدہ کیا۔ مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری فرمایا کرتے تھے کہ حضرت دہلویؒ کو بعد میں جو بے پناہ مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی اور آپ سے تبلیغ و اشاعتِ دین کا جو کام لیا گیا وہ اس زمانہ کے مجاہدہ کا نتیجہ اور اس کا ثمرہ تھا۔

خدمتِ تدریس اور قیامِ دہلی

۱۳۲۶ھ میں مظاہر العلوم سہارن پور کے بعض اساتذہ کے حج پر چلے جانے کی وجہ سے بہت سی آسامیاں خالی ہوئیں تو آپ کا تقرر بھی بطور مدرس کے عمل میں آیا، متوسط کتابیں آپ کچھ عرصہ یہاں رہ کر پڑھاتے رہے، اس عرصہ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کے انتقال کے دو سال بعد آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب جو کہ دہلی میں مقیم تھے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ مولانا محمد صاحب کی وفات پر دہلی کے محبین اور معتقدین نے مولانا سے دہلی ہی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہونے کے لئے اصرار کیا اور استدعا کی کہ اپنے والد صاحب اور بھائی صاحب کی مسند اور مدرسہ کو خالی نہ رہنے دیں بلکہ ان کے کام کو سنبھالیں۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے اجازت لے کر آجاؤں گا۔ چنانچہ حضرت سہارنپوری نے بخوشی اجازت فرما دی اور آپ دہلی آکر مقیم ہوگئے۔ بستی نظام الدین کے ایک برے پر ایک مختصر سی مسجد تھی جس کے ساتھ ایک بنگلہ اور ایک حجرہ تھا، بس یہی مسجد اور یہی خانقاہ تھی، اس کے آس پاس جنگل ہی جنگل تھا کوئی آبادی نہ تھی۔ کچھ میواتی طلباء اس مدرسے میں

---

[1]، [2] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

سے دین اور اہلِ دین کی قدر ہی نہیں۔ اس لیے بہت سے لوگ بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں اور جو لوگ تھوڑا بہت کام کرتے بھی ان کا حلقۂ اثر طالبین علوم تک ہی محدود رہتا ہے۔ عوام اور زندگی کے کاروبار میں مصروف لوگوں کی اصلاح و تربیت کا کوئی کام یہ لوگ نہیں کر پاتے، ان حالات کے پیشِ نظر اور مسلسل غور و فکر کے بعد مولانا اس نتیجہ پہنچے کہ کوئی اس قسم کا کام ہونا چاہیئے جس سے عوام الناس اور غافلوں اور بے طلبوں تک دین اور اس کا پیغام پہنچایا جا سکے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ سے فرمایا:-

"شاہ صاحب! میں نے شروع میں مدرسہ پڑھایا یعنی مدرسہ میں درس دیا، تو طلبہ کا ہجوم ہوا اور اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کثرت سے آنے لگے، میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ میری محنت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ جو لوگ عالم مولوی بننے ہی کے لیے مدرسہ میں آتے ہیں، مجھ سے پڑھنے کے بعد بھی وہ عالم مولوی ہی بن جائیں گے اور پھر ان کے مشاغل وہی ہوں گے جو آج کل عام طور سے اختیار کئے جاتے ہیں۔ کوئی مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہی رہے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر مدرسہ پڑھانے سے میرا دل ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ میرے حضرت نے مجھ کو اجازت دے دی تھی تو میں نے طالبین کو ذکر کی تلقین شروع کی اور ادھر میری توجہ زیادہ ہوئی۔ اللہ کا کرنا، آنے والوں پر اتنی جلدی کیفیات اور احوال کا ورود شروع ہوا اور اتنی تیزی کے ساتھ حالات میں ترقی ہوئی کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کام میں لگے رہنے کا نتیجہ کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہ کچھ اصحاب احوال اور ذاکر شاغل لوگ پیدا ہو جائیں پھر لوگوں میں ان کی شہرت ہو جائے تو کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کے لیے آئے، کوئی اولاد کے لیے تعویذ کی درخواست کرے کوئی تجارت اور کاروبار میں ترقی کی دعا کرائے اور زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعے بھی آگے کو چند طالبین میں ذکر و تلقین کا سلسلہ چلے، یہ سوچ کر ادھر سے بھی میری توجہ ہٹ گئی اور میں نے یہ طے کیا کہ اللہ نے ظاہر و باطن کی جو قوتیں بخشی ہیں ان کا صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کو اسی کام میں لگایا جائے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتیں صرف فرمائیں، اور وہ کام ہے اللہ کے بندوں کو اور خاص طور سے غافلوں بے طلبوں کو اللہ کی طرف لانا اور اللہ کی باتوں کو فروغ دینے کے لیے جان کو بے قیمت کرنے کا رواج دینا"[1]

کام کی ابتداء

شوال ۱۳۴۴ھ میں آپ دوسرے حج کے لیے مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی معیت میں تشریف لے گئے۔ حج کے بعد کچھ عرصہ مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ مولانا فرماتے تھے کہ مدینہ طیبہ کے اس قیام کے دوران میں مجھے اس کام کے لیے امر ہوا اور ارشاد ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ کچھ دن میرے اس بے چینی میں گزرے کہ میں ناتوان کیا کر سکوں گا۔ ایک عارف[2] سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ پریشانی کی کیا بات ہے یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کرو گے یہ کہا

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔　[2] حضرت مولانا سید احمدؒ برادرِ بزرگ حضرت مدنیؒ۔ طبع ثالث بروایت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا۔

حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ ابن حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ

علم وفضل کی دنیا میں ایسا بہت کم اتفاق ہوا ہے کہ والد اگر علم وعمل، زہد وتقویٰ، جہد وہمت اور ارشاد وسلوک میں یگانہ روزگار ہے تو بیٹا بھی انہی اوصاف میں فردِ وحید ہو۔ ہندوستان میں اس کی نظیر خاندان ولی اللّٰہی میں ملتی ہے۔ کہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے گھر شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے تو شاہ ولی اللہؒ کے ہاں شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی رحمہم اللہ اجمعین جیسے عارفین وکاملین پیدا ہوئے جن کی نظیر ومثیل مجدد الف ثانیؒ اور الامام المحدث شاہ ولی اللہؒ کے علاوہ پورے اسلامی ہندوستان میں نہیں ملتی۔ اور اپنے زمانے میں پورے عالم اسلام میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ اور پھر ان صاحبزادگان والاتبار کی اولاد بھی علم وفضل کے اعتبار سے کچھ کم مرتبہ نہیں رکھتی۔ اسی قبیلہ کے ایک فرد شاہ اسماعیل شہید اور اسی خاندان کے تربیت یافتہ حضرت سید احمد شہیدؒ تو صحابہ کرامؓ کے بعد اپنے جہد وعمل اور ایثار وخلوص کی بدولت پوری امت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ بلا کسی تشبیہ وتمثیل کے انبیاء علیہم السلام کے مقدس گروہ میں جو امتیازی مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا ہے۔ یہی مقام امتِ محمدیہ علیہ التحیہ والسلام میں خاندانی لحاظ سے شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کا ہے — اور پھر اسی خاندان کی معنوی وروحانی اولاد مشائخ واکابر دیوبند ہیں کہ اس جماعت کے علماء نے اپنے علم وفضل سے کتاب وسنت کی خدمات جلیلہ وعظیمہ کی جو تابناک مثال قائم کی ہے۔ اس کی مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی[1] — اس جماعت کے آخری دور کے علماء ومشائخ میں سے ایک نامور شخصیت حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی ہے جن کا مختصر تذکرہ گذشتہ اوراق میں گذر چکا ہے۔ ۶۲ء میں جب اس کتاب کی ترتیب شروع کی گئی تو ان دنوں حضرت مولاناؒ کے صاحبزادہ محمد یوسف صاحب بقید حیات تھے اور ہم نے جن اکابر کے تذکار کا قصد کیا تھا وہ سب واصل بحق ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ۱۹۶۵ء میں اپنے اکابر سے جا ملے اگر کتاب کی ترتیب اب ان کے وصال کے بعد ہوتی تو حضرت مولاناؒ کی مبارک زندگی اپنے علم وعمل کے اعتبار سے یقیناً اس قابل تھی۔ کہ ان کا مستقل تذکرہ اس کتاب میں کیا جاتا۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اپنے تمام علم وفضل کے باوجود ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ مگر ان کے فرزند ارجمند اپنے گرامی قدر والد کی چلائی ہوئی تحریک کی قیادت وامارت کرتے ہوئے عالمگیر شہرت کے مالک ہوئے[2] اور اس وقت دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جہاں تبلیغی جماعت کے افراد کے مبارک قدوم نہ پہنچے ہوں پچاس برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟

---

[1] اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کے لئے کتاب بیس بڑے مسلمان مرتب کی گئی ہے۔ (ارشد)

[2] تاہم الفضل للمتقدم ومن سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بہا الحدیث کے مصداق مولانا محمد یوسفؒ اور ان کے ساتھیوں کی خدمت اور فضل وشرف بھی انہی کا حصہ ہے اور نیک نیتی کے اعمال کے اجر باب کو بھی برابر ملتے رہتے ہیں

قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۵ھ
۱۸۷۸ء

۱۳۸۲ھ
۱۹۶۲ء

خیالات رکھنے والوں اور مختلف المزاج اشخاص کو ایک جگہ جمع دیکھا ہے۔ ایک ہی مجلس میں ایک طرف پکے لیگی بیٹھے ہیں اور دوسری طرف کٹر کانگرسی، ایک طرف احراری رہنماؤں کا حلقہ ہے اور دوسری طرف جمعیۃ العلماء کے مشائخ جلوہ افروز ہیں۔ احرار رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور کانگرس اور احرار کے مشہور لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ حضرتؒ ہی کے دامن سے وابستہ تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے رہنما صوفی عبدالحمید صاحب (سابق وزیر زراعت پاکستان) کو حضرتؒ ہی کا خادمِ خاص ہونے پر ناز ہے۔ آزاد فتح پوری اور مولانا عبدالمنان دہلوی جیسے قادر الکلام شعراء اور مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے وسیع النظر ادباء کو حضرتؒ ہی کے آستانہ مبارک پر سرِ ارادت خم کرنے کا فخر حاصل ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارن پوری، استاذ العلماء مولانا محمد ابراہیم صاحب میاں چنوں والے، مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری، مولانا محمد صاحب انوری لائل پوری اور استاذی حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب دعرم کوٹیؒ جیسے مقدس ومتقی علماء آپ کو حضرتؒ ہی کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ بدنام کنندۂ نکونامان راقم السطور جیسے ننگِ اسلاف کو بھی آپ حضرتؒ کے دامن عفو میں پناہ لیتے ہوئے پائیں گے۔

بڑے بڑے مشائخ اور علماء، صلحاء اور حکماء کی سیرتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے عالی ظرف اور عالی استعداد جن کے ہاں ہر چیز کی سمائی ہو دنیا میں بہت ہی قلیل لوگ ہوئے ہیں۔ حضرتؒ کا معمول تھا کہ مجلس میں جس قسم کا کوئی آدمی آجاتا حضرت والا اُس سے اس کے مزاج اور افتادِ طبیعت کے مطابق ہی گفتگو فرماتے۔ راقم السطور کے آباؤ اجداد چشتی تھے اس لئے جب کبھی حاضر خدمت ہوتا حضرت رحمۃ اللہ علیہ مشائخ چشت کا تذکرہ فرماتے۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مشائخ کی دو خصوصیات ایسی ہیں جو انہی کا حصہ ہیں ایک تو عشق ومحبت ہے اور دوسری جذب وفنائیت" اپریل ۱۹۶۲ء میں احقر نے اپنی کتاب "تذکرہ سلیمان تونسویؒ" کا ایک نسخہ حضرتؒ کی خدمت میں رائے پور شریف روانہ کیا۔ جسے حضرتؒ نے مجلس میں پڑھوا کر سُنا۔ جب آخری دَورے میں پاکستان تشریف لائے اور راقم السطور حاضر خدمت ہوا تو فرمایا "میں نے آپ کی کتاب سُنی ہے ماشاء اللہ خوب لکھی ہے" پھر فرمایا "ہمارے تو سارے ہی بزرگ ہیں، خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ خواجہ شمس الدین سیالویؒ اور پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ سبھی کو ہم مانتے ہیں اور یہ سب نہایت سچے لوگ تھے"۔

بعض اوقات صاحب استعداد مریدین کی مخفی استعدادوں کو اجاگر کرنے کے لئے اُن کے کسی صحیح وصف کی جو فی الواقع ان میں پایا جاتا تعریف فرماتے اور اس طرح ان کو اپنے ساتھ جوڑ کر نہایت حکیمانہ طور پر ان کی تربیت فرماتے۔ مشہور ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی نے اپنی مشہور عالم کتاب "میٹھے بول میں جادو ہے" میں لوگوں کو دوست بنانے کا ایک یہ اصول بھی لکھا ہے کہ "ہر شخص کی جائز تعریف کیجئے اور اُسے دوست بنائیے"۔ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے تمام اصول جو علم الاخلاق کے ماہرین بڑی کدوکاوش کے بعد محض علمی طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ہم کو عملی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کے اسوۂ حسنہ میں مل جاتے ہیں لیکن افسوس کہ لوگ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کے دروازوں پر بھیک مانگنے جاتے ہیں جو خود اخلاق وعمل سے عاری اور اس معاملہ میں دوسروں کے محتاج ہیں اور جن کے پاس تھوڑا بہت جو کچھ

حضرت کو اپنے شیخ اور شیخ سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے اتنا اُنس اور محبت تھی کہ فرمایا کرتے تھے کہ "ہمیں تو رائے پور کا کتا بھی پیارا ہے۔" کوئی حضرت کا دور سے دور کا رشتہ دار بھی ہوتا، تو اس سے اس طرح جھک کر ملتے کہ گویا اپنے کسی معزز قریبی عزیز سے مل رہے ہیں اور ان سے اس درجہ اظہار تعلق فرماتے کہ نہ جاننے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ یہ لوگ حضرت کے کوئی قریبی عزیز اور خصوصی تعلق والے ہیں اپنے قریبی عزیزوں کو ان کے مقابلہ میں ہمیشہ پیچھے رکھا۔[1]

اس غایت تعلق کا نتیجہ یہ تھا کہ کامل مناسبت اور اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "میرے اور شیخ کے تعلق کا کیا پوچھتے ہو کوئی بات حضرت کے قلب میں آتی وہی بات میرے دل میں آجاتی تھی"۔[2]

حضرت سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے۔ اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس کو اپنے حق میں نہایت مفید و موجب ترقی سمجھتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ:-

• رائے پور میں شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم کی بیماری کی خبر آئی۔[3] میں نے سوچا کہ یہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم تھے، خالص لوجہ اللہ بغیر بلائے ان کی عیادت کو جانا چاہیے۔ اس لیے رائے پور سے پیدل بہٹ گیا۔ اس جانے میں عجیب کیفیت رہی۔ اور ایک ایسی خوشبو آتی رہی کہ پھر وہ نہیں آئی۔ یہ اس صحیح نیت کی برکت تھی۔"[4]

یہ تعلق مرور ایام اور طویل مدت سے مضمحل اور کمزور نہیں ہوا تھا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا اور وقت آخر قریب آتا جاتا تھا، اس محبت و تعلق میں اضافہ و ترقی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں حضرت لکھنؤ میں مولانا محمد منظور صاحب کے مکان پر تشریف رکھتے تھے۔ راقم سطور بھی حاضر تھے۔ حضرت اپنے مرشد مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کے مرض وفات اور انتقال کا حال بیان فرما رہے تھے۔ جب انتقال کا ذکر فرمایا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زخم تازہ اور حادثہ بالکل قریب کا ہے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں مرض وفات میں حضرت کا ایک مکتوب بنام شاہ زاہد حسن پڑھا جا رہا تھا۔ جب آخر میں حضرت کا اسم گرامی "احقر عبدالرحیم" آیا تو ضبط نہ ہو سکا رقت طاری ہو گئی۔

نہ صرف اپنے شیخ جن سے براہ راست تعلق تھا اور جو ولی نعمت تھے بلکہ اپنے سلسلہ کے تمام شیوخ بالخصوص سلسلہ ولی اللّٰہی اور سلسلہ امدیہ کے مشائخ اور اہل سلسلہ سے نہایت درجہ عقیدت مندی اور عشق و محبت کا تعلق تھا۔ ان حضرات کے بارے میں کسی طرح کی تنقیص یا تنقید کی طبیعت متحمل نہیں تھی۔ اور یہ ایک ایسی غیر اختیاری کیفیت تھی جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو سچی محبت، کامل اعتماد اور شرافت اور شکر گذاری کا جذبہ فطرت میں ملا ہے۔ صوفی محمد حسین صاحب راوی ہیں:-

ایک دفعہ ڈھڈیاں میں شام کا کھانا ہو رہا تھا۔ حضرت والا خود دسترخوان پر تشریف فرما تھے۔ ایک صاحب سرگودھا سے تشریف لائے، جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کو کھانے میں شریک ہونے

---

[1] تحریر مولانا عبدالوحید صاحب۔

[2] تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب۔

[3] اس بیماری کے بعد حضرت شاہ صاحب عرصہ تک زندہ رہے۔ حضرت شاہ صاحب کی پشت پر سرطان ہو گیا تھا اور وہ اچھا ہو گیا۔ اس مرض تک شاہ صاحب کو حضرت سے کچھ زیادہ موالفت و عقیدت نہ تھی، لیکن اس کے بعد ان کو حضرت سے عاشقانہ و خادمانہ تعلق پیدا ہو گیا جو آخر تک رہا۔

[4] تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب۔

کو کہا، چنانچہ کھانے میں شریک ہو گئے۔ ان کو حضرت کے ساتھ ہی جگہ ملی۔ ابھی ایک ہی لقمہ اٹھایا ہوگا کہ انہوں نے حضرت اقدس سے سوال کیا (سوال بھی بڑے اکھڑپن سے کیا)، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کیوں ناکام ہو گئی تھی؟ ناکامی کی وجوہات کیا تھیں! حضرت اقدس نے بڑی ناگواری کے ساتھ بلکہ غصہ کے ساتھ فرمایا کہ ہم کوئی بزرگوں کے عیب نکالنے کے لیے تھوڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی سعی بہرحال مشکور ہے۔ اس سے وہ صاحب خاموش ہو گئے۔"

بے نفسی و فنائیت

حضرت نے اپنے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فنائیت و بے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ و تاثر جو کچھ بیان فرمایا حضرت کے یہاں رہنے والوں کا بعینہٖ یہی تاثر حضرت کی ذات سے متعلق ہے۔ کہ کبھی ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو۔ حُبّ جاہ کا یہاں سر کٹا ہوا تھا۔ اس خادم کو ۱۳۶۹ھ کے آخری سفر حج میں ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اور تقریباً تین مہینے شب و روز ساتھ رہنا ہوا۔ بعض خدام نے اپنے ادراک و الطاف الٰہی کے واقعات بھی سنائے۔ پورے سفر میں حضرت نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس سے حضرت کے علو مرتبہ یا کسی کشف و ادراک کا احساس ہو۔ حج کے علاوہ بھی کبھی کوئی ایسی بات قصداً نہیں فرمائی۔ جس سے لوگوں کی عقیدت میں اضافہ یا آپ کی بزرگی کا احساس ہو۔ خدام نے جب سنا، اپنی نفی، اپنا انکار، اپنی بے حسی اور عبادت کا اظہار سنا۔ مشیخت کی باتیں یا متصوفانہ نکات یا سلوک و معرفت کی تحقیقات بیان کرنے کا حضرت کے یہاں دستور ہی نہ تھا۔ مسئلہ علماء سے پوچھتے۔ تصوف کی کوئی بات پوچھتا تو اگر حضرت شیخ الحدیث یا کوئی دوسرا صاحب علم و صاحب نظر قریب ہوتا تو اس کی طرف محول فرما دیتے۔ اگر اصرار کیا جاتا اور بات ضروری ہوتی تو نہایت نپے تلے لفظوں میں مغز کی بات فرما دیتے۔ ایسی بات سے گریز کرتے جس سے آپ کی ژرف نگاہی باریک بینی کا اندازہ ہو۔ لیکن اہل حقیقت سمجھ جاتے کہ

غواص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

کسی بھری مجلس میں خواہ اس میں کیسے ہی منتخب اور سربرآوردہ اشخاص کیوں نہ ہوں اپنی لاعلمی اور اپنے عامی ہونے کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ خواہ اس کا اثر حاضرین مجلس اور خاص طور اہل علم طبقہ پر کچھ پڑتا ہو۔ راولپنڈی میں ایک مرتبہ قریشی صاحب کی کوٹھی پر صحن میں عصر کے بعد بڑی وسیع مجلس تھی۔ بعض اعلیٰ عہدہ دار، ممتاز علماء، اور عمائد شہر جمع تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب جے پوری نے غالباً اس خیال سے کہ حضرت کچھ ارشاد فرمائیں۔ اور لوگ مستفید ہوں۔ سوال کیا کہ حضرت صبر کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت نے بڑی بے تکلفی سے راقم کی طرف اشارہ کیا کہ مجھے تو معلوم نہیں۔ اُن سے پوچھو۔ میں نے اپنے نزدیک بڑی کسر نفسی اور تواضع سے کام لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس کے لغوی معنی کے سوا کچھ معلوم نہیں۔ نہایت سادگی اور اطمینان سے فرمایا۔ کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں! مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ حضرت کو اس کا احساس نہیں معلوم ہوتا تھا کہ مجلس کے خواص حضرات سے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ جن کو علماء اور عمائد کے ایک بڑے گروہ نے اپنا شیخ و مربی تسلیم کر رکھا ہے۔

ایک مرتبہ لائل پور کے دوران قیام میں اس بارے میں خدام و احباب کے درمیان بڑی کشاکش تھی۔ کہ حضرت رمضان کہاں کریں۔ لائل پور کے اہل تعلق لائل پور کے لیے کوشاں تھے لاہور کے احباب لاہور کے لیے مصر تھے۔ اور قریشی صاحب وغیرہ راولپنڈی کے لیے عرض کرتے تھے۔ حضرت نے ایک روز سحور کے وقت تینوں گروہوں کے خاص خاص اشخاص کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی دیکھو میں ایک غریب کاشتکار کا لڑکا ہوں میرے گھر میں ایسی غربت تھی کہ میں جب طالب علمی میں آیا کرتا تھا تو میری والدہ کو فکر ہوتی تھی۔ کہ گیہوں کی روٹی کا انتظام کس طرح کریں! علمی بھی ہوں، اول تو کچھ زیادہ پڑھا نہیں۔ پھر جو کچھ پڑھا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔ اب تم جو مجھے کھینچے کھینچے پھرتے ہو اور کوئی ادھر لے جانا چاہتا ہے کوئی ادھر تو یہ محض

دینے کے لیے مشکل اور جان جوکھوں کی مہمات سے ذرا نہیں گھبراتے۔ سائنس کی موجودہ تحقیق و ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے۔ وہ انسان کو چاند تک رسائی کو بعید از قیاس تصور نہیں فرماتے تھے بلکہ ایک روز اپنے ایک خادم سے ہنس کر فرمانے لگے:۔

"جب لوگ بالائے زمین چاند پر پہنچیں گے تب ہم کہیں زیر زمین پہنچ چکے ہوں گے۔" اجرام فلکی کی گردشیں، خلا میں ان کے نظامات اور اس بارے میں سائنسدانوں کے حیرت انگیز انکشافات کی خبروں سے اکتاتے نہیں تھے بلکہ حضرت کی دلچسپی کے مدنظر راقم نے اس سلسلہ میں کئی بار مفصل بہت کچھ عرض کیا۔ اس ضمن میں کبھی کبھی وہ خود بھی کوئی بہت پتہ کی بات پوچھ لیا کرتے تھے۔

ایک روز حضرت کو بتایا گیا کہ مسجد اقصیٰ کے گنبد کی تعمیر کے لیے عرب ممالک میں چندہ کی تحریک ہو رہی ہے اور سعودی حکومت نے اپنی جانب سے اتنے ریال دینے کا اعلان کیا ہے۔

حضرت کو اس خبر سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ بلکہ افسوس کا اظہار فرمایا اور کہا یہ سب بے کار ہے۔ گنبد کی مرمت سے کہیں ضروری یہ ہے کہ اس رقم سے سعودی حکومت ملک میں کوئی مدرسہ تعلیمی مرکز یا صنعتی ادارہ قائم کرتی۔ حضرتؒ کو مسلم ممالک کی تعلیمی پسماندگی اور صنعتی کم مائگی اور سائنسی اور دیگر فنی شعبوں میں ترقی نہ کر سکنے کا بہت قلق رہتا۔ اگر ان ممالک سے صنعتی یا تعلیمی ترقی کی کوئی خبر موصول ہوتی تو حضرت سن کر بہت مسرور ہوتے۔ پچھلے دنوں مصر سے راکٹ اور جٹ ہوائی جہازوں کے تیار ہونے کی خبریں آئیں تو حضرتؒ نے خاص شوق سے انھیں سُنا۔ اگر کبھی عالم اسلامی کے باہمی انتشار و آویزش کی کوئی خبر سنتے تو کچھ مغموم سے ہو جاتے۔ الجزائر کی تحریک آزادی کی خبروں کو پوری توجہ سے سنا کرتے اور حصول آزادی کے بعد ان کی آپس کی چپقلش کی خبروں سے افسردہ خاطر ہوتے۔

حضرت مختلف اور فنی امور میں مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کو زمانہ کی ضرورت و تقاضا کے مطابق لازمی خیال فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میدان میں مسلمان کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اگر کوئی حضرت کی خدمت میں جا کر یہ عرض کرتا کہ بچوں کو سائنس کی تعلیم کے لیے کسی فنی ادارہ میں داخل کرنا ہے یا مزید تعلیم کے لیے کہیں باہر بھیجنے کا خیال ہے تو بہت مسرور ہوتے اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ حضرت کچھ شعبوں میں عورتوں کی اعلیٰ فنی تعلیم کو بھی ایک ضابطہ کے اندر ضروری خیال فرماتے تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹری کے پیشہ کے لیے عورتوں کے علاج کی خاطر اس تعلیم کو عورتوں کے لیے مفید خیال فرماتے تھے۔

حضرت کبھی کبھی خبریں سننے کو اپنا "وظیفہ" کہا کرتے تھے۔ ایک روز جب میں حاضر ہوا تو دیکھا مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مرحوم حضرت کی چارپائی کے ساتھ لگے حضرت سے باتیں کر رہے ہیں، مجھے کسی نے دور سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مطلب تھا کہ شاہ صاحب کی حضرت سے مخاطبت میں کوئی خلل نہ ڈالا جائے۔ میں نے سکوت کیا اور حضرت کے سرہانے کی جانب چارپائی کے قریب دبک کر بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت نے دوسری جانب منہ پھیر کر فرمایا "یہاں کون کون بیٹھا ہے؟ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی میرا نام بھی لیا گیا۔ حضرت نے فوراً کہا۔ "ارے تم کہاں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ادھر آؤ" پھر شاہ صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا "حضرت اب ہم اپنا وظیفہ کرنے لگے ہیں" اور پھر ارشاد ہوا:۔ "اچھا کوئی خبر سناؤ"[1]

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۲۶ اگست ۱۹۶۲ء

آہ قطب الارشاد گزشت ۱۳۸۲

نظم فراق

سلطان العرفا، سید الطائفہ حضرت اقدس مولانا و مرشدنا شاہ عبدالقادر رائپوری نور اللہ مرقدہ

از

کمترین متوسلین ہدیہ عرب نفیس الحسینی غفرلہ

اے غمِ جاناں اے غمِ جانم — دل ہے پرخوں، آنکھیں پرنم
اللہ اللہ، اُن کا عالم — عشق سراپا، حسن مجسم
حضرت عبدالقادر ثانی — قبلۂ ما و قبلۂ عالم
قطبِ زمانہ، غوثِ یگانہ — رشکِ جنید و شبلی و ادہم
فانی فی اللہ، باقی باللہ — ختم ہے اُن پر اُن کا عالم
جامعِ سنت، قامعِ بدعت — نائبِ حضرتِ فخرِ دو عالم
عسکری اصحابِ مقدس — لشکری پیغمبرِ خاتم
نورِ شریعت، فیضِ طریقت — جاری ساری باہم باہم
ایسا عارف، ایسا مرشد — ڈھونڈھ نہ پائے عالم عالم
تجھ سا نہ دیکھا، تجھ سا نہ پایا — اُتّر، دکھن، پورب، پچھم
دیکھوں دلبر، لیکن پھر بھی — تیرا عالم، تیرا عالم
حسنِ تکلّم، رنگِ تبسم — غم کا مداوا، زخم کا مرہم
گاہ اشارہ، گاہ کنایہ — مجمل مجمل، مبہم مبہم
سوز، مروت، لطف، عطفہ — دردِ محبت پیہم پیہم
اپنے پرائے، یکساں یکساں — سب کا مونس، سب کا ہمدم
استغنا کا عالم، واللہ — خاک برابر لاکھوں درہم
اُف رے دبی چنگاری دل کی — آگ لگا دی پورب پچھم
آہ ترا اندازِ محبت — عشق میں شعلہ، حسن میں شبنم

یاد رہیں گے تیرے جلوے — روشن روشن، مدھم مدھم
آہ کہ تجھ سے گرمیِ محفل — آہ کہ اب ہے درہم برہم
اُجڑا اُجڑا، ویراں ویراں — ہائے وہ رائپور کا عالم
ساحلِ جمنا پر کیا گزری — آہ وہ طوفاں برہم برہم
تم ہی کہو کچھ غم کی کہانی — اے لبِ راوی اے لبِ جہلم
آہ نفیسِ زار کی حالت — بیکل بیکل، بیدم بیدم
اللہ اللہ دیکھ لیا ہے! — حشر سے پہلے حشر کا عالم
سینہ بریاں، دیدہ گریاں — آہ کہ اب کس حال میں ہیں ہم
ذکر کی دنیا سونی سونی — فکر کا عالم درہم برہم
دنیا دنیا عقبیٰ عقبیٰ — عالم عالم تیرا ماتم
دل کہ شہیدِ ناز ہے تیرا — زندہ ہے اب بھی سسک کر کم کم
آہ کہ تجھ بن چین نہیں ہے — یاد ہے تیری پیہم پیہم
ان شاء اللہ، ان شاء اللہ — آج سے ہے یہ وعدہ محکم
وہ جو عزیزِ جہاں ہے تمہارا — وہ ہے ہمارا اس کے ہیں ہم
آہ کہ زادِ حشر نہیں ہے! — آہ ندامت سے ہے سر خم
اے مرے شفیق، اے مرے محسن — تم ہو جو کہے پھر مجھے کیا غم
ہاتھ میں تیرے ہاتھ دیا ہے — لاج بھی تیرے ہاتھ ہے ہمدم
حشر میں ہم کو بھول نہ جانا — یار کے لائق گو نہیں ہم

حشر تک تربت پر تیری
نور کی بارش برسے چھم چھم

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۴ھ
۱۸۸۷ء

۱۳۸۱ھ
۱۹۶۲ء

ایک تھے۔ اور یادِ خدا میں مستغرق تھے۔ اس بزرگ نے بلاتقریب آپ کو ایک وظیفہ بتایا اور کہا کہ اگر آپ یہ وظیفہ پڑھیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ آپ کو نظربندی کی زحمت سے نجات دے گا۔ لہٰذا حضرتؒ نے یہ وظیفہ سات دن پڑھا۔ تو ملہم غیبی نے رات کو خواب میں آپ کو رہائی کا مژدہ سنایا۔

برطانوی سیاست اور علماء حق: جب ۱۸۵۷ء میں برطانوی ریشہ دوانیاں کامیاب ہو رہی تھیں۔ حضرت سراج الدولہ مرحوم نے کفر کی یلغار کے سامنے غازیانہ اقدام فرمایا۔ مگر اس مجاہد کا خونِ حریت پلاسی کے میدانِ جنگ میں گر کر ہمیشہ کے لئے خشک ہو گیا۔ اس کے لئے مجاہدِ کبیر حضرت سلطان شہیدؒ نے سگانِ برطانیہ سے ارضِ ہند کو پاک کرنے کا مکمل تہیہ کیا تو مشیتِ ایزدی نے اُس پاک باز مجاہد کا نام تو یقیناً شہدائے بالاکوٹ کی فہرست میں سب سے نمایاں جگہ پر لکھ دیا۔ مگر اس کی غدار، دین فروش، پست اور عیاش قوم کے افراد کو برسوں کی نحوست میں گرفتار کر دیا۔

بالِ بازاں را سوئے سلطاں بُرند   بالِ زاغاں را بگورستاں بُرند

اس زوال و انحطاط کے دور میں علماء خیر اپنی تمام کوششیں دینِ الٰہی کے احیاء کے لئے صرف کرتے رہے۔ برطانوی حکومت کے جبر و استبداد اور اسلام دشمنی کے تمام منصوبوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے کمزور بندوں کے ہاتھوں اپنے دین کی حفاظت کروائی۔ بلکہ روزِ اوّل سے یہی عادت اللہ اور سنتہ اللہ جاری و ساری رہی ہے کہ وہ ابابیلوں کی چونچوں میں سنگ ریزے بلوا کر ہاتھیوں کو تباہ کرواتا ہے۔ اسی طرح اور میں اسی طرح برطانوی ابرہہ کے مقابلے میں ہندوستان میں دین کے کعبے کی حفاظت کا کام لیا گیا۔ ان علماء خیر پر کروڑوں رحمتیں ہوں جنھوں نے سوکھے ٹکڑے چبا چبا کر اور قید و بند کی سختیاں برداشت کر کے قرآن کریم کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔ ورنہ انگریز جیسے شاطر دشمن نے اسلام کی تذلیل و تضحیک میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور سہارن پور کے فارغ التحصیل علماء کو پانچ روپے کی ملازمت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ مگر سرکاری سکولوں کے پانچویں پاس نااہلوں کو ہر جگہ ملازم رکھا جاتا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت سید انور شاہ کاشمیریؒ، حضرت مولانا محمود الحسنؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کی خدائی ہمتوں نے بفضلِ ایزدِ متعال کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ .... کا منظر پیش کیا۔ اور اسی قافلے کے ساتھ سید السادات زعیم احرار اسلام حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور قطبِ دوراں ممدوحِ جہاں حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جن کی شبانہ روز کوششوں نے کفر و بدعت کے ہر وار کو اپنے ہاتھوں پر لیا۔ اور پُرخطر ماحول کا ہر موقع پر منہ چڑایا اور دینِ مصطفویؐ کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کر دی۔ دنیا کے حقیقت پسند مورخین جب اس دور کی تاریخ لکھیں گے تو اُن کو ماننا پڑے گا کہ سید المجاہدین سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر درگاہِ عالم کی طرف سے مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ و بقاء کے لئے آئے تھے اور اسی راہ میں شہید ہوئے۔ لہٰذا آپ کو شہید ختم نبوت کہنا ہر لحاظ سے بجا ہے اور حضرت مولانا و سیدنا شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ خدمتِ قرآن کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اور اسی پیغمبرانہ خدمت میں جاں بحق ہوئے۔ اس لئے آپ کو شہید قرآن کا لقب ہر دلیل سے زیبا ہے۔

لاہور میں ورودِ مسعود: خداوندِ عالم نے تمام ظاہری اسباب کی موجودگی میں اپنی قدرت کاملہ کے معجز نما ظہورات مختلف

سیدنا شیخ الہند ثانی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ: شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کا ذکر خیر ہے۔ جن کی شخصیت پر حضرت لاہوریؒ کو بہت ناز تھا۔ لاہور کی فضائیں اور انسانی سبھائیں اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ کہ جب کبھی حضرت شیخ التفسیر کی زبان مبارک پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی آتا تو آپ کا چہرہ فرطِ عقیدت سے تمتما اٹھتا۔ آنکھوں میں ایک تہورانہ چمک ہوتی اور آپ کے ضعیف رگ و پے میں حریتِ فکر و عمل کی ایک بجلی دوڑنے لگتی۔ حضرت لاہوریؒ نے حریت کا درسِ اولین حضرت سندھیؒ اور حضرت شیخ الہند سے پڑھا تھا۔ اور مکتبِ حریت میں آپ کو حضرت مدنیؒ کے ہم سبق ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حضرت مدنیؒ کی صدارت کے وقت انڈین نیشنل کانگرس مسلم لیگ، احرار اور جمعیۃ علماء ہند سیاسی اور مذہبی جماعتیں تھیں۔ جو اپنے اپنے صوابدید کے مطابق آزادیٔ ہند کا کام کر رہی تھیں۔ حضرت مدنیؒ کی صدارت سے لے کر آپ کی وفات تک کے حالات اگر دیکھنے مقصود ہوں تو علماء حق کتاب حصہ اول و دوم کے کم از کم ۸۳۰ اصفحات کا مطالعہ کیجئے۔ تاکہ آپ پر واضح ہو سکے کہ اس شیر بیشۂ حریت اور دورِ ماضی کے قائدِ انقلاب نے ہندوستان کی سرزمین میں مکمل پیکرِ اسلام بن کر کن کن براہیمی اور اسماعیلی کارناموں کو سرانجام دیا۔ اور حضرت لاہوریؒ اور آپ کے باقی رفقاء کار نے ان میں کیا کیا حصہ لیا۔ ۱۹۳۹ء میں جبکہ دوسری عالمگیر جنگ میں ہندوستانیوں کی شرکت کا سوال پیدا ہوا۔ اور حضرت مدنیؒ کی صدارت میں ۲۹-۳۰ ستمبر ۱۹۴۰ء کو اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ انگریزوں کی مدد کے لئے کوئی وجہ جواز نظر نہیں تو اس وقت علماء کرام نے اپنے اس فیصلے کو تقاریر کے ذریعے اعلان کرنا شروع کیا۔ تو علماء کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ اُن میں حضرت شیخ التفسیرؒ کا نام نامی سرفہرست ہے اور الفاظ یہ ہیں: "حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور، جو تفسیر و ترجمۂ قرآن کے درس میں غیر فانی شہرت کے مالک ہیں۔ اور جن کے تلامذہ اور مستفیضین کی تعداد جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہزاروں سے بھی متجاوز ہے۔ (کتاب علماء حق حصہ دوم ص۱۵۰)

تحریک خاکساراں: حق و صداقت کی تائید حریت و جہاد کی جان ہے۔ ہر شخص اس مجاہدانہ اقدام کی جرأت نہیں رکھتا۔ لیکن اس صداقت کی تائید جو مخالف پارٹی میں پائی جائے یقیناً پیغمبرانہ فعل کے مشابہ ہے۔ اپنوں کی مدحت سرائی لاکھوں کا شیوہ ہے مگر لاکھوں میں شاید ایک آدھ زبان ہوگی جس سے مخالفت کی خوبی کی تحسین نکل سکتی ہو۔ بڑے بڑے جبہ پوش فرقہ پرستی کو اپنا امتیازی نشان بنائے بیٹھے ہیں۔ اغیار کے حسینؓ کی تعریف اس مسلک میں حرام ہے۔ اور اپنے یزید کی قصیدہ خوانی ثواب ہے مگر اللہ تعالےٰ کی کرم فرمائی سے خلق خدا میں ایسے انسان بھی قیامت تک موجود رہیں گے جو دشمن کی زبان سے نکلے ہوئے کلمۂ خیر کو کلمۂ خیر ہی کہیں گے اور دوست کی برائی کو برائی ہی سے تعبیر کریں گے۔

خاکسار تحریک کا بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی دماغی قوتوں کے اعتبار سے ایک بے نظیر شخصیت کا حامل تھا لہٰذا اس کی طالب علمی کا زمانہ انتہا درجے کی ناموری اور جاذبیت رکھتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے مسٹر عنائت اللہ مشرقی کو علامہ بننے پر آمادہ کیا اور آخر کار علامہ صاحب کو مذہبی رہنمائی کا شوق پیدا ہوا "تذکرہ اور اشارات" وغیرہ تصانیف لکھیں۔ مولوی کا غلط مذہب بڑے اہتمام سے شائع ہونے لگا علماء حق نے اس تسلی آمیز روش پر نظر غائر ڈالی تو دین حقہ کی توہین و تضحیک کی صورت سامنے آئی۔ اخبارات اور رسائل اور عام جلسوں میں علامہ صاحب کی بیباکی کے تذکرے ہونے لگے۔ جہاں باقی علمائے ملت نے علامہ کی لن ترانیوں اور انا الموجود لاغیری کے نعروں کی مخالفت کی وہاں حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس غلط نیاوت کی پیرہ دستیوں سے عوام کو آگاہ کیا اور ایک چھوٹا سا رسالہ بھی اس ضمن

میں چھپوایا۔

حضرت شیخ التفسیرؒ کی زندگی کا یہ واقعہ اور پھر اس دَور تعصب و فتن میں اس بے لاگ تائید حق کی مثال شائد کسی دوسری جگہ نہ مل سکے۔ آپ علامہ مشرقی کی روش کی شکایت تو کرتے تھے۔ مگر ان کے بھولے بھالے رضا کاروں کی موت کو شہادت اور ان کی زندگی کو مجاہدانہ زندگی سے تعبیر کرتے تھے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اس مبارک زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

اسی ضمن میں یہ واقعہ ہر لحاظ سے قابل بیان ہے کہ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی نے (جن کی اسلامی سرگرمیوں میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی مجذوبانہ جھلکیں نظر آتی ہیں) سرحد میں ایک جلسے کا انتظام کروایا۔ اس جلسے میں اس وقت کے مقتدر علماء کرام نے شرکت کی۔ علماء کی مجلس مشاورت میں یہ بات کافی دیر تک جاری رہی کہ علامہ مشرقی کے مخالفانہ رویہ کی تردید کس کے ذمہ ڈالی جائے۔ آخر کار تمام علماء نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب اس جرأت مندانہ کام کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ لہٰذا آپ نے اسٹیج پر تشریف لاکر ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں تذکرہ پکڑ کر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ آپ ان دونوں میں سے کس کی پیروی کریں گے۔

حاضرین نے کہا کہ ہم قرآن مجید کی پیروی کریں گے۔ بعدازاں آپ نے تذکرے کی چند عبارات پڑھ کر کتاب و سنت کی روشنی میں ان کی تردید کی۔ حاضرین جلسہ آپ کی ایمان افروز تقریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سرحد کے اکثر لوگ علامہ صاحب کی جماعت سے نکل گئے۔

محولہ بالا واقعات کے باوجود احقر نے حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب سے سنا ہے کہ علامہ مشرقی کئی دفعہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد شیرانوالہ میں تشریف لاتے اور میرے سامنے صاف اقرار فرماتے تھے کہ "مولانا! میں آپ کا مخالف نہیں ہوں بلکہ علماء سوء کا مخالف ہوں"۔ اس رجوع و انابت کے پیش نظر ہم خدا تعالےٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل عمیم سے ہمارے محترم بھائی کی فروگزاشتوں سے درگزر کرے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔

جہادِ کشمیر: قیام پاکستان کے فوراً بعد کشمیر میں بعض وجوہات پر جنگ چھڑ گئی۔ کشمیر کی اس صورتِ حال کو مکاتیب فکر (مختلف SCHOOLS OF THOUGHTS) کے رہنماؤں نے جہاد کا نام دیا۔

لاہور کے ام القریٰ سے جو آواز بلند ہوتی ہے وہ ملک کے گوشے گوشے میں زندگی بن کر پھیل جاتی ہے حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جنگ کو جہادِ اسلام کے نام سے تعبیر فرمایا اور نہایت مجاہدانہ مستعدی سے اس میں حصہ لیا۔ کئی دفعہ روپے۔ کپڑے اور باقی ضروریات کی چیزیں مجاہدین کشمیر کے لئے فراہم کی گئیں اور لاہور ہی میں کشمیری نمائندوں کے حوالے کی گئیں۔ روزانہ درسِ قرآن مجید جمعہ کی تقاریر اور باقی مختلف مقامات پر ریزولیشنوں اور تقریروں کے ذریعے حضرت مرحوم نے مسلمانان پاکستان کو اس اسلامی جہاد کی ترغیب دلائی۔

الغرض آخر کار دس ہزار کی ایک رقم خطیر لے کر خود راولپنڈی تشریف لے گئے اور یہ رقم کشمیر کے پہلے صدر سردار ابراہیم صاحب کے حوالے کی۔ اس مبارک سفر میں آپ کے ہمراہ آپ کے صاحبزادے قاری عبیداللہ انور صاحب بھی موجود تھے۔

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ کمترین نے جب اپنے آقائے روحانی کو لاہور میں مجاہدین کشمیر کی امداد کے لئے رات دن کام کرتے دیکھا تو اپنے گاؤں تھوہ والا میں جاکر اپنے احباب سے مشورہ کیا تو انہوں نے نہایت سرگرمی سے ہنگامی چندے کی فراہمی شروع کر دی۔ پہلی دفعہ مبلغ گیارہ سو روپے اکٹھے ہوئے

قبر سے فردوسی خوشبو تاریخ میں تین چار ایسے بزرگ ملتے ہیں کہ جن کی قبروں سے بعد از دفن ایسی خوشبو کا نشر وع ہوئی کہ لوگ اس کو محسوس کر کے حیران ہوئے کہ ایسی عمدہ خوشبو ہم نے دنیا میں کبھی نہیں سونگھی۔ ان میں پہلا نام حضرت امام بخاریؒ کا اور دوسرا نام میاں سید اصغر حسین دیو بندی کا ہے۔ تیسرا اور چوتھا واقعہ پنجاب میں پیش آیا۔ ساہی وال میں حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب اور لاہور میں حضرت شیخ التفسیرؒ کی قبر سے اور یہ نتیجہ ہے کمال اتباع سنت کا۔ لاہور کے باشندوں نے یک زبان ہو کر پکارنا شروع کر دیا۔ کہ حضرت مولانا سید الابرار والاخیار کی تربت پاک سے فردوسی خوشبوئیں آنے لگی ہیں۔ نہایت معتمد افراد نے جا کر پتہ لگایا۔ حضرت کی مرقد اقدس کی پاکیزہ مٹی کا ہر طرح کیمیکل CHEMICAL معائنہ کیا گیا لیکن یہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا۔ کہ اس شمیم جانفزا کو کس چیز سے منسوب کیا جائے۔ لہٰذا یہ بات زبان زد خاص و عام ہو کر قدسی حقیقت کی صورت اختیار کر گئی کہ حضرت شیخ التفسیر مرحوم کی لحد پاک رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ بن چکی ہے۔ جس طرح آپ کی زندگی آيَةٌ مِّنْ آيَاتِ اللهِ تھی۔ اس طرح آپ کی موت بھی صداقت اسلام کا ایک نشان بن گئی اور اب کس کے کان سن سکتے ہیں کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کی تعبیر اور مشارکت معنوی یوں بھی ہو سکتی ہے کہ سیدنا مولانا کی روح پاک کہہ رہی ہوگی۔ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ (پروردگار عالم کا مجھ پر یہ مخصوص احسان و امتنان ہے کہ اس نے میرے وجود کو شیر انوالہ میں بھی طالبانِ حق کے مشامِ جان کو معطر کرنے کے لئے سامانِ فرحت بنایا تھا اور اب بھی میانی صاحب کے مرکز میں سالکان راہ ہدایت کے لئے یقین و اطمینانِ قلبی کی دولت بنایا ہے۔ سیدنا عیسےٰ علیہ السلام کی زبان سے ارشادِ خداوندی سنئے کہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا۔

اب ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں حضور پُرنور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء خیر کے کمالات و صفات اور حیات و ممات کے حالات بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کے لگ بھگ ہوں گے۔ تو اب ظاہر ہے کہ امتِ مرحومہ کے علمائے ربانی جو کہ ولایت کبریٰ کے منصبِ جلیلہ پر فیض المرام ہوتے ہیں من جانب اللہ ان سعادتوں اور رحمتوں سے نوازے جاتے ہیں جو انبیاء سابقین پر رب العزت نے نچھاور فرمائی تھیں۔

دعا ہے کہ خدائے کون و مکان حضرت قدس اللہ سرہ کی روح پاک کو وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ کا مژدہ سنائے اور اس نعمتِ نبویؐ کا سہیم و شریک بنائے۔

حضرتؒ کے معمولات: اس مولفہ پر حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے معمولات کو نہایت اختصار سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کرام کو اس ربانی شخصیت کی علمی زندگی سمجھنے میں آسانی ہو۔ آپ کے منجھلے صاحبزادہ حضرت مولانا قاری عبید اللہ انور صاحب آپ کی بڑی صاحبزادی صاحبہ اور آپ کے نواسہ حافظ عبد الوحید صاحب نے اندرونِ خانہ معمولات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

حضرت کے جانشین مولانا قاری عبید اللہ انور صاحب کا بیان: "ہم نے اپنی والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا سے متعدد دفعہ سنا تھا کہ جب ہم ابھی بچے ہی تھے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ بازار سے سودا سلف خرید کر لایا کرتے تھے والدہ محترمہ کے بیمار ہونے کی صورت میں اپنے ہاتھوں سے آٹا گوندھنے، سالن تیار کرنے اور بیمار کے خاص کھانے کی تیاری بھی خود ہی فرماتے تھے ساری زندگی گھر میں کوئی خادم

(۱۱) حقوق اللہ اور حقوق العباد پر قرآنِ مجید سے بہتر کوئی کتاب نہیں بولتی ہے۔

(۱۲) تم کو مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر قرآن مجید سننے میں عار آتی ہے۔ تو تمہاری کوٹھیوں میں چل کر جانا ہمارے جوتے کی بھی توہین ہے۔

(۱۳) جو تم سے رواج مانگے وہ تم کو حق بات نہیں کہہ سکتا۔ تم کہتے ہو ملّا بے ایمان! تم نے انگریزوں کے سامنے اپنی لڑکیاں پیش کیں۔ تمہارا منہ کالا، چکلے تمہارے دم سے آباد، سینماؤں میں تمہارا اتفاق، وہاں وہابی، سنی اور شیعہ تمام متفق، وہاں تم بیویاں اور بیٹیاں لے کر جاتے ہو، یا مولوی جاتے ہیں؟ اگر مولوی سوکھے ٹکڑے کھا کر قرآن کو سینے سے نہ لگاتا تو ہندوستان میں اسلام ختم ہو جاتا، سرکاری سکول کا پرائمری پاس ملازم ہو جاتا تھا۔ مگر علمائے کرام دیوبند اور سہارن پور سے فارغ التحصیل ہو کر آتے تو ان کو دفاتر میں کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ تمام علوم متداولہ کے فارغ ملّا ملونٹے اور کالج میں عربی کے چند لفظ بڑھ کر تم لوگ علامہ بن جاتے ہو۔

(۱۴) جو ہنڈیا میں ہوتا ہے وہی رکابی میں آتا ہے۔ پیٹ میں حرام ہو تو نیک عمل نہیں ہوتا۔

(۱۵) عالم دین ہو، حافظ قرآن ہو، حج بھی کر آیا ہو، زکوٰۃ کی پائی پائی ادا کرے اور مر جائے اور ضعیف والدین ہاتھ اٹھا کر بددعا کریں۔ کہ الٰہی ہم تو اس پر راضی نہیں ہیں۔ تو اس پر جنت کے آٹھوں دروازے بند اور اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔

(۱۶) جن لوگوں نے لارڈ کارنوالس کے عہد میں قرآن مجید کی بجائے رواج پر عمل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ میں فتویٰ دیتا ہوں کہ وہ لوگ کافر ہیں۔ اور اگر وہ بغیر توبہ کے مرے ہیں۔ تو ان کی قبریں جہنم کا گڑھا بنی ہوئی ہیں اگر دیکھنا چاہو تو فسٹ کلاس کا کرایہ خرچ کرو اور ہندوستان سے ایسے بزرگ لاؤ جو قبر پر کھڑے ہو کر تم کو بتا دیں کہ یہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت اندھی ہے قرآن مجید کے پورے ڈیڑھ صفحے کا انکار ہے حالانکہ ایک لفظ کا انکار بھی کفر ہے۔

(۱۷) تم ایک دانہ زائد نہیں کھا کر مرو گے اور نہ ہی ایک دانہ چھوڑ کر مرو گے۔ رات دن روٹی روٹی کی پکار ہے۔

(۱۸) میں نے اپنے تینوں بیٹوں کو تین وصیتیں کیں:

(ا) کیمیاگری میں مبتلا نہ ہونا۔

(ب) عملیات کے پیچھے نہ پڑنا، اور

(ج) کسی کی ضمانت نہ دینا۔

کیونکہ خواہ مخواہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے اور اس طرح سے دین کی خدمت میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔

(۱۹) آج کل مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ اور معاملات میں بددیانتی کی شکایت کرتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ آج کا مسلمان وہ ہے جو لے کر نہ دے۔ اگر لے کر دے دے تو صورت و سیرت سے اس کو مسلمان سمجھئے۔ مجھ سے اکثر لوگوں نے کم و بیش رقم مستعار لی۔ اور لینے کے موقعہ پر کہتے رہے کہ جاتے ہی بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں گے۔ مگر آج تک شاید ہی کسی نے کچھ واپس کیا ہے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ مجھ کو ملنے والے یہی علماء و طلباء ہی میری برادری ہے۔ میرے پاس شرابی اور رکابی تو آنے سے رہے۔

جب میں ان کی جگہوں میں اتفاق سے جاتا ہوں. وہ لوگ مجھ کو ملتے بھی ہیں لیکن دیتے کچھ نہیں۔ اور میں بھی شرم کی وجہ سے نہیں مانگتا۔

(۲۰) میں ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ میری کوئی نماز قضا نہ کرے اور صبح کا درس قرآن مجید کبھی نہ چھوٹے۔ اللہ تعالےٰ مجھ کو چلتا پھرتا لے جائے۔ اپنے فضل سے سوء الکبر سے بچائے۔ مجھ کو چارپائی پر نہ لٹائے تاکہ میرے لئے اور میرے تیمارداروں کے لئے تکلیف کا باعث بنے۔ صبح کی نماز پڑھ کر درس قرآن مجید کے بعد اللہ تعالےٰ مجھ کو دنیا سے اٹھالے لوگ مجھ کو دیہات سے جب میں پہنچا کر ظہر کی نماز واپس آکر باجماعت پڑھیں۔

(۲۱) آخری دنوں میں کبھی کبھی آواز سے فرمایا کرتے تھے اے اللہ! میں تجھ سے راضی ہوں تو جب چاہے مجھ کو بلالے۔

حضرت مولانا محمد **شعیب** صاحب جو آپ کے ممتاز خلفاء میں سے ہیں۔ انہوں نے حضرت کے چند **ملفوظات** نقل کروائے ہیں۔

(۱) میرا اپنا سلسلہ قادری ہے مگر میں سلاسل اربعہ کے بزرگوں کا ادب کرتا ہوں۔

(۲) حضرت مدنی مرحوم میرے شیخ نہیں ہیں لیکن میں اپنے مشائخ کی طرح ان کا ادب کرتا ہوں۔

(۳) طالب تین تاروں کے ساتھ اپنے شیخ سے کنکشن پیدا کرے تو کامیاب ہوتا ہے۔ عقیدت، ادب اور اطاعت۔

(۴) لوگ کہتے ہیں۔ بینا سارے اندھا کوئی کوئی۔ میں کہتا ہوں۔ اندھے سارے بینا کوئی کوئی۔

(۵) مجھے جو موتی اپنے حضرات سے ملے ہیں وہ اتنے قیمتی ہیں۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ دنیا کے تمام خزانے میرے ہاتھ پر رکھ کر فرمائے کہ یہ تمام خزانے لے لو اور ایک موتی دے دو تو میں یہی عرض کروں گا کہ اے اللہ! مجھ کو دنیا کے خزانوں کی طلب نہیں جو کو ان کی طلب ہے یہ ان کو دے دے اور میرے پاس یہ موتی رہنے دے۔

(۶) نعم الامیر علی باب الفقراء۔ وبئس الفقیر علی باب الامرا۔

(۷) اطلبوا الاستقامة ولا تطلبوا الکرامة فان الاستقامة فوق الکرامة۔

(۸) اگر کوئی ہوا میں اڑتا آئے اور لاکھوں مرید پیچھے لائے مگر سنتِ نبوی کا مخالف ہو تو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی حرام، اس کی بیعت کرنا حرام اور اگر کوئی کر چکا ہو تو توڑنا فرض عین ہے۔

(۹) دل کتنا ہی سخت ہو ذکر الٰہی کی متواتر ضربوں سے نرم ہو جاتا ہے۔ جس طرح سخت پتھر میں پانی کے ٹپکنے سے نشیب پڑ جاتا ہے۔

جماعت اسلامی

شیخ التفسیرؒ کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ بلاخوف —— ہر جگہ اور ہر ایک کے متعلق صاف اور واضح بات کہتے تھے۔ ان کے کسی عمل میں ابہام یا اینچ پینچ نہیں ہوتا تھا۔ دو اور دو چار کی طرح ان کی پالیسی واضح اور متعین رہی۔ اگر کسی کی حمایت کو انہوں نے ضروری سمجھا تو بغیر اس بات کا خیال کئے کہ اپنے کیا کہیں گے اور بیگانے کیا۔ حمایت کی اور اسی طرح ان کی خداداد بصیرت نے اگر سمجھا کہ فلاں کی مخالفت اور اس سے اختلاف شرعاً ضروری ہے تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا اور بے جھجک بلا ٹوک بات کہی۔ علامہ مشرقی کے افکار و نظریات سے انہیں اختلاف تھا بر ملا کیا۔ لیکن جب سکندر کی وزارت نے خاکساروں پر ظلم کیا تو

آپ نے خاکساروں کی کھل کر حمایت کی اور کہا کہ ملک کے شہریوں پر بیجا ظلم کیوں؟ اسی طرح جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی کو حکومت نے بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا تو حضرت مولانا نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ لیکن جب امیر جماعت کے قلم کی گستاخیاں اسقدر بڑھ گئیں کہ اس کی زد میں علماء و صلحاء سے لے کر صحابہ کرامؓ اور انبیائے علیہم السلام بھی آنے لگے تو آپ نے اس کے خلاف بھی جہاد کیا اور مسلسل کیا۔ شیخ التفسیر جب اپنی بصیرت و فراست کی بناء پر مودودی صاحب کی مخالفت کر رہے تھے۔ تو بہت سے علماء ان کے اس فعل کو تعجب اور حیرانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج جب یہ سطور سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے تمام جید علماء مودودی صاحب کی مخالفت میں ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ جب شیخ التفسیرؒ نے مخالفت کی ہے تو مودودی صاحب پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آئے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان سے پردہ اٹھتا چلا گیا۔ اور آج ان کے پورے خدوخال سامنے ہیں۔ جماعت کے بیشتر اولین ممتاز ساتھی جدا ہو چکے ہیں۔ اور وہ مودودی صاحب کی مخالفت میں شیخ التفسیر سے بھی آگے ہیں۔ اب بالکل آخر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحب زادے مولانا تقی عثمانی بھی مجبور ہو گئے کہ مودودی صاحب سے کھل کر اختلاف کریں۔ چنانچہ مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کی رد میں اپنے ماہ نامہ "البلاغ" میں مسلسل مضمون لکھ رہے ہیں جس کی چار قسطیں چھپ چکی ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ ؎

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

علمائے حق کے مودودی صاحب سے ناراضگی اور مخالفت کے کیا اسباب ہیں۔ اس کی تفصیل کا پتہ کرنا ہو تو اس سلسلے کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ہمیں تو یہاں یہ بتانا اور عرض کرنا مقصود تھا کہ شیخ التفسیرؒ نے ملک میں ہر برائی اور گمراہی کے خلاف آواز اٹھائی اور اسی سلسلے کی ایک کڑی امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ سے اختلاف ہے۔ حضرت شیخ التفسیرؒ کی اس مخالفت میں کوئی ذاتی غرض یا مفاد شامل نہ تھا بلکہ عالم ربانی اور رہبر امت ہونے کی حیثیت سے ان پر جو فرض عائد ہوتا تھا۔ اس کی ادائیگی کے لیے انہوں نے یہ سب کچھ کیا۔

علمی کمالات

حضرت شیخ التفسیرؒ نے بھرپور علمی زندگی گذاری۔ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ بیکار ضائع نہیں ہوا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آپ کی پوری زندگی اللہ کی یاد میں گذری اور کوئی سانس غفلت میں نہیں گذرا تو بے جا نہیں ہوگا۔ آپ درسی۔ تدریسی۔ سیاسی اور تبلیغی مصروفیت کے باوجود تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہتے تھے۔

ترجمہ قرآن پاک

آپ کا اس سلسلہ میں سب سے بڑا کارنامہ قرآن پاک کا سلیس و رواں دواں ترجمہ ہے۔ اور حاشیہ پر آپ نے ربط آیات و سور اور قرآن پاک کے مضامین کا خلاصہ اردو زبان میں تحریر فرمایا ہے اور یہ اپنی نوعیت کی منفردانہ خدمت ہے جو اردو میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ سے لی۔ آپ کا یہ مترجم و محشیٰ قرآن پاک انجمن خدام الدین نے شائع کیا اور اس کا ہدیہ اتنا تھوڑا رکھا ہے کہ ہر کوئی اس کو خرید سکتا ہے اب تک ہزارہا کی تعداد میں یہ قرآن پاک چھپ کر ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچ چکا ہے۔

مجموعہ رسائل

آپ کے چھوٹے چھوٹے رسائل جن کی تعداد چونتیس ۳۴ تک پہنچتی ہے لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر انجمن کی طرف سے مفت تقسیم ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اگر ان کو کوئی قیمتاً خریدنا چاہے تو ان کی

پڑھتے اور ہمیشہ باجماعت نماز پڑھتے۔

شادی غم میں اتباع سنت

حضرت شیخ التفسیرؒ کی پوری زندگی اتباع سنت میں بسر ہوئی۔ آپ نشست برخاست سونے جاگنے کھانے پینے۔ لباس وغیرہ ہر جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن کا اتباع کرتے۔ ساری عمر کھدر پہنا اور اسی کی لوگوں کو تلقین کی۔ سینکڑوں بڑے بڑے آفیسرز۔ تجار۔ رؤسا آپ کے حلقۂ ارادت میں آئے ان کی زندگی کی کایا پلٹ ہو گئی اور وہ اپنے ہاں شادی بیاہ وغیرہ میں سادگی کے خوگر ہو گئے۔ خود حضرت مولانا کی زندگی اسی بارے میں نمونہ کی زندگی تھی۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "نکاح میں چار چیزوں کا خیال رکھا جاتا ہے (۱) مال (۲) حسب (۳) ذاتی کمال و جمال (۴) دین" ——— پھر فرمایا تم دین کو پسند کرو۔ ہر چند اس حدیث کے ظاہری الفاظ میں عورتوں کی طرف اشارہ ہے۔ کہ عورتیں ان کمالات اربعہ میں سے کسی وجہ سے پسند کی جاتی ہیں مگر مردوں کو پسند کرنے کا بھی یہی معیار ہے ———

حضرت شیخ التفسیرؒ نے دین کو معیار بنا کر اپنی اولاد کا نکاح کیا۔ خود برائے تعلیم یہ واقعہ کئی دفعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ "جب میری بڑی لڑکی سن بلوغ کو پہنچ گئی تو میرے پاس علماء کرام کی ایک جماعت دورۂ تفسیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ جب وہ جماعت فارغ ہونے لگی تو میں نے ایک مولوی صاحب کو علیحدہ لیجا کر پوچھا کہ کیا آپ شادی کریں گے؟ انہوں نے کہا کہ پردیس میں مجھے کون رشتہ دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ میری لڑکی ہے اگر آپ راضی ہیں تو ابھی نکاح کر دیتے ہیں ورنہ اس کی تشہیر نہ کرنا۔ مولوی صاحب راضی ہو گئے اختتامی جلسہ ہوا کامیاب علماء کو سندیں دی گئیں اور مولوی نور اللہ صاحب کو سند دے کر میں نے اپنی بیٹی کا ان سے نکاح کر دیا کئی سال ہو گئے ہیں مجھ کو اب تک معلوم نہیں ہے کہ مولوی نور اللہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں"

دوسری دفعہ ایک اختر مرحومہ کے نکاح کا واقعہ یہ ہے کہ ——— مولانا عبد المجید مرحوم سوہدروی (مسلکاً اہلحدیث) بیعت ہونے کے لیے آئے تو بوجہ پہلی بیوی کی فوتیدگی کے انہوں نے نکاح ثانی کی ضرورت ظاہر کی۔ شیخ التفسیرؒ نے فرمایا۔ ایک لڑکی ترجمہ قرآن اور فلاں فلاں کتاب پڑھی ہوئی ہے وہ یہ سن کر بولے کہ سکول کی پڑھی ہوئی منظور نہیں ہے مولانا نے فرمایا کہ اپنے گھر میں والدہ سے یہ سب کچھ پڑھا ہے انہوں نے کہا کہ ہم کسی بی بی کو دیکھنے کے لیے بھیجیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میری لڑکی ہے کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے اگر آپ کو قبول ہے تو ابھی نکاح کر دیتے ہیں ورنہ شہرت نہ کرنا۔ وہ یہ بات سن کر راضی ہو گئے اور کچھ مہلت لی پھر آئے اور نکاح ہو کر رخصتی ہو گئی۔

مولانا عبید اللہ انور جو آپ کے جانشین ہیں۔ ان کا نکاح ان کے ماموں ڈاکٹر عبد القوی لقمان کے گھر ہوا جو لاہور میں بڑی عزت و شہرت کے مالک ہیں۔ انہوں نے برات پر سو آدمی طلب کیے۔ مگر ادھر سے باپ۔ بیٹا اور مولانا عبد المجید صاحب تین نفر گئے اور نکاح ہو گیا۔ البتہ گھر آ کر دعوت ولیمہ کیا جس میں اعزہ و اقربا تمام مدعو تھے یہی طریقہ سنت نبویؐ کے مطابق ہے۔

غمی کے وقعہ پر بھی یہی اتباع سنت ہے۔ آپ کے بچے بھی فوت ہوئے اور بچیاں بھی۔ رات کو بچی فوت ہوئی کسی کو چنداں اطلاع نہیں دی گئی صبح نماز فجر کے بعد حسب معمول درس قرآن دینے کے بعد فرمایا کہ میری لڑکی رقیہ فوت ہو گئی ہے اب اس کا جنازہ اٹھایا جائیگا۔ آپ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت مولانا عبید اللہ انور کو وصیت فرمائی تھی کہ صبح کا درس کسی حالت میں قضا نہ ہو اللہ آپ

بیگم محمودہ لغاری نے مولینا عبیداللہ انور کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا واقعہ خود سنایا کہ ان کے پیٹ میں (کینسر) پھوڑا تھا۔
جس سے بہت اذیت اور تشویش تھی۔ ایکسرے لیا گیا اور اگلے دن ہسپتال میں داخلے کا انتظام کیا گیا اگلے دن داخلے کے وقت مجھے خیال
آیا کہ میں خطرناک بیماری میں مبتلا ہوں اپریشن ہوگا ——————— حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قدمبوسی کے بعد ہسپتال کا راہ
لوں حضرت دعا فرمائیں گے اللہ تعالیٰ جلد صحت دیں گے یہ خیال کرکے میں حضرت کے ولایت کدہ پر حاضر ہوئی۔ حضرت نے
پدرانہ شفقت اور مربیانہ التفات سے میری گذارش سنی بعد میں میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے
بیماری بھی اسی کے ہاتھ میں ہے شفا بھی اسی کی جانب سے ہے۔ بہرحال جب میں بادل نخواستہ حضرت سے رخصت ہوئی تو مجھ کو یقین ہو چکا تھا کہ
میں تندرست ہو چکی ہوں میں نے گھر آکر اعلان کر دیا کہ علاج نہیں کراؤں گی چنانچہ میں ہسپتال نہ گئی شام کو ڈاکٹر صاحب آئے میں نے اس کو اپنے
ارادے سے آگاہ کیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا اور کہا کہ علاج اندنوں بہتر ہے ورنہ مرض بڑھ جائے گا۔ فیصلہ ہوا کہ ایکسرے کرایا جائے۔ ایکسرے کرایا
گیا تو بفضلہٖ تعالیٰ پھوڑے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اور میں پہلے ہی دن سے تندرست ہو چکی تھی۔

ایک دفعہ ایام حج میں شدت تمازت سے منیٰ میں بہت لوگ مر گئے مولانا حافظ حبیب اللہ (شیخ التفسیر کے بڑے لڑکے) کے متعلق
ان کی والدہ کو تشویش ہوئی۔ حضرت تسلی دیتے انجام کار بذریعہ تار پتہ کرنیکا فیصلہ ہوا حضرت نے اللہ کی رحمت سے بچشم باطن دیکھا اور فرمایا کہ حافظ
صاحب بالکل صحیح سالم ہیں گھر میں جا کر بیگم کو تسلی دی۔ دو دن کے بعد تار کا جواب آگیا۔ تو حافظ صاحب بخیر و عافیت تھے۔

خواجہ نذیر احمد کا بیان ہے کہ ان کی لڑکی ماسکو میں تھی۔ اس کی خیریت کی اطلاع میں دیر ہو گئی ہم کو بڑی تشویش تھی حضرت کی خدمت
اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا تو آپ نے فرمایا بفضل تعالیٰ بخیریت ہے خط بھی آجائے گا۔ بعد ازاں میری پریشانی دیکھ کر مزید فرمایا کہ لڑکی بالکل
تندرست ہے چارپائی پر آرام کر رہی ہے اور فون اس کی فلاں سمت پر ہے۔ حضرت کے ارشاد کے مطابق دو تین دن کے بعد خیریت نامہ
آگیا۔ اور دوسرا واقعہ بھی تحقیق کرلے پر حرف بحرف صحیح نکلا۔

مولوی احمد دین صاحب ڈوگر (موضع میاں علی) شیخوپورہ کہتے ہیں کہ ایک نوجوان حضرت کی خدمت میں آیا اور بیعت کی درخواست
کی آپ نے فرمایا ابھی کچھ اور سوچ لو پھر کئی دن کے بعد آیا آپ نے پھر لوٹا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا عزیز! تمہارا دل تو مانتا
نہیں۔ تم کس مجبوری پر میری بیعت ہونا چاہتے ہو۔ یہ سن کر اس نوجوان نے کہا کہ جہاں میں شادی کرانا چاہتا ہوں وہ سب آپ کے مرید ہیں ان کی
یہ شرط ہے کہ میں آپ سے بیعت ہو جاؤں۔ تو رشتہ ملیگا۔ پہلے واقعی مجھے آپ سے عقیدت نہ تھی مجبوراً آتا تھا مگر اب دل کی کایا بدل گئی ہے سچے دل سے تائب
ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے ہاتھ بڑھا دیا فرمایا واقعی اب ٹھیک ہے۔

اس طرح کے سینکڑوں واقعات کشف و کرامت کے اور ہیں۔ جو حضرت کے مکمل سوانح کی کتابوں اور احباب سے مل سکتے ہیں۔ یہ چیزیں
کثرت ذکر اللہ اور اتباع سنت کی وجہ سے خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں کسی کو زیادہ کسی کو کم۔ لیکن جیسا کہ اس کتاب کے دوسرے صفحات پر کئی جگہ لکھا گیا۔
کہ یہ چیزیں مطلوب و محبوب نہیں ہیں۔ اور ہمارے سلسلہ کے بزرگوں میں ان چیزوں کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

سراپا و حلیہ

کشادہ پیشانی پر سیمابی انوار کی جھلکیں (من اثر السجود) نازک بھویں۔ خوبصورت آنکھوں میں عارفانہ چمک مناسب
بینی۔ مردانہ پر وجاہت رخسار۔ سپید گندمی رنگت۔ لب مبارک موزوں۔ دندان مبارک آبدار۔ ریش مبارک دراز
اور سفید، عام ... کیفیت نضرۃ النعیم کا پتہ دیتی تھی۔ گردن متوسط۔ شانے کشادہ چھاتی مبارک پر بالوں کی لکیر۔ بازو اور کلائیاں لپڑانہ
سالی میں قدرے کمزور۔ ہتھیلیاں اور انگلیاں نہایت نرم و نازک۔ پاؤں مبارک قد و قامت کے عین مطابق سر مبارک موزوں۔

مخدوم الملّت حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء ○ ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۱ء

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ نے اس دارِ فانی میں ۸۳ برس قیام فرمائے رکھا اور یکم جون ۱۹۶۱ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ بروز جمعرات ساڑھے بارہ بجے دوپہر محبوب حقیقی کے بلاوے پر دار البقاء کو انتقال فرما گئے۔ ہمارے یہاں تاریخ پیدائش کے بارے میں چنداں اہتمام نہیں کیا جاتا البتہ جب کوئی بڑی عظیم شخصیت اس دنیا سے کوچ کرتی ہے تو سوانح نگاری کے سلسلہ میں تاریخ پیدائش مہیا نہ ہو سکنے پر حسرت سی رہ جاتی ہے کہ کاش تاریخ پیدائش کا پتہ چل جاتا۔ سری حساب سے ظاہر ہے کہ آپ ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے اس سے ایک سال قبل ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ کے قیصرہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا گویا کہ انگریز کی سامراجی سیادت کا جوا جو اہل ہند کی گردن پر اور بھی زیادہ مضبوطی سے کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ جب کہ انگریزی حکومت اور عیسائی تہذیب کی آمد آمد اور اس کے روز افزوں کے استیلاء سے دین کا شیرازہ بکھرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ دینی مدارس کے لئے ایسے پر فتن دور میں علوم اسلامیہ اور قرآن و حدیث کی صحیح تعلیمات کو محفوظ رکھنا کوئی آسان کام نہ رہا تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیوبند کی بنیاد پڑ چکی تھی اور شاہ ولی اللہی دعوت کا کام اس پر آشوب دور میں جاری ہو چکا تھا۔ یہ ہے اس دور کی دھندلی سی تصویر۔

حضرت مفتی صاحبؒ غلام انگ کے قصبہ واہ کے قریبی گاؤں موضع مل پور میں پیدا ہوئے مشہور تاریخی مقام حسن ابدال سے آپ کا گاؤں کوئی سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ جس وادی میں یہ گاؤں واقع ہے اس کو دریائے ہرو کی وادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس پر فضا وادی نے کئی تہذیبیں دیکھی ہیں جن کا ریکارڈ پاس ہی کے آثارِ قدیمہ کے عجائب خانہ واقعہ ٹیکسلا میں محفوظ ہے۔ شمالی ہند میں بدھ تہذیب کا یہ وادی سب سے بڑا مرکز تھی۔ اور قبل مسیح میں روحانی قسم کے لوگ اس پر فضا وادی میں اپنے چلے کاٹا کرتے تھے۔ سکندر اور پورس کا آمنا سامنا بھی اس وادی میں ہوا تھا گویا کہ یہ علاقہ ہزارہا قسم کی اہم رومانی و روحانی روایات کا حامل ہے اور رب العزت کی بارگاہ میں یہی منظور ہوا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اسی وادی کی مٹی کے خمیر سے قالب عطا فرمایا جائے۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا اللہ داد صاحب مرحوم بھی اپنے وقت کے ایک معروف محدث خادم دین اور اپنے گرد و نواح میں ایک معزز ہستی اور جانی پہچانی شخصیت تھے۔ اور خاندان کے بیشتر اجداد و افراد بھی دین ہی سے خصوصی شغف رکھنے والے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں پائی۔ قرآن پاک اور ابتدائی فارسی تعلیم موضع سنگ جانی ضلع راولپنڈی میں قاضی محمد نور صاحب سے پائی۔ عربی صرف نحو قاضی گوہر دین موضع کھوڑی ضلع اٹک سے اور کمند شریف ضلع اٹک کے عربی مدرسہ سے اور علوم عقلیہ یعنی منطق اور فلسفہ کی تعلیم اپنے زمانہ کے ایک بے بدل عالم مولانا محمد معصوم سے ڈھینڈہ ضلع ہزارہ میں پائی۔ جب مولانا محمد معصوم امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں مدرس مقرر ہوتے تو حضرت مفتی صاحب کو بھی وہاں ہی بلا لیا۔ یہاں پر آپ نے بقیہ علوم مثل تفسیر، حدیث، فقہ و فلسفہ وغیرہ کی پوری تکمیل فرمائی۔ اور دورۂ حدیث کیا

ہی رونق رہتی تھی۔ زائرین کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ملک کے مختلف اور دور دراز گوشوں سے لوگ پروانہ وار آرہے تھے۔ اور یہاں پر "دربارِ اشرفیہ" کا وہی نمونہ جو جامعہ اشرفیہ لاہور کی بالائی منزل پر دیکھنے میں آتا، وہ سیالکوٹ میں آپ کی عارضی جائے رہائش پر بھی نظر آرہا ہے۔ اور حضرت ہیں کہ باوجود اپنی تمام بدنی کمزوری کے دین کے اسرار و رموز پر کلام فرمائے جارہے ہیں۔ بعض اوقات تو آپ کا کلام بہ صورت اختیار کر جاتا کہ گویا آپ تداخل فی البرزخ کے ماتحت کلام فرمائے چلے جاتے ہیں۔ عجیب و غریب نکات ہوتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ لیکن ایک بات جو حضرت میں تھی۔ اور حضرت اس کا اظہار قصداً نہ ہونے دیتے تھے وہ خرق عادت چیزوں کا صدور اور آپ کا تداخل برزخ اور کشف قلوب تھے۔ لیکن بعض لوگ بعض باتوں میں خاص ذہن رسا بھی تو رکھتے ہیں۔ بعض زیرک طبع احباب اس بات کو بھانپ ضرور جاتے تھے ایک دفعہ سیالکوٹ کی مجالس کا ذکر جو آیا تو حضرت کی زبانِ مبارک سے بے ساختہ نکل گیا کہ "وہاں بڑی بڑی ہستیاں بستی ہیں" ایک مائی صاحبہ آئی تھیں اور میری پشت پیچھے بیٹھی رہتیں۔ وہ اللہ رب العزت کے عشق میں ایسے جل رہی تھیں۔ کہ جتنی مدت بیٹھی رہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرے پیچھے کوئی تپتا ہوا تنور ہے۔ جس کی حرارت اس جاڑے میں پشت اور قلب کو گرما رہی ہے۔ اس قسم کی حرارت کا احساس ہر ایک کو تھوڑا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کے ادراک کے لئے تو حضرتؒ ہی کی ذات تھی۔ اس مجلس میں کئی اور لوگ بھی تو تھے۔ مگر کسی کو کیا معلوم ہو سکتا تھا، یہ موقع نہیں ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ایسے واقعات کو بیان کیا جاوے۔ صاحب تذکرہ حسن اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ایسے اور بھی کئی واقعات کا اضافہ فرما رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ حضرت سنت کے ساتھ شدت کا تمسک رکھنے کے باعث یہ گوارا نہیں فرماتے تھے خرقِ عادات امور بیچ میں آحائل ہوں۔ اور پھر دین میں انہی کے باعث کوئی بدعات کا سلسلہ چل نکلے۔ یہ اہتمام تھا مقتضیات شریعت کے قیام کا اور اپنی ذات کی نفی کرتے رہنے کا:

جامعہ اشرفیہ واقعہ مولچند بلڈنگ کی جگہ کفایت نہ کرتی تھی۔ اور حضرتؒ کی خواہش تھی۔ کہ کہیں باہر کھلی جگہ میں مدرسہ کے لئے کوئی کشادہ عمارت مہیا ہو جائے۔ اللہ رب العزت جیسے اپنے خصوصی بندوں کی دعاؤں کو نہیں لوٹاتے۔ ایسے ہی ان کی تمناؤں کو بھی قبول فرماتے رہتے ہیں تمنا کا پیدا ہونا تھا کہ اسباب کا حرکت میں آنا بھی ظاہر ہو گیا۔ حضرتؒ نے سو کنال یعنی ساڑھے بارہ ۱۲½ ایکڑ زمین کے حصول کا قصد فرمایا سودا ہو گیا۔ سوا لاکھ روپیہ کی ادائیگی کا سوال پیدا ہوا۔ جگہ بہت نفیس اور حسب پسند تھی۔ لیکن جامعہ اشرفیہ کے فنڈ میں چند ایک ہزار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور حضرت دعا فرما رہے تھے۔ مالک زمین نے صرف ایک ماہ کی مہلت دی ہے۔ حضرت کے مخلص خادم الحاج محمد شفیع صاحب مرحوم آپہنچے۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد فرمانے لگے کہ اچھا مہینہ کی فلاں تاریخ تک جتنا روپیہ جمع ہو جائے۔ اس میں باقیماندہ رقم کی کمی میں پوری کردوں گا۔ ایک ہی ہفتہ کے اندر اللہ رب العزت نے نوے ہزار کا بندوبست کر وا دیا۔ باقی رقم حاجی صاحب مذکور نے ادا فرما دی۔ اور مدرسہ کے لئے زمین عطا فرما دی گئی۔ پھر سب سے پہلے داعیہ یہ ہوا کہ جامعہ اشرفیہ کی عمارت سے پہلے مسجد کی تعمیر کا کام ہاتھ میں لے لیا جائے۔ مسجد کے لئے اتنے بڑے رقبہ میں سے موزوں جگہ تلاش کرنا بھی ایک مرحلہ تھا۔ حضرت ہی کے ایک مخلص کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور حضورؐ نے خواب میں مسجد کی جگہ متعین

فرمادی۔ ایسا ہی واقعہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو پیش آیا تھا۔ جب اس امر کا تردد ہو رہا تھا کہ دیوبند میں دارالعلوم کے قیام کے لئے کونسی جگہ تجویز کی جائے۔ اور ایسے مبارک واقعات ہمیشہ اللہ رب العزت کی تائید خاص ہی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ مورخہ ۱۴ شعبان ۱۳۰۴ھ کو بروز جمعہ بعد از نماز عصر حضرت کے خلوص کی برکت سے سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔ وہ مبارک اجتماع جو اس موقعہ پر دیکھنے میں آیا۔ اللہ رب العزت کی رحمت کا خاص نشان تھا۔ پاک و ہند کے سبھی اکابر اس میں جمع تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ اپنے زمانہ کے اولیاء اللہ میں سے ایک سب سے بڑا برقی مقناطیس ہیں جو جس وقت چاہیں تمام اولیاء اللہ کو اپنے پاس جمع فرما لیں۔ اس کی نظیر اپنے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے اور کہیں نہیں دیکھی گئی۔

جامعہ اشرفیہ کی نئی عمارت صرف بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھی کہ کہیں صرف ہاتھ لگا دو دیکھو کہ ہم غیاب سے حضور میں کیسے متمثل ہوتی ہیں۔ آٹھ دس لاکھ روپیہ کی رقم کا خرچہ کوئی معمولی خرچہ نہیں تھا۔ توکلاً علی اللہ کام شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے سلسلہ کہیں سے کہیں چلا گیا۔ حضرت کی بڑی خواہش ان جدید عمارت میں جامعہ اشرفیہ کا سالانہ اجلاس منعقد فرمانے کی تھی چنانچہ پھر حضرت نے اپنی حیات مبارکہ کے دوران ہی پانچ سالانہ اجلاس منعقد ہوتے ملاحظہ فرماتے۔

امرتسر میں رہے تو جامعہ نعمانیہ کا قیام فرمایا اور عمارات تعمیر فرمائیں۔ پھر لاہور میں ورود فرمایا تو یہاں بھی جدید اشرفیہ کی [illegible]ت کا وہ سلسلہ قائم فرمایا کہ تقسیم ہند کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ہند میں چلے جانے کی کمی کو پورا فرما کر حضرت نانوتوی [illegible]ح کو تسکین کا سامان پوری طرح مہیا فرما دیا۔ یہ سلسلہ عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیان سے نہیں اور پتہ چلتا ہے۔ کہ اللہ والوں کی زندگی کن مہماتِ امور میں کھپتی رہتی ہے۔ اور مردار دنیا کے طلبگار اپنی خواہشات کے اعتبار سے اپنے آپ کو کتنا زبوں بنائے رکھتے ہیں

حضرت کے مقام کو بیان کرنا محض ایک صریح جسارت ہوگا۔ ایک شخص پہاڑ میں کھڑے کھڑے دوسرے شخص کے [illegible]رے میں جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا مختلف النوع کیفیات سے لطف اندوز ہو رہا ہو دوسروں کو کیا تصور دلا سکتا ہے حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد دل حسرت کے آنسو رو کر کہتا ہے کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اس مبارک کام کیلئے تذکرہ نگار حضرات ہی موزوں رہیں گے۔

حضرت کی مجلس کا یہ حال تھا کہ وزیر بھی ہوتے تھے اور گورنر بھی کمشنر بھی اور ڈپٹی کمشنر بھی علماء بھی صوفیاء بھی مگر سب دم بخود ہو کر حضرت کے ارشادات سنتے رہتے تھے۔ اور سر جھومتے رہتے۔ بعض مرتبہ تو آپ کے پیر بھائی جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز بھی تھے مجلس میں حاضر ہوتے۔ حضرت ان پر نگاہ ڈالتے تو کیفیت حال کا غلبہ طاری فرما دیتے اور وہ مدتوں مجلس میں استغراق کی حالت میں باریک سی آواز میں "اوں۔ اوں کرتے رہتے یہ کاملین کا حال تھا۔ ہم ایسوں کے لئے یہ سعادت کہاں تھی۔

گفتگو میں اپنی ذات کی نفی کا یہ حال تھا۔ کہ جب بھی کوئی بات شروع فرماتے۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی طرف منسوب کر کے فرمایا کرتے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ ہے...... اپنی ذات کا ایسا فقدان جیسے آپ کوئی چیز ہی نہیں

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء ○ ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء

خواجہ حسن نظامی
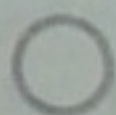
ابُوالکلام آزاد

دہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، سفید چھوٹی ڈاڑھی، آواز سریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی اور ظرافت، دہلی کے رہنے والے ہیں، ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں مگر پیری مریدی کے زیادہ دلدادہ نہیں ہیں، قوم سید، پیشہ آزادی اور بے نیازی، حافظہ کی قوت بے مثال تصور کی حالت چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ نازک مزاجی میں نامانشا سیات دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے۔

بیرونی ہند کے مسلمانوں میں اور امریکنوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور یورپین مورخ سوچتے ہیں کہ ان کو یورپین کیوں کر ثابت کیا جائے۔ اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں تاہم ظاہر داری و نمود کاری سے بیزار ہیں مسلمانوں میں اگر کوئی گاندھی جی ہو سکتے تو ابوالکلام ہوتے بلکہ سر اسٹیفرڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جواب ملے کہ ہندوستان میں گاندھی جی سیاسی درویش ہیں، جواہر لال یورپ کی سیاست کا عکس ہیں کیونکہ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہتے ہیں حالانکہ عقلانے کی سیاست میں یہ گناہ کبیرہ ہے صرف مولانا ابوالکلام آزاد چالیس کروڑ باشندوں میں ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود بھی سمجھتے ہیں اور اس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں اور مسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔ ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر راہ سہروردی کے مکان پر انہوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا سب باتیں منظور ہیں بہ استثنائے شرکت مسلم لیگ" گویا ۳۴ سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آج کل ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک رازدار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعہ کرتے تھے کہ سر کرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔ اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے سوائے ان کے جو ان کی بادشاہی کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھیں۔ بہر حال مولانا آزاد موجودہ ہندوستان کیلئے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں ان کو سیاسی چراغ بھی کہا جا سکتا تھا اگر دوسرے سیاسی چراغ بھی روشن کر سکتے جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی بظاہر سفید ڈاڑھی کے بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل نوجوان ہیں۔

وہی مذاہب عالم کے پرجوش حامیوں، مذہبی مجالس کے زبان دراز مناظروں اور مذہبی بحث و نظر کے بنائے ہوئے نام نہاد علوم میں دسترس رکھنے والوں کا غالب حصہ اسی طریقِ جدل کی پیداوار ہے..... مذاہب کی تعلیم اور پیروان مذاہب کا فہم و عمل دو مختلف چیزیں ہو گئی ہیں۔ ایک چیز نہیں ہیں۔

پنڈت نہرو کی رائے

بقول پنڈت نہرو (ڈسکوری آف انڈیا) مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا انداز تخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے، وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے اور سرسید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبِ خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اس کی دعوت سے ہندوستان کا اسلامی ذہن اس وقت تک بیگانہ تھا۔

مولانا نے قدامت پرستی کے مخالف قومیت کے قلعہ پر حملہ کیا، لیکن بخطِ مستقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کر کے جنہوں نے علی گڑھ کی بنیاد کو ہلا دیا۔

علی گڑھ کی تحریک

مولانا اس وقت علی گڑھ کے مسلک سے کس قدر دور تھے، اس کی ایک مثال اجودھیا میں قربانی گاؤ کا مسئلہ تھا جس پر مولانا نے عام مسلمانوں کے جذبات کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی حتیٰ کہ ان کے دوست حکیم اجمل خاں کو بھی جو اس وقت علی گڑھ کی تحریک کے حامی تھے۔ الہلال کی رائے کے خلاف آواز اٹھانی پڑی۔ ملک کی صحافت میں اس بحث کا لہجہ بہت تیز ہو گیا اور مولانا محمد علی سے بھی مولانا کے نظریات کا غالباً یہ پہلا تصادم تھا

(قاضی عبدالغفار)

مولانا محمد علی سے اختلاف

مولانا محمد علی اکثر مولانا کو ضدی مولوی کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن غور کیجئے تو مولانا کی ضد کے مسلک ہی میں ان کی شخصیت کا اصل استحکام نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا کی انفرادیت میں بھی ایک بہت بڑا فرق تھا۔ مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے ————————— مولانا اس مفہوم اور انداز کی عمومیت سے تقریباً بیگانہ رہے ان کی انفرادیت کے دائرہ میں سب سے نمایاں عنصر عوام کی مقبولیت نہ تھی، بلکہ خود بجائے خود تھی۔ مولانا بسا اوقات اپنے نقاد اور مخالف سے دست و گریباں ہوجانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت ان کی صحافت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مولانا بعض اوقات دوسروں پر اسلئے تنقید یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساسِ کمتری نہیں بلکہ ایک مزدری اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدان جنگ میں اس لیے نہیں کھجاتی کہ اسے برابر کا حریف نظر نہیں آتا۔

(ابو سعید بزمی)

الہلال کی دعوت

اس طرح درحقیقت حضرت مولانا نے الہلال کے ذریعہ مذہب اور اخلاق کے معاملہ میں عقل و دماغ کے بند دروازے کھولے اور ان کی آواز عوام کی زندگی میں گونجی۔ چنانچہ الہلال کی تحریک، دعوت اور اس کے نتائج کے متعلق خود فرماتے ہیں۔ "الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیورو کریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے

گاندھی جی سے ملاقات

ہندوستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں حضرت مولانا کی پہلی ملاقات مہاتما جی سے ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جہاں مسئلہ ترکی وخلافت کے متعلق وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لیے تمام ممتاز ہندو مسلمان لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اس موقعہ پر آنجہانی تلک بھی موجود تھے۔ اور وہی دن تھا جب مولانا اور گاندھی جی کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو گاندھی جی کے آخری دم تک قائم رہا۔

یہ پہلی ملاقات ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اس اجتماع میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کر لیا گیا۔ البتہ وائسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے مولانا نے اختلاف کیا۔ وہ گفت وشنید اور عرض ومعروض کے قدیم طریقوں سے بہت بے زار تھے۔ اور اس لیے اس مجلس میں انہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ کسی وفد کا وائسرائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتہ وہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنہوں نے اس تاریخی اجتماع میں گاندھی جی کے پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ اس وقت دوسرے مسلمان لیڈر جو مولانا کے ہم خیال تھے حکیم اجمل خان مرحوم تھے۔

میرٹھ اور کلکتہ کی کانفرنسوں میں گاندھی جی کا پروگرام مکمل کیا گیا اور ناگپور میں بالآخر کانگریس نے اس پروگرام کی منظوری دیدی۔ اس کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر قومی تاریخ کے جو روح پرور نظارے دیکھے گئے وہ ہماری قومی تاریخ کے لازوال نقوش ہیں۔ اسی تحریک کے دوران میں مولانا کے لیے گرفتاریوں اور سزاؤں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ قلعہ احمد نگر کا دروازہ کھلنے اور آزادی کی پہلی منزل طے ہونے تک جاری رہا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کا دور تحریک خلافت کا دور تھا جو ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام اور امرتسر کے اجلاس کانگرس کے بعد شروع ہوا۔ مولانا کی زندگی کا یہ اس قدر مصروف زمانہ تھا کہ اس سیلاب میں ان کے لیے صبح اور شام کا امتیاز باقی نہ رہا تھا شمال سے جنوب تک سینکڑوں جلسوں اور کانفرنسوں میں انہیں تقریریں کرنی پڑتی تھیں اور ان کے اوقات کا ایک لمحہ نہ تھا جو اس تحریک سے بے تعلق ہو ہر موقعہ پر اور ہر جلسہ میں زندگی اور استقامت کا ایک ہی پیام تھا جو وہ ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دے رہے تھے ان خطبات اور تقریروں کے اگر کم سے کم اقتباسات بھی نقل کیے جائیں تو وہ بجائے خود ایک ضخیم کتاب بن جائے۔

تحریک ترک موالات

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں صوبائی خلافت کانفرنس آگرہ کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے اس تحریک کی ۱۸ ماہ کی روئداد پر ایک نظر ڈالی اور مسلمانوں کو گاندھی جی کے اصول ترک موالات اختیار کرنے کی دعوت دی انہوں نے فرمایا:-

"تحریک خلافت کی بدولت ہندوستان کی آزادی کا سویا ہوا مسئلہ
اس قوت سے جاگ اٹھا کہ آج اس کا غلغلہ دنیا میں بلند ہے۔"

لیکن اب اس جدوجہد کی تیسری اور فیصلہ کن منزل آگئی تھی اور وہ یہ تھی کہ ترک موالات کے اصول کو اختیار کر کے وطن کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ:- "یہ چیز جو ہمارے سامنے آرہی ہے پہلے ہی تیرہ سو سال سے موجود ہے......... اصل میدان ہندوستان کا میدان ہے اصل فتح وشکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا ہے اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان ترک موالات کے میدان بلکہ مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیں تو دنیا کی کون سی طاقت ہے جو آپ کو شکست دے سکے۔

میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں۔ اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اس مبارک اتحاد کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں ——— جو اسلام کے خلاف ہو اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔

"فتنہ و فساد کی ابتدا"

احمد مصطفیٰ صدیقی راہی

حضرت مولانا کی سیاسی زندگی میں متحدہ قومیت کا یہ باب بلاشبہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک شاندار اور روشن باب ہے لیکن حضرت مولانا کے شخصی استقامات کی یہ روشنی اور بھی زیادہ روشن اس تاریک زمانہ میں ہوتی ہے جب ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انگریزی حکومت نے تفرقہ پردازی کا حربہ استعمال کیا اور فرقہ داری فتنہ و فساد کی تاریکی میں بڑے بڑے لیڈروں کے تصورات منتشر ہو گئے اور بڑے بڑے محبان وطن کا لنگر ٹوٹ گیا۔ حضرت مولانا کی شخصی اور معنوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا جتنی کہ وہ آزمائش تھی جس میں حضرت مولانا اس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گذر چکا، وہ تعمیر ایک دفعہ پھر مسمار ہو گئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ داری تعصبات کی آگ روشن کر دی۔ اس آگ میں مہاتما جی، مولانا حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، موتی لال نہرو اور ایسے بہت سے عوامی لیڈر جھونک دیئے گئے۔ حضرت مولانا کے عزم کی بلندی کے امتحان کا یہی وقت تھا۔ بہت سے ملند آہنگ لیڈر رہے جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے لیکن حضرت مولانا خود اپنی قوم کے ہاتھوں جگہ جگہ جو خلاف ہو چلی تھی، وہ سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ ان کے وجود معنوی کو اس قدر مجروح بھی نہ کر سکا جتنے زخم کہ خود ان کی اپنی قوم نے ان کے دل و دماغ پر لگائے مگر انہوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ شکایت کا ایک بھی لفظ زبان پر لائے بغیر گوارا کر لیا۔ یہی حضرت مولانا کی اصل بڑائی ہے۔

سیاست سے کنارہ کشی کا ارادہ

جس وقت حضرت مولانا رانچی سے واپس تشریف لائے تو یہ ارادہ کر کے آئے تھے کہ وہ خالص علمی زندگی بسر کریں گے اور سیاسی ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جائیں گے لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ حضرت مولانا کو پھر اس آگ میں کودنا پڑا۔ حضرت مولانا نے اپنے خاص انداز میں اس وقت کے حالات کے متعلق اپنے قلب کی کیفیات کو واضح فرمایا ہے۔

عین ۱۹۱۹ء کے اواخر عہد میں جب کہ امیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور شور کے ساتھ گزر چکا تھا تو میں رانچی کے گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی دنیائے امید کی تعمیر کا سر و سامان دیکھ رہا تھا۔ گو دنیا نے دروازہ کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے:۔

تفاوت ست میاں شنیدن من و تو!

تو بستن در و من فتح باب می شنوم

۱۹۱۹ء کے رمضان المبارک کا پہلا ہفتہ اور اس کی بیدار و معمور راتیں تھیں جب میں نے ان ہی ہاتھوں سے امیدوں اور ارادوں کے نئے

موجودہ حالت یہ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حالت کب تک جاری رہے گی

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوراج پر اتحاد کو ترجیح

۱۹۲۱ء میں جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا اور آزمائش اور امتحان کا دور شروع ہوا جو بالآخر ۱۹۲۷ء میں ختم ہوا۔ جب حضرت اور گاندھی جی کے رگ و پے میں ایک ناقابلِ بیان نیشنلزم اتر گیا تھا۔ تقریباً ۵ سال تک ان دونوں اور ان کے ساتھ دوسرے لیڈروں کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقل و فہم کی بربادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر روز زلزلے آتے تھے اور متحدہ قومیت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کی دیواروں کو مسمار کر جاتے تھے۔ تاہم امیدوں اور تمناؤں اور مضبوط ارادوں کی ایک ٹوٹی ہوئی محراب کے نیچے ملک کے یہ بلاکش سپاہی بیٹھے رہے اور آزادی کی ایک نئی عمارت کے نقشے بناتے رہے۔

۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں جب بھی کسی موقعہ پر حضرت مولانا نے اپنے ہم وطنوں اور خصوصاً مسلمانوں کو مخاطب کیا تو انہوں نے یاد دلایا کہ اس ملک کی آزادی اور زندگی کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد میں ہے۔

گاندھی جی کی نظر بندی

۱۹۲۲ء میں گاندھی جی پھر محبوس کر دیئے گئے اور ملک میں عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کے تصورات کو فرقہ پرستی کے مفاسد نے بری طرح مجروح کر دیا۔ حتیٰ کہ خود گاندھی جی نے اپنے ہم مذہبوں سے یہ طعنے سنے کہ تم نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دے کر ہندوؤں کے مفاد کا خون کیا ہے۔

کانگریس میں اختلافات

۱۹۲۳ء میں جب ایک دفعہ پھر اپنی زندگی کا کچھ زمانہ قید فرنگ میں گزارنے کے بعد حضرت مولانا باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ خود کانگریس کے اندر بعض اصولی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ گاندھی جی نے قید میں جاتے وقت کانگریس کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی رہی سہی طاقت تعمیری پروگرام کے لیے وقف کر دے۔ ان کے جانے کے بعد مسٹر راجگوپال اچاری، سردار پٹیل، راجندر بابو اور ڈاکٹر انصاری اس امر پر زور دے رہے تھے کہ گاندھی جی کا تعمیری پروگرام جاری رکھا جائے اور کانگریس اپنی تمام قوت کو اس کام میں صرف کرے لیکن پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں ناکام رہ کر اب یہ چاہتی تھی کہ انگریز سے جنگ کرنے کا ایک محاذ دستوری مجالس کے اندر بھی قائم کیا جائے۔ عرفِ عام میں یہ جماعتیں "چینجر" CHANGER اور "نو چینجر" NO CHANGER کہلائیں اور ایک عرصہ تک ان کے اختلافات نے صحافت اور عوامی جلسوں کے محاذ پر ایک ہنگامہ برپا رکھا۔ اس وقت جب حضرت مولانا نے جیل سے باہر آ کر نظریات کے اختلاف کا یہ ہنگامہ برپا دیکھا تو انہوں نے محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش تو رہی ایک طرف اب تو خود کانگریس کے اندرونی اختلافات کو مٹانے کی کوئی تدبیر ضروری ہے۔ حضرت مولانا کے سامنے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ علماء کی جماعت دستوری مجالس میں شرکت کے خلاف ایک امتناعی فتوے دے چکی تھی اور اب اس فتوے کے ہوتے ہوئے "چینجرس" کے پروگرام کی تائید کرنا سخت مشکل تھا۔ دسمبر ۱۹۲۳ء میں حضرت مولانا کے زیرِ صدارت اسی مسئلہ کے طے کرنے کے لیے کانگریس کا ایک خاص اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جب حضرت مولانا پہلی دفعہ کانگریس کی صدارت کے لیے منتخب ہوئے تو ان کی عمر ۳۴ سال سے بھی کم تھی اور اس طرح یہ خیال غلط نہیں کہ ان سے پہلے یا بعد کانگریس کے کسی صدر نے اتنی کم عمر میں یہ قومی اعزاز حاصل نہیں کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ "اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میں کانگریس کا سب سے کم عمر صدر ہوں۔ میری عمر

ستیہ گرہ

جدوجہد اصلاحات کی اسکیم کے مقابلہ میں کانگریس نے ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۳۰ء کی یہ ستیہ گرہ کانگریس کی جدوجہد کا ایک اور نمایاں نشانِ راہ ہے۔ اسی نشانِ راہ سے کامیابی کی طرف پہلا موڑ آیا۔ گو کہ گاندھی جی اور لارڈ ارون کے سمجھوتہ کے بعد بھی لندن کی گول میز کانفرنس کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کانفرنس کا نتیجہ اتنا تو ہوا کہ دنیا کو ایک دفعہ پھر یہ حقیقت یاد آ گئی کہ سیاسی گفت و شنید میں برطانیہ کی نیت نہ کبھی پہلے بخیر تھی اور نہ اب ہے۔ ـــــــــ گاندھی جی بادلِ نخواستہ کانفرنس میں شریک ہوئے اور خالی ہاتھ واپس آئے۔ ہندوستان کے انگریزی حلقوں اور اینگلو انڈین صحافت میں ان کے خالی ہاتھ آنے پر اظہارِ مسرت کیا گیا اور علانیہ جداگانہ حقوق کے حامیوں کی حمایت کر کے اس حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھا دی گئی کہ انگریز فرقہ پرستوں کو آڑ بنا کر آزادی کے مطالبہ سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ انگریز کی حکمتِ عملی سے ہندو مسلم فسادات ہوتے رہے جس کے نتیجہ میں مسلمان مجبور ہوئے کہ وہ ایک علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ کریں۔

نمک ستیہ گرہ

گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہی گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے تمام ملک میں "یومِ آزادی" کے مظاہرے کیے اور ماہ مارچ میں گاندھی جی نے نمک کی ستیہ گرہ کا اعلان کیا۔ اس طرح حکومت کے تشدد کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور ۵ مئی کو گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد لیڈروں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا لیکن سول نافرمانی کی اس تحریک نے تمام ملک میں آگ لگا دی۔ حضرتِ مولانا کی شخصی قیادت نے پھر ایک دفعہ اپنے نفوذ و اثر کا حیرت انگیز ثبوت دیا۔ حتیٰ کہ بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ـــــــــ لاکھوں مسلمانوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۹۰ ہزار اشخاص گرفتار ہوئے اور سینکڑوں مارے گئے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد حضرت مولانا بھی گرفتار ہو گئے۔

مسلم قوم پرستوں کی جماعت

۱۹۳۰ء کی ستیہ گرہ کے شروع ہونے سے پہلے کانگریس کے مسلمان قوم پرست لیڈروں اور کارکنوں نے ایک کوشش یہ بھی کی تھی کہ مسلمان عوام سے قریب تر ربط پیدا کریں۔ ڈاکٹر انصاری اس وقت زندہ تھے۔ ان کے اور حضرت مولانا کے مشورے سے ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے اندر مسلم قوم پرستوں کی ایک جماعت منظم کی گئی۔ حضرت مولانا اس کے صدر رہے اور تصدق احمد خان شروانی سیکرٹری اور ڈاکٹر انصاری ٹریژرر۔ جماعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام حریت پرست اور ترقی پسند جماعتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔

اس پارٹی کی راہ میں ایک مشکل یہ حائل تھی کہ علی برادران اب کانگریس کے میدان سے ہٹ رہے تھے۔ وہ سائمن کمیشن اور نفاذ اصلاحات کے خلاف سول نافرمانی کے مخالف تھے اور ان کی وجہ سے بعض دوسرے مسلمان لیڈر بھی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس وقت بھی مسلمان قوم پرستوں کے سب سے بڑے قائد مولانا ہی تھے جو کانگریس کی تحریک کی پوری پوری تائید کر رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد اور قیام پاکستان کے بعد خصوصاً قوم پرست مسلمانوں کی قوم پرستی کے سب سے بڑے قلعہ دار صرف حضرت مولانا ہی رہ گئے تھے اور ان ہی کی رہنمائی میں ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں نے جو متحدہ قومیت میں عقیدہ رکھتے ہیں اور ہندوستان کو اپنا حقیقی وطن تصور کرتے ہیں۔ ہندو اکثریت کے بعض طبقات کی شدید مخالفت کو انگیز کرتے ہوئے سیکولر نظام حکمرانی کی بنیاد کو مضبوط بنانے کے لیے جس حد تک ممکن ہوا اپنا کام جاری رکھا۔ اس وقت جب کہ ہندو اکثریت کی فرقہ پرستی اور مشترک کلچر و متحدہ قومیت کے مخالف عناصر کی

مرکزی حکومت بنائی جائے۔ لیکن اس کے لئے وائسرائے تیار نہ تھے۔ وائسرائے کے اس انکار کا ردعمل کانگریس کے حلقوں میں کیا ہوا اس سے قطع نظر کرکے بھی عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ برطانوی مدبر کوئی ایسی مرکزی حکومت قائم کرنا پسند نہیں کرتا۔ جس میں اختلاف و تفریق کے امکانات باقی نہ رہیں!

پارلیمانی مشن

اسی زمانے میں برطانوی پارلیمنٹ کا مشن آیا۔

انٹرم گورنمنٹ

جس وقت عارضی حکومت میں شرکت کا سوال زیر بحث تھا تو لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ تنہا مسلمانوں کی نمائندہ ہے اس لئے کانگریس کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو کابینہ کی رکنیت کے لئے اپنی طرف سے نامزد کردے۔ لیکن جب نامزدگی کا وقت آیا تو خود اس نے اس اصول سے قطع نظر کرکے اقوام مندرجہ فہرست کے ایک غیر مسلم کو نامزد کیا۔ اور راجہ غضنفر علی خاں نے تو صاف کہہ دیا کہ ہم انٹرم گورنمنٹ میں صرف پاکستان کے لئے جنگ کرنے جارہے ہیں۔ اور یہ بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ اس لیاظ پر کانگریس کی بازی ہر گئی۔

آزادی کے بعد

۱۵ اگست کو ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا اور اسی کے چند روز بعد بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا اعلان ہوگیا۔ یہ اعلان ایک چنگاری تھی جو پنجاب کے بارود خانہ میں گری اور اس کے بعد دنیا نے انسانوں کی بہیمیت اور وحشت کے جو مناظر پنجاب اور دہلی میں دیکھے وہ انسانیت کے دامن پر ایک ایسا دھبہ ہے جو صدیوں تک باقی رہے گا ان دو مہینوں کی تاریخ ان وحشیانہ افعال کے لحاظ سے جن کا ارتکاب کیا گیا انقلاب فرانس کے عہد تشدد کی تاریخ ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہندوستان کی تہذیب پر سب سے زیادہ شرمناک دھبہ وہ مظالم ہیں جو عورتوں اور بچوں پر کئے گئے اور اس فرقہ پرستی کے ہولناک فتنہ کا آخری شعلہ وہ تھا جس نے خود گاندھی جی کے رخت حیات کو ایک آن واحد میں پھونک دیا۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ان کے خون کے ایک ہی چھینٹے نے ان انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو اس طرح ٹھنڈا کر دیا جس طرح کہ کوئی دوسری چیز نہ کرسکتی تھی۔ یکم ستمبر کو کلکتہ میں اور پھر جنوری ۴۸ء میں دہلی میں انہوں نے آخری مرتبہ —— ہندو مسلم اتحاد کے لئے برت رکھا اور ۳۰ جنوری کو بالآخر اپنے مقصد کی آخری اور انتہائی قیمت ادا کرکے وہ اپنی زندگی کے فرض سے سبکدوش ہوگئے۔

سخت ترین امتحان

۴۷ء کے آخری اور ۴۸ء کے ابتدائی مہینے حضرت مولانا جیسے حساس انسان کے لئے زندگی کے ...... سخت ترین امتحان کا زمانہ تھا۔ مرکزی حکومت کے رکن کی حیثیت سے بھی ان کو اس آگ میں گذرنا پڑا۔ اہل دہلی جو بہت قریب سے حضرت مولانا کو دیکھ رہے تھے اس حقیقت پر گواہ ہیں۔ کہ اس ہولناک دور میں مولانا کی انسانیت کس طرح اس امتحان میں پوری اتری وہ دن رات حالات کا مقابلہ کرنے میں مصروف رہے اور امن وامان کیلئے ان کی جدوجہد کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی شخصیت کے بہترین قویٰ برسرکار نہ آئے ہوں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دہلی کے اس دور میں وہ اپنے سخت سے سخت مخالفین اور دشمنوں کی بھی پوری پوری مدد کر رہے تھے ان کا مکان ہر شخص کے لئے پناہ گاہ تھا ان کے دنوں اور ان کی راتوں کا ہر لمحہ مصیبت زدوں اور مظلوموں کی خدمت اور امداد کے لئے وقف تھا۔ اس زمانہ میں وہ گاندھی

جی کے دست راست تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ہنگامہ کی مایوس کن تاریکی میں وہ اور گاندھی جی ایک دوسرے کا سہارا
تھے۔ گاندھی جی کا دفعتاً دنیا سے رخصت ہو جانا حضرت مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن ان کی باوقار شخصیت کو باہر سے
دیکھنے والے لوگ اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ سنجیدگی اور تمکین کی اس خاموش سطح کے نیچے ان کی زندگی میں یہ کتنا گہرا زخم تھا
جو زندگی کی آخری سانس تک رستا رہا۔

ایک عالم

عزم ہمالیہ کی طرح استوار، دل آب زمزم کی طرح پاک وصاف، دماغ آسمان کی طرح بلند، نظر آفتاب کی طرح روشن، فکر دریاؤں
کی طرح رواں، علم سمندر کی طرح وسیع، عقل چراغوں کی طرح نور افروز، فضل اشجار کی طرح سایہ دار و ثمر ریز، کلام شہد کی طرح لذیذ و شیریں
مزاج پھولوں کی طرح نازک اور شگفتہ۔

حکمت میں عقدہ کشا، سیاست میں صاحب تدبیر، حکومت میں فیض رساں، بزم میں صاحب علم و کمال، رزم میں مجاہدِ وطن۔
سر پر قیادت کا تاج، پیشانی پر شرافت کا عکس، آنکھوں میں ایمان کا نور، زبان پر نعرۂ حق اور پیام امن، سینہ پر محبت کی آئینہ بندی،
دل میں انسانیت کا درد، کمر میں صبر کی تلوار، دوش پر شکر کی عبا، ہاتھ میں استقامت کی عصا، پاؤں میں عزم و ثبات کے موزے۔ اور اتحاد
ترقی کی راہ پر وہ سفر جس کی ہر منزل پر انسانیت کی فلاح کا پیغام اور جس کی آخری منزل پر یہ آواز کہ اب مجھے خدا پر چھوڑ دو۔ اس حالت میں خدا
مجھ سے راضی ہے اور میں اپنے خدا سے راضی ہوں۔

کروڑوں برس کی بوڑھی دنیا نے اپنی زندگی میں ان گنت ابوالکلام دیکھے ہوں گے لیکن جس ابوالکلام کو دنیا ڈھونڈھ رہی ہے اور ڈھونڈتی
رہے گی وہ ایک ذات نہیں، انسانیت کے ایک دور کی تاریخ اور انسانی تمدن کے ایک زمانہ کی داستان تھی جسے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء تک دیکھا
گیا، سنا گیا، دہرایا گیا، لیکن اب پڑھا جائے گا کہ وہ خاک میں مل کر کیمیا بن گیا ہے، اب وہ عالم نہیں سراپا علم بن گیا ہے، جس کی تحصیل کے لیے
درسگاہیں بنیں گی، کتابیں تحریر ہوں گی، تحقیق کے باب کھلیں گے اور مستقبل کا انسان ابوالکلام کا علم بھی عقلوں کو مانجنے اور دلوں کو صاف کرنے
والے علوم کی طرح حاصل کرے گا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ابوالکلام کو ایک عالم کی صورت میں کھو کر دنیا نے زیادہ کھویا ہے یا ابوالکلام کو
ایک علم کی صورت میں پا کر دنیا نے زیادہ پایا ہے۔

ابوالکلام اور اقبال دونوں کے اعتقادی مسلک میں عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے —— اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ اقبال نے اپنے
محبوب نمونے اہل طریقت سے حاصل کئے ہیں۔ مثلاً رومی، سنائی وغیرہ اور ابوالکلام کے نمونے اہلِ دین میں سے ہیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبل، امام
ابن تیمیہ، حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ —— اس سے یہ تو ظاہر ہو ہی جاتا ہے کہ ان کے درمیان تھوڑی حد تک وہ فاصلہ ضرور ہے جو مسجد و
خانقاہ میں ہونا چاہیئے —— ان میں سے ایک براہ راست مسجد سے فیضیاب ہو رہا ہے اور دوسرا براہِ راست خانقاہ سے استفادہ کرتا ہے
مگر بلب دجنوں کی حد تک دونوں مذہبِ عشق کے معترف و معتقد ہیں

ڈاکٹر سید عبداللہ

بولتی ہوئی تحریریں

"قبل اس سے کہ ہم پر شہادت دی جائے، بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں۔"

"میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اُسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گذری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گذرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدہ کو نہ جھٹلاؤں۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی۔"

"میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندوستانی ہوں اور ناقابل تقسیم اور متحدہ ہندوستانی قومیت میں شامل ہوں۔ گیارہ صدیاں گذر گئی ہیں اور ہندوستان کی سرزمین سے اسلام بھی اسی طرح وابستہ ہے جس طرح ہندو دھرم۔ اگر اس ملک کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے یہاں موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندوستانیوں کا مذہب بن چکا ہے۔ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں ہماری شاعری ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں میں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں لیکن ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اُسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔"

"سمندر میں جب طوفان خیز لہروں کا تلاطم برپا ہوتا ہے تو اس کے دردانگیز نتائج کا حال ان لوگوں کو معلوم نہیں جو شام کے وقت ساحل کے کنارے اس لئے جمع ہو جاتے ہیں کہ سطح سمندر کے ہر جد ید تغیر سے ایک نیا لطف اٹھائیں۔ ان کی حقیقت سے وہی خانہ ویران واقف ہو سکتے ہیں جن کے گھر کی دیواروں سے یہ سیلاب ٹکرا کر گذر گیا ہے۔ بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔"

"ہماری فتح مندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر مشتمل ہے۔ میں اس وقت بھی اس ملک کے ہر باشندہ کو صرف انہی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ ہندو مسلمانوں کا کامل اتفاق، امن، نظم، قربانی اور اس کی استقامت۔"

"عفو و درگذر، آشتی و محبت، نرمی و عاجزی انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی ہے۔ لیکن کن کے سامنے؟ عاجزوں اور درماندوں کے سامنے نہ کہ ظالموں اور مجرموں کے آگے۔ ایک مسکین و فلاکت زدہ پر رحم کیجئے تو سب سے بڑی نیکی ہے اور ایک

مولانا آزاد کی وفات پر تعزیتی پیغامات

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد ہندوستان ایک عظیم عالم، ایک بلند پایہ مقرر، ایک تجربہ کار سیاست دان، ایک مسلمہ قوم پرست، ایک مایۂ ناز محب وطن، جنگ آزادی کے ایک سپہ سالار اور ایک ایسے عظیم راہنما کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے جس کا مشورہ مشکل اوقات میں قوم کے لئے ہمیشہ ہی مشعل راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ آخر وقت تک وطن کی جس سے انہیں بے حد پیار تھا آبیاری اور خدمت کرتے رہے۔

گذشتہ چالیس پچاس برس کی زندگی کا تعلق مولانا کی زندگی کے ساتھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فرق کرنا چاہیں تو بھی کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ ایسے وقت میں جب ہم نے جانا نہیں تھا کہ ملک کی آزادی کے لئے کتنی مشکلیں برداشت کرنا پڑیں گی، مولانا نے اپنی زبان اور اپنے قلم سے کروڑوں لوگوں کو جگایا۔ صرف جگایا ہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا کہ ملک کی آزادی کے لئے کس طرح قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ یہ تو سب لوگوں پر ظاہر ہے کہ جب اس کے شروع میں مولانا نے اپنا کام شروع کیا تو انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ ان کا یقین تھا کہ ملک کے اندر دونوں کو ہمیشہ رہنا ہے اور اگر رہنا ہے تو مل جل کر ہی رہنا ہے۔ تب ہی سب کے لئے خیریت اور عافیت کی بات ہو سکتی ہے اور جب اس کام کو شروع کیا تو زندگی کے آخر تک تندہی اور ہوشیاری کے ساتھ نبھایا۔ راستہ میں مشکلیں آئیں لیکن انہوں نے پرواہ نہ کی اور جو اصول طے کر لیا تھا آخر وقت تک اس پر قائم رہے۔ بہت سے لوگ تھے جو آ کر ملے پھر الگ ہو گئے لیکن حضرت مولانا نے پھر بھی پرواہ نہ کی اور جو اصول طے کر لیا تھا آخر وقت تک اسی پر قائم رہے۔ ان کے قلم اور زبان میں اتنی طاقت تھی کہ کروڑوں کو آزادی کے راستہ پر چلایا، کروڑوں کو قربانی کے لئے تیار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ پورا ملک اُن کا گرویدہ تھا۔ عوام نے دکھلا دیا کہ انہیں مولانا کے ساتھ کتنی محبت تھی۔

مولانا بیمار پڑنے سے پہلے کام کرتے رہے۔ انتقال سے قبل چند ہفتوں تک انہیں پہلے سے زیادہ کام کرنا پڑا مگر وہ اس کام سے تھکے نہیں، کام کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اندر نئی طاقت اور نئی زندگی آ گئی ہے۔ مگر آخر میں وہی نتیجہ ہوا جو ہم سب جانتے ہیں اور وہ یہ کہ جو زبان کروڑوں کو جگاتی تھی، وہ قلم جو انسانوں میں نئی روح پھونکتا تھا، ہمیشہ کے لئے رُک گیا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان کی قربانی اور ان کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ اسی میں ملک کی بہتری ہے اور اسی سے ہم اپنی آزادی محفوظ رکھ سکیں گے۔ آج ہمیں تہیہ کر لینا چاہیئے کہ ہم مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے اور جس طرح انہوں نے اپنے ملک کی بھلائی کے مقصد کو سب سے مقدم رکھا، اسی طرح ہم بھی اس بھلائی کو مقدم سمجھیں گے اور اس بات کو سمجھیں گے کہ آپس کے جھگڑے ملک کیلئے نقصان دہ ہیں۔ اگر ہم مولانا کی زندگی سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ملک میں اتحاد و یکجہتی کے لئے کام کریں۔

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشن مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست دان تھے۔ مفکر اور اسکالر تھے، پکے مسلمان تھے اور پر جوش محب وطن۔ انکی ہستی کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ انہوں

نے محض اپنے نظریات کی خاطر بڑی مصیبتیں سہی ہیں لیکن پرواہ نہ کی۔ ایک سیاستدان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے خطرات مول لیتا ہے۔ انہوں نے یہ خطرہ مول لیا اور سختی سے اپنے نظریات پر قائم رہے۔ اپنے ذاتی تعلقات میں مشفق رحم دل تھے۔ مولانا مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوم اس نصب العین کو کلیجے سے لگائے رکھے جسے مولانا نے ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات، رواداری اور اتحاد کی روح کو یاد رکھنا چاہیئے۔

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو

یہی نہیں کہ میں نے مولانا کے علم و فضل سے استفادہ کیا ہے بلکہ بسا اوقات حضرت مولانا کے علم و مطالعہ کے سامنے مجھے اپنا علم، دریا کے سامنے پانی کا قطرہ دکھائی دیا ہے۔ ہندوستان کارواں ہے اور مولانا میر کارواں تھے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کے مابین پل بن جائیں۔ یہ برگزیدہ شخصیت ہم سے جُدا ہو گئی ہے۔ مگر اس کی زندگی کا پیغام جاوداں ہے اور وہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہمیں راستہ دکھاتا رہے گا۔

ممتاز افراد کے انتقال پر یہ کہنا بڑی رسمی سی بات ہو کر رہ گئی ہے کہ اب ان کی جگہ پُر نہ ہو سکے گی۔ بڑی حد تک یہ بات صحیح ہوتی ہے مگر جہاں تک مولانا آزاد کے انتقال کا تعلق ہے یہ بات سو فی صدی صحیح ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اب ہندوستان میں کوئی عظیم شخصیت پیدا نہ ہو گی۔ ہندوستان میں بڑے آدمی پیدا ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی پیدا ہوں گے۔ لیکن مولانا آزاد جیسی شخصیت کا دوبارہ پیدا ہونا ممکن نہیں۔

مولانا مرحوم کی شخصیت قدیم و جدید قدروں کا سنگم تھی۔ ماضی و حال کی تمام خصوصیات ان میں پائی جاتی تھیں۔ خاص طور سے ان میں پرانے دنوں کا اخلاق، وضع داری، رواداری اور صبر و تحمل کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہ وہ قدریں ہیں جو اس زمانے میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ سائنسی اور ٹیکنیکل معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگ چاند پر پہنچنے کی فکر میں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر زندگی سے اخلاق اور رواداری کی قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

مولانا کی ذات اس مشترکہ کلچر کی نہایت ہی مخصوص اور ممتاز نمائندہ تھی جو ہندوستان میں برسوں کی تبدیلیوں سے وجود میں آیا ہے۔ اس ہندوستانی کلچر پر مغربی ایشیا اور ایران کے کلچر کی گہری چھاپ پڑی ہے اور مولانا اس کے صحیح نمائندہ تھے۔

میں اب کسی ایسے شخص کا تصور نہیں کر پا رہا ہوں جو اُن کی جگہ لے سکے۔ کیونکہ وہ جس عہد کی پیداوار تھے وہ عہد ختم ہو چکا ہے۔ ہم میں چند اس عہد کی یادگار، دھندلی سی یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نئی نسل جذباتی طور پر اس بات کا اعتراف کر سکے گی یا کہ نہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کی بصیرت اور دانش وری کا مقابلہ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے دانش وروں سے کیا جا سکتا ہے۔

شورش کاشمیری

سفرِ آخرت

۱۹ر فروری ۱۹۵۸ء کو پانچ بجے صبح حسب معمول امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد جانے پی کر غسل خانہ میں گئے کہ یکایک جسم کے دائیں حصہ پر فالج نے حملہ کیا اور بے بس ہو گئے اور بالآخر ۲۱ اور ۲۲ر فروری کی درمیانی شب میں دو بج کر دس منٹ پر موت نے اس عظیم انسان کے لئے اپنا دامن وا کر دیا جو اس دور میں سب سے بڑا ہندوستانی، سب سے بڑا انسان اور سب سے بڑا مسلمان تھا۔

تمام ہندوستان نے اشکبار چہروں کیساتھ اپنے جھنڈوں کو سرنگوں کر دیا۔ جہاں جھنڈے سر جھکا رہے تھے وہاں لوگوں نے اپنے دلوں کے پرچم جھکا دیئے کہ اس دور کا ابنِ تیمیہ رحمتِ خداوندی کی گود میں چلا گیا ہے۔ دم زدن میں موت کی خبر ہندوستان کی وساطت سے تمام دُنیا میں نکل گئی۔ ہندوستان دیکھتے ہی دیکھتے تعزیت کدہ نظر آنے لگا۔ کاروبار بند ہو گئے حتیٰ کہ بنکوں میں بھی ہڑتال ہو گئی۔

رحلت کا اعلان ہوتے ہی تین چار لاکھ انسان کوٹھی کے باہر جمع ہو گئے۔ گریہ و بکا کا طوفان بڑھتا رہا۔ لوگوں کے غول لگاتار چھ گھنٹے تک قطار اندر قطار کوٹھی کے صحن میں اپنے عظیم الشان راہنما کی زیارت کے لئے آتے ہی گئے۔ ہر مذہب، ہر عقیدہ، ہر فرقہ کے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دینے لگا۔ ہندو اور سکھ عورتیں اور مرد نعش کے پاس سے گذرتے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے، ہر آنکھ میں آنسو تھے۔ ایک طرف راجندر پرشاد صدر جمہوریہ، ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے عمائدین ملک و قوم تصویرِ ماتم بنے کھڑے تھے جیسے وہ اس دن جینا نہیں چاہتے تھے دوسری طرف لوگ آنسوؤں کی مالائیں چڑھاتے گذرتے جاتے تھے۔ کئی ہزار برقعہ پوش مسلمان خواتین آزادی کے بعد پہلی مرتبہ نئی دہلی میں اس طرح یکجا اور اشکبار نظر آ رہی تھیں۔ حضرت مولانا تاریخِ انسانی کے تنہا مسلمان تھے جن کے ماتم میں کعبہ و بت خانہ اس شدت سے سینہ کوب تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو سراپا گریہ تھے۔ انہیں سنبھالنے والے ہزاروں تھے۔ لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لئے دوڑے پھر رہے تھے تمام کوٹھی کے وسیع باغات انسانوں سے اٹ چکے تھے، لیکن لوگ اندر آنے کے لئے دروازہ پر ہجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضاکار کی طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے —— اور جب جنازہ اٹھانے کیلئے ان کو بُلایا تو انکی نظریں ہمرکاب سکیورٹی آفیسر پر رُک گئیں۔ استفسار کیا: "آپ کون؟" جواب ملا "سکیورٹی آفیسر۔ آپ کی حفاظت کے لئے" پنڈت نہرو نے کہا "کیسی حفاظت — ؟ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ بچا سکتے تو مولانا کو بچا لیتے۔" یہ کہہ کر پنڈت نہرو بلک بلک کر رونے لگے۔

پونے بجے میت اٹھائی گئی۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا۔ جب کلمہ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اُٹھا تو عربی سفراء کاندھا دیتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے پنڈت جواہر لال نہرو، خان محمد یونس خان، مسٹر کرشنا مینن، مسٹر پرلودھ چندر اور بخشی غلام محمد نے احاطے سے باہر میت کو توپ گاڑی پر رکھا۔ راجندر بابو دمہ کے مریض ہونے کے باوجود صبح ہی سے تصویرِ یاس بنے کھڑے تھے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے "آج ۳۸ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہو گیا" پنڈت پنت نے درد سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے"

پنڈت نہرو کی ہچکی بندھ گئی۔ مولانا احمد سعید کی سفید داڑھی پر آنسوؤں کے موتی جگمگا اُٹھے۔ تمام فضا میں نالہ ہائے شیون

تھم گئے۔ مولانا کی بڑی بہن آرزو بیگم نے کوٹھی کی چھت سے بھائی کی میت پر آخری نظر ڈالی اور کہا۔ اب کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔ جنازہ کی گاڑی میں سرہانے کی سمت دائیں رُخ پر پنڈت نہرو اور بائیں طرف پر صدر کانگریس ڈھیبر بھائی کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جنرل شاہ نواز، ڈھیبر بھائی کے ساتھ بخشی غلام محمد اور پروفیسر ہمایوں کبیر موجود تھے۔

جسم پر کھدر کا کفن تھا۔ میت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپٹی ہوئی تھی جس پر کشمیری شال پڑا تھا۔ جنازہ کے پیچھے صدر جمہوریہ اور نائب صدر کار میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزراء اعظم، اکثر صوبائی گورنر اور غیر ملکی سفارتی نمائندے چلے آ رہے تھے۔ بھارتی افواج کے چیف آف اسٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے ۔۔۔۔ جب جنازہ کا جلوس انڈیا گیٹ اور ہارڈنگ برج ہوتا ہوا، لاکھوں انسانوں کی عقیدت و محبت کے لئے دریا گنج کے علاقہ میں داخل ہوا، تو سڑک کے دونوں کناروں درمیانی فٹ پاتھ اور دراز قد مکانوں کی چھتوں سے پھول ہی پھول برسنے لگے۔ یہاں پھولوں اور پنکھڑیوں کی موسلا دھار بارش کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور جب جنازہ جامع مسجد کے قرب و جوار میں پہنچا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ جامع مسجد کی بالائی چھت، سیڑھیوں کے لمبے سلسلے، محرابوں کی پیوست زنجیریں، حجروں کی ہم آغوش صفیں، مکانوں کی منڈیریں، اور دوکانوں کے چھجے انسانی سروں سے لدے پڑے تھے۔ پریڈ گراؤنڈ میں محتاط سے محتاط اندازہ کے مطابق بھی پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ قبر کے ایک طرف علماء، و حفاظ قرآن مجید پڑھ رہے تھے اور دوسری طرف اکابر و فضلاء، سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہاں سب سے پہلے بری فوج کے ایک ہزار سپاہیوں، ہوائی فوج کے تین سو جانبازوں اور بحری فوج کے پانچ سو نوجوانوں نے اپنے عسکری بانکپن کے ساتھ میت کو سلام کیا۔ پھر مولانا احمد سعید نے دو بجکر پچاس منٹ پر نماز جنازہ پڑھائی ۔۔۔۔ ادھر نماز جنازہ پڑھائی جا رہی تھی اُدھر پنڈت نہرو قبر کے قریب فرش زمین پر بیٹھے ٹک ٹک دیکھ رہے تھے ۔۔۔۔ امام نے السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہا اور میت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزارہا ہندو سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج نے ترہی بگل بجائے۔ ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔ مولانا احمد سعید نے لحد میں اُتارا۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا تھا۔ ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ راجندر بابو نے آنسوؤں کی سیل میں بھگو کر پھول بچھا دیئے۔ پنڈت نہرو نے گلاب چھڑکا تو بے اختیار ہو گئے۔ لوگوں نے سہارا دیا اور جب مٹی دینے لگے تو بلک بلک کر رو رہے تھے ہر چہرہ روتا ہوا نظر آتا تھا۔

مسلمانوں کی عہد آفریں ہستیوں پر خود مسلمانوں کے ہاتھوں جو گذری اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمیشہ بڑوں کی عظمت پر اُنکی موت نے شہادت دی ہے۔ آج جن لوگوں پر ہمارے علم و عمل اور فکر و نظر کی عمارتیں استوار ہیں۔ اپنی حیات میں ان پر تبرّی کیا گیا۔ قید میں ڈالا گیا۔ زنجیریں پہنائی گئیں۔ بسا اوقات وہ عوام کے سب و شتم اور خواص کے جور و ستم کی تاب نہ لاکر موت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے انہیں کفن سے بھی محروم رکھا۔ غرض رسوائی اور تشہیر کا تمام گرد و غبار انکی ہستی پر ڈالا گیا ۔۔۔۔ مگر جب وقت نے کروٹ لی تو ان کی ذات سورج کیطرح ابھر کر چمکنے لگی اور تاریخ کی پیشانی اُن کے آستانہ عظمت پر ہمیشہ کیلئے جھک گئی ۔۔۔۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی ان جانکاہ استوں سے گذرنا پڑا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں وقت کی کوئی گالی نہ تھی جو ایک زمانہ میں مسلمانوں نے انکے خلاف استعمال نہ کی ہو مگر وہ تحمل کے اعتبار سے پہاڑ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ صبر کیا۔ انکی اور ابن تیمیہؒ کی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت ہے اور یہ مماثلت موت کے بعد بھی نظر آتی ہے جس طرح ابن تیمیہ کی رحلت پر زندگی کا کوئی شعبہ ماتم سے خالی نہ رہا تھا اسیطرح حضرت مولانا کی وفات پر زندگی کا ہر شعبہ ماتم گسار ہے۔ جب تک حیات تھے وقت کی سیاسی مصلحتیں اُن کے گریبان پر ہاتھ اُٹھاتی تھیں آج اُٹھ گئے ہیں تو مزار، عوام و خواص کا مرجع ہے ؎

"مر گئے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا"

پنڈت گوبند ولبھ پنت (وزیر داخلہ ہند)

عوام اور حکومت کا رہنما

"آنے والی نسلیں حضرت مولانا کی شرافت نفس کو یاد رکھیں گی"

گاندھی جی کی شہادت کے بعد سے ملک کبھی ایسا متزلزل نہیں ہوا جیسا کہ مولانا صاحب کی حسرتناک موت سے ہوا۔ انہوں نے ۴۰ سال سے بھی زیادہ ملک کی خدمت کی ہے۔ ماضی قریب کے بہت سے برسوں کی ہندوستانی تاریخ مولانا مرحوم کے اس کردار کو ایک وسیع صورت میں پیش کرے گی جو مرحوم نے اس تاریخ کی تعمیر میں ادا کیا ہے۔

مولانا مرحوم ہمارے دیس کی مجسم ثقافت تھے جو ہمارا بیش بہا ورثہ ہے اور اس اعتبار سے وہ تمام لوگوں سے اتحاد، رواداری، خیرسگالی اور دوستی کے جذبات سے پیش آتے تھے۔ مرحوم ایک دانا مدبر، پُرجوش محب وطن، جری سپاہی اور ایک ایسے فاضل اجل تھے جن کے علم کی قدر نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی کی جاتی ہے۔ مرحوم نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں برسوں انڈین نیشنل کانگرس کی رہبری کی۔ مولانا مرحوم نے کرپس مشن، دیگر اداروں اور لارڈ ویول سے بھی ملک کی آزادی کے اہم مسئلہ پر گفت و شنید کی تھی۔

وہ ایسی ہستی تھی جس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی اور جس کے قدم سچائی اور راستی کی راہ میں کبھی نہ ڈگمگائے اس ہستی نے اپنی زندگی دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس ہستی نے بنی نوع انسان کی آزادی کے لئے جدوجہد کی اور ہندوستان کی آزادی اور اس ملک میں بسنے والے تمام لوگوں کی یگانگت کے لئے محنت و مشقت کی۔

بڑی حد تک ہماری آزادی مرحوم جیسے لیڈروں کی مرہون منت ہے۔ مرحوم کی یاد محبت سے تازہ رہے گی اور لوگ ہمیشہ مرحوم کی زندگی سے فیضان حاصل کرتے رہیں گے۔ مرحوم نے تمام لوگوں کے لئے ایک نقش قدم چھوڑا ہے اور آنے والی نسلیں مرحوم کی شرافت نفس کو یاد رکھیں گی۔

مرحوم صحیح معنوں میں ایک عظیم شخص تھے۔ ہمیں ان جیسا آدمی پھر نہ مل سکے گا۔ قوم ایسی عظیم ہستیوں کو یاد رکھے گی۔ وہ امید اور اعتماد کا ایک روشن مینار تھے۔ وہ آج ہم میں سے اُٹھ گئے ہیں۔ نہ صرف لوگوں بلکہ حکومت کا بھی ایک ایسا رہنما چلا گیا جو تمام حالات میں عدل و انصاف کیلئے سینہ سپر رہتا تھا۔ مرحوم نے حکومت کے اندر رہ کر اور باہر بھی تنہا دل و دماغ اور نہایت انہماک سے کام کیا ہے۔ میں صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ ملک اس صدمہ کو سہہ لے بلکہ وہ مقاصد جن کے لئے وہ کھڑے ہوتے اور جو مقاصد ہمیشہ ان کے پیش نگاہ رہے اور جن اصولوں پر وہ کاربند رہے وہ ہماری رہبری کرتے رہیں۔

(مرکزی حکومت کے اعلان سے ۲۲ ۔ ۲ ۔ ۵۸)

آفرینندۂ عہد

مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں وہ آفرینندۂ عہد تھے۔ اس لیے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدہ عہد ہوتے وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب، اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے اس کا احساس آج ہو رہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے وقت میں ہوتا ہے۔

مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آرہا ہے جو کہیں نظر سے گذرا ہے یا سننے میں آیا ہے کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ "تم لوگ پانی اور کیچڑ کو دیکھ کر بارش کا یقین کرتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں"! دنیا کے کم لیڈروں کو یہ درجہ نصیب ہوا ہے۔

مولانا نے جس طرح جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر کامیابی کے ساتھ ہندستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور تقویت پہنچانے کی خدمت سرانجام دی اس سے بڑی خدمت اس سیکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون و بیرون ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی کس عظمت اور کس اہمیت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ تنہا اس مسلمان کے حصے میں آتا جس سے زیادہ ملعون اور مغضوب تقسیم ملک کی رات سے پہلے مسلمانوں ہی کے نزدیک دوسرا مسلمان نہ تھا۔ (رشید احمد صدیقی)

میں نے اپنی زندگی میں دو ہی انسانوں کی نمازیں دیکھی ہیں جن سے مجھے پتہ چلا کہ نماز کسے کہتے ہیں ایک ابوالکلام کی اور دوسری مولانا محمد الیاس کی۔ (سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

خدا کی طرف پکار

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللهِ۔ — اے برادران ملت اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار کا جواب دو

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا

آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا، جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ "اٹھو! کیونکہ بہت سو چکے، اور بیدار ہو، کیونکہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے! پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے، جو تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے"!!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸:۲۴)

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی صدا کا جواب دو جبکہ وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تم کو موت سے نکال کر زندگی بخشے یاد رکھو کہ اللہ جب چاہتا ہے انسان اور اس کے دل کے اندر آڑے آجاتا ہے اور پھر خواہ تم اُس سے کتنا ہی اعراض کرو مگر تم کو ہر پھر کے اسی کے آگے ایک دن جانا ہے۔

رئیس الاحرار مولانا محمدؐ علی جوہر رحمتہ اللہ علیہ
۱۲۹۶ھ
۱۸۷۸ء
۱۳۴۹ھ
۱۹۳۱ء
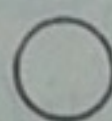
میں بھی گذرا:۔

"اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔"

اور دو آدمیوں کے سہارے سے جلسہ گاہ میں تشریف لا کر صدارت کی۔

ناگپور کانگریس

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ انہی دنوں ترک موالات کا زور تھا۔ حضرت شیخ الہند کے فتوے پر پانچ سو علماء نے دستخط کئے اور یہ فتویٰ سارے ہندوستان میں قریہ قریہ، بستی بستی تقسیم ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے ترک موالات کا پروگرام منظور کر لیا اور زمام قیادت گاندھی جی کے سپرد کر دی گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ترک موالات کا جو فتویٰ دیا تھا، تمہیدی کلمات کے بعد اس پروگرام کی دفعات یہ تھیں کہ مسلمان

۱۔ سرکاری اعزازوں اور خطابوں کو واپس کر دے۔

۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے۔

۳۔ صرف اپنی ملکی اشیا اور مصنوعات کا استعمال کرے۔

۴۔ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرائے۔

اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں بشرطیکہ:

۱۔ اتباع شریعت کیا جائے اور عملدرآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔

۲۔ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقض امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مدنظر رہے۔

۳۔ ارشاد عثمانؓ اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤا فاجتنب اساءتھم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب کہ برا کریں، برائی سے بچتے رہیں) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔

(العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۳ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ)

خلافت کانفرنس

جن دنوں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا انہی دنوں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی ہوا اور اس میں بھی ترک موالات کا ریزولیشن منظور کر کے مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لئے گاندھی جی کو منتخب کیا۔

اختلاف

بقول رئیس احمد جعفری مؤلف سیرت محمد علی:

"اس وقت تک کانگریس سے لبرل حضرات علیحدہ نہیں ہوئے تھے اور وہ بھی اس میں شریک ہوتے تھے (یعنی کانگریس کے اجلاس میں)، انہیں چونکہ یہ غیر آئینی، روش پسند نہیں تھی اس لئے وہ بھی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوئے اور تجویز ترک موالات و ترک تعاون کو نامنظور کرانا چاہا۔"

(برطانوی مظالم کی کہانی ص ۱۸۳)

"اگر مہاتما جی نے تمہیں اس بیان کو شائع کرنے سے پہلے اطلاع دے دی تھی کہ وائسرائے نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا ہے تو تم سے بڑھ کر بزدل کوئی نہیں اور اگر انہوں نے اس کی اطلاع تمہیں نہیں دی تھی تو ان سے بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں"

اور مولانا محمد علی جوہر نے اس پر یہ تبصرہ کیا:

"لیکن میرے ان جوشیلے بھائی کو یہ نہ سوجھا کہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات کا خلاصہ غلط دیا ہو۔ بہر حال جب میں نے چیمسفورڈ کلب والی تقریر سنی تو سارا بدن پھنک گیا اور میں نے مہاتما جی سے اس قدر کہا کہ اجازت ہو تو اس کا جواب دے دوں۔ جلسہ خلافت کا تھا، میں صدر تھا، تقریر صدارت کچھ اور ہونے والی تھی مگر اس کے بعد میں نے صرف لارڈ ریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور مشکل ہی سے میں نے ساری عمر اس سے زیادہ سخت کوئی اور تقریر کی ہوگی"

ہر اس سربرآوردہ شخصیت کے ساتھ جس نے ملک وملت کی رہنمائی کے لئے قدم اٹھایا ہے، یہ معاملہ ہوتا چلا آیا ہے کہ اس نے یہ کیا ہے وہ کیا ہے۔ اگر محمد علی جوہر بڑے آدمی تھے اور یقیناً آپ اپنے دور کے عظیم ترین قائد تھے تو ان کے ساتھ یہ معاملہ اور اس طرح کے دوسرے معاملات پیش آنا لازمی تھے، اگر اس طرح کے معاملات پیش نہ آتے تو حیرانی ہوتی۔

مقدمہ کراچی

۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، پیر غلام مجددی سرہندیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا شوکت علی مرحوم اور سری سوامی شنکر اچاریہ جی وغیرہ شریک ہوئے۔ دیوبند اور دیگر مقامات کے پانچ سو علما کا فتویٰ پہلے شائع ہو چکا تھا جس میں حکومت سے موالات اور تعاون کو حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ سکول، کالج، کچہریوں کی ملازمت اور وکالت کا پیشہ، خطابات و اعزازات کا قبول کرنا، ان سب سے منع کیا گیا تھا۔ نیز تحریک خلافت میں حصہ نہ لینے والوں کو میدان جہاد میں بھاگ جانے والے کی حیثیت میں ثابت کیا گیا تھا۔

انہی حالات میں کراچی خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ کرسی صدارت کی اجازت سے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اس کانفرنس میں ایک قرارداد پڑھ کر سنائی جس کا حاصل یہ تھا:

"حکومت برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین اور ہر قسم کی اعانت کرنا از روئے شرع حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے۔"

اور یہ حرمت اس طرح ثابت کی گئی تھی کہ فوج میں شریک لوگوں کو اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر گولی چلانا پڑتی ہے

مولانا محمد علی جوہر ان دنوں پوری طرح مسٹر گاندھی کے ہمنوا تھے اور دونوں میں اتحاد و یکجائیت اس قدر تھی کہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ ہر ایک کو دوسرے پر پُرخلوص اعتماد تھا۔ چونکہ تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ تھی اس لئے مولانا اپنے لیڈر پر بھرپور اعتماد رکھتے

حاشیہ صفحہ ۸۰۵ سے آگے

اور یہ مشہور شعر بھی انہی کا ہے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

اور یہ ہندوستان کے واحد لیڈر ہیں جن کے متعلق نہ تو کسی نے معافی کا افسانہ گھڑا، نہ چندہ ہضم کرنے کا الزام لگایا، سب ان کے معتقد ومعترف رہے۔

کراچی جیل سے مولانا جوہر بیجاپور جیل منتقل کر دیئے گئے۔ راستے میں کسی سٹیشن پر کسی نامہ نگار نے تحریک کے متعلق ان سے سوال کیا، اس سوال جواب کی روداد عبدالماجد دریابادی نے نقل کی ہے:

"عین اسی زمانہ میں محمد علی کراچی سے بیجاپور جیل منتقل کئے گئے تھے۔ کسی سٹیشن پر کسی انگریزی اخبار کے ایک منچلے وقائع نگار نے انہیں جالیا اور سوال تحریک ترک موالات کی موجودہ حالت کے متعلق کر دیا۔ محمد علی نے جواب میں کہا اس تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں۔ میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے لئے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں"

لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے سٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں نے خریدا، اتفاق سے اس میں یہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبدالباری (مولانا جوہر کے مرشد) نے انہیں پڑھوا کر سنا۔ ان کے ایک رفیق سفر دحضر جو اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھے بول اٹھے کہ بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا۔ یہ گاندھی جی کیا معنی؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں۔ وہ تو رسول ہی کا نائب ہوتا ہے، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی میں شامل ہو گئے۔ گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ نام ان ہی کا لینا مناسب تھا[1]

اس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد ایک بات اصولی انداز میں سامنے آتی ہے کہ جب کسی کو تحریک کا قائد بنا لیا جائے تو پھر اس پر پورا اعتماد کرنا چاہیے، مولانا محمد علی جوہر کے گاندھی جی کے متعلق اس قسم کے نظریہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے نقد و نظر کا دروازہ کھولا ہے اور بات کو دور تک لے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا جوہر کا یہ نظریہ کسی بھی نقطہ نظر سے غلط نہیں ہے۔

سزا کے بعد

مولانا محمد علی جوہر اور ان کے دوسرے رفقا پر مقدمہ اور سزا نے تحریک پر جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ مسٹر گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور ترک موالات اور عدم تعاون کے متعلق اسی قرارداد کو ہر جگہ پیش کرنا شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت تھوڑے عرصے میں پچیس تیس لاکھ روپے چندہ تحریک کے لئے جمع ہو گیا حالانکہ مولانا جوہر کی گرفتاری تک دو تین لاکھ ہوا تھا۔ مولانا جوہر کی بیگم اور بی اماں نے اس سلسلہ میں انتھک کام کیا۔ مولانا ابوالکلام کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر کلکتہ میں مقدمہ چلا۔ عدالت میں مولانا نے تاریخی بیان دیا جو "قول فیصل" کے نام سے شائع ہوا، جو اسی کتاب میں مولانا کے حالات میں ملخصاً نقل کر دیا گیا ہے۔

علی برادران کی گرفتاری کے بعد گاندھی جی سول نافرمانی کے لئے تیار ہو گئے اور بردولی سے اس کے آغاز کا پروگرام بنایا گیا۔ لیکن انہی دنوں "چوری چورا" کا واقعہ پیش آ گیا۔ جس کی وجہ سے گاندھی جی نے بردولی جا کر تحریک کے التوا کا اعلان کر دیا۔[2]

---

[1] "محمد علی" ذاتی ڈائری کے چند اوراق حصہ اول ص۱۰۰ مؤلفہ عبدالماجد دریابادی

[2] "چوری چورا" گورکھپور کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں کے لوگوں نے پولیس کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر پولیس سٹیشن کو آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے کئی سپاہی جل کر راکھ ہو گئے۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ اب تحریک تشدد کی نذر ہو جائے گی، مگر کانگریس، خلافت کمیٹی کے ارکان نے مسٹر گاندھی پر زور دیا کہ تحریک جاری رکھی جائے۔ اس پر گاندھی جی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی جو ملک کا دورہ کر کے یہ معلوم کرے کہ آیا ملک سول نافرمانی کے لئے تیار ہے اور کیا اس تحریک میں دوبارہ تشدد تو نہیں ہوگا۔ ملک تو پہلے ہی سول نافرمانی کے لئے تیار تھا۔ اس التوا نے لوگوں میں اضمحلال پیدا کر دیا اور لوگوں نے گاندھی جی کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار شروع کر دیا کہ یہ مہاتما جانے پھر کس وقت اپنی مخصوص حکمت عملی کی بنا پر کوئی خاص حکم جاری کر دے۔ تاہم مسٹر گاندھی تحریک کو اکثر لیڈروں کے جیل جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہے تھے، کہ ایک دن گاندھی جی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور اب کوئی بڑا لیڈر باہر نہ رہا اور تحریک تقریباً بالکل ہی ختم ہو گئی۔

شدھی کی تحریک

انگریز بڑی شاطر قوم ہے۔ تحریک خلافت پر اس نے ہندو مسلم اتحاد کا جو نظارہ دیکھا اس کو دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح متحد رہے تو ہم چند دنوں کے مہمان ہیں لہٰذا حکومت نے سوامی شردھانند کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ جنہوں نے باہر آ کر شدھی کی تحریک چلائی اور ملکانہ کے راجپوتوں کو "شدھ" کرنا شروع کر دیا۔ یہ بیچارے نام کے تو مسلمان تھے لیکن رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوؤں کی طرح۔ لہٰذا شردھانند کی شدھی تحریک کا ان پر جلد اثر ہوا اور وہ ہندو مذہب میں داخل ہو گئے (اس کی کچھ تفصیل حضرت مفتی کفایت اللہؒ اور بعض دوسرے مقامات پر گذر چکی ہے) اور انہی دنوں مالابار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ان سب حالات کی بنا پر ہندو مسلم جو متحد ہو کر انگریز کے خلاف تھے اب ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہو گئے اور دونوں قوموں کی پوری توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔

کانگریس کی صدارت

مولانا جوہر کو جیل میں منجھلی لڑکی آمنہ بیگم کی شدید علالت کی اطلاع ملی۔ آپ نے وہیں سے ایک نظم لکھ کر بھیجی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن اُس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

مولانا دو سال کے بعد جیل سے رہا ہوئے تو دہلی میں کانگریس کے سپیشل اجلاس میں شرکت کے بعد سیدھے کوہ بھوالی سینی ٹوریم میں آمنہ بیگم کے پاس تشریف لے گئے جہاں وہ بستر علالت پر دراز تھیں۔

مولانا نے پریس کے نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے کہا:۔

"میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیل خانے میں آ گیا ہوں۔ مجھے بڑو داجیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔"

اس سال مولانا جوہر کو آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا۔ ان نئے حالات میں مولانا نے جس غیر معمولی قابلیت، ذہانت اور حکمت عملی سے اجلاس کو کامیاب کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔

استقلال و استقامت

مولانا جب جیل سے رہا ہوئے تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق و انتشار نے لے لی تھی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے سامنے ترک موالات اور عدم تعاون کا جو پروگرام رکھا گیا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ شدھی نے لے لی اور ادھر مسلمانوں نے مجبور ہو کر مدافعت میں تبلیغی مہم شروع کر دی۔ تقریباً تمام دینی جماعتیں اور علما شدھی کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ علما کا موقف یہ تھا کہ سوامی شردھانند کی تحریک

(برصغیر کی ملی تاریخ ص ۸۳۳)

(برصغیر کی ملی تاریخ ص ۸۳۴)

کا اگر مقابلہ یا دفاع نہ کیا گیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو اس کا بہت بڑا دینی نقصان ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بیشتر ساتھی بھی اسی تبلیغی مہم میں لگ گئے۔ موتی لال نہرو اور دوسرے وکلا پریکٹس شروع کرکے اپنی اپنی وکالت و بیرسٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے لیکن ایک مولانا محمد علی تھے جنہیں یہی دھن تھی کہ اسی پروگرام و نصب العین کو اپنایا جائے جس کے لئے نہ صرف وہ جیل گئے بلکہ ملک کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور چالیس پچاس ہزار افراد نے ہنسی خوشی تمام کام چھوڑ کر جیل کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔

مولانا جوہر اگر چاہتے تو اسی رَو میں بہہ کر عوامی احساسات کا ساتھ دیتے مگر انہوں نے بلاخوف لومۃ لائم ان حالات میں بھی کانگریس سے پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور کانگریس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے اور اس کی مقبولیت بحال کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ مولانا جوہر پر ایک بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ بڑے جذباتی تھے اور عوام کے جذبات سے کھیلتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو مولانا ان دنوں کانگریس کا ساتھ نہ دیتے بلکہ عوامی جذبات کا ساتھ دیتے ہوئے اسی پروگرام کو لے کر چل پڑتے جس کو دوسرے لوگ کر رہے تھے مولانا کے متعلق یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے ان دنوں تبلیغی کام کی زمام کار کیوں نہ سنبھالی اور اس بارے میں اختلاف کرنے والے اختلاف کر سکتے ہیں مگر یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ وہ عوام کے جذبات سے کھیلتے تھے البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ جس کام کو وہ ملک و ملت کے لئے دیانتداری سے مفید سمجھتے تھے اس کے لئے وہ انتہائی شدید جذبات رکھتے تھے اور اپنی شعلہ بیانی، گرم گفتاری اور اپنی ادبی و تحریری صلاحیتوں کو اس کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ اس کے لئے مولانا جوہر ہی کی ایک تحریر ملاحظہ کیجئے جو اس سلسلے کی ایک طویل تحریر سے اقتباس ہے۔

مہاتما گاندھی خاموش ہو گئے اور ہمارے بعض ساتھیوں نے تو سکوت ہی اختیار نہ فرمایا بلکہ ایک نقارہ لے کر اسی نقار خانے کے نقارچی وہ بھی بن بیٹھے لیکن ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نہ کوئی سکوت کیا، نہ کوئی نیا سر الاپنا شروع کیا اور سامعین کی قلت اور بے پروائی کا مطلق پاس نہ کرکے ہم نے حافظ ہی کے شعر پر اپنا عمل جاری رکھا ہے

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
دربند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے ذوق نغمہ میں کمی محسوس کرکے جس قدر تلخ نوائی کی اور محمل کو گراں پا کر جس قدر حدی کو تیز تر کیا اسے یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔[1]

اس بارے میں ان کی مستقل مزاجی کے متعلق یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ بلگام خلافت کانفرنس کے صدر ان کے کراچی مقدمے کے ساتھی ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے جو ہندوؤں سے سخت بیزار اور ایک الگ تنظیم کا علم جما دے کر کھڑے ہوئے تھے انہوں نے خطبہ صدارت تند و تیز لہجے میں رقم کیا جس میں ہندوؤں پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ مولانا جوہر کو خطبہ کے مندرجات کا اس وقت پتہ چلا جب اگلی صبح اجلاس ہونے والا تھا۔ مولانا نے ساری رات جاگ کر خطبہ سے ناروا اور تلخی آمیز حصوں کی قطع و برید کی اور اس میں سے وہ حصہ نکال دیا جس میں ہندوؤں پر حملہ کیا گیا تھا۔

[1] سیرت محمد علی صد ۴۰۷، ۴۰۸

۱۹۲۴ء ہی میں بلگام میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ اس کے صدر گاندھی جی تھے۔ اس جلسہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا کانگریس کی ممبری کے لئے کھدر کاتنے کی شرط رکھی جائے یا نہ رکھی جائے؟ اکثر لوگ اس کے خلاف تھے اور جو حامی تھے وہ چرخہ کاتنے کو رواج دینے کو حامی تھے مگر اس کے خلاف تھے کہ اس کو شرط کے طور پر رکھا جائے۔ مولانا جوہر نے اس شرط کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا

"چرخہ کو شرط ممبری ہونا چاہیے جو انتہائی مقدار کی کم از کم قربانی ہے۔ اگر کوئی جرمن پروفیسر اپنے طویل نام کے ساتھ کہہ دے کہ چرخہ آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے تو چرخہ کاتنے میں جوش پیدا ہو جائے اور اسی وقت ہندوستان بلا پس و پیش چرخہ کو قبول کرے مگر چونکہ یہی بات ایک ہندوستانی نے کہی ہے اس لئے لوگ شک کرتے ہیں۔"[1]

فسادات کوہاٹ

کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ ہندوؤں کو شکایت تھی کہ مسلمانوں نے زیادتی کی اور مسلمانوں کو شکایت تھی کہ ہندوؤں نے زیادتی کی۔ کانگریس کا ایک وفد جو گاندھی جی اور مولانا شوکت علی پر مشتمل تھا کوہاٹ روانہ ہوا۔ حکومت نے وہاں جانے نہ دیا۔ چنانچہ راولپنڈی میں وفد نے شہادتیں لینی شروع کیں۔ مسلمان دو چار آئے مگر ہندوؤں کی ایک جماعت نے گواہی دی۔ رپورٹ شائع ہوئی تو گاندھی جی نے مسلمانوں کو قصوروار ثابت کیا اور مولانا شوکت علی نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیانات مساوی طور پر نہیں لیے جا سکے لہٰذا اس رپورٹ کی بنا پر مسلمان قصوروار ثابت نہیں کئے جا سکتے۔ بقول مؤلف سیرت محمد علی:-

"گاندھی جی نے اس اختلاف کو شرافت کے ساتھ برداشت کیا اور شوکت صاحب نے وفاداری کے ساتھ اختلاف کیا مگر ہندو پریس میں اک آگ لگ گئی اور آفت برپا ہو گئی۔"[2]

مولانا محمد علی جوہر نے اس معاملے میں بھی بہتر کردار ادا کیا اور وہ بات کہی جو ہر اس سچے محب وطن کو کہنا چاہیے جس کے سامنے ملک کی آزادی کا سوال ہو۔ آپ نے پنجاب پراونشل خلافت کانفرنس میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ وقت نہیں ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرے۔ اس لئے فسادات کوہاٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہے میں انہیں ملامت کرتا ہوں۔"[3]

مولانا جوہر کا یہ کردار بلاشبہ قابل تعریف وتحسین تھا اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو پریس مولانا کے اس رویے کو بنظر استحسان دیکھتا اور خراج عقیدت ادا کرتا مگر ہندو زعماء اور پریس ہمیشہ مصلحت آمیز سکوت اختیار کرتا رہا اور مسلمان یہ کہتے رہے کہ مولانا جوہر پر گاندھی جی کا سحر ہے اور ہاں اسی سُر میں سُر ملا کر ہندو پریس یہ ضرور کہہ دیا کرتا تھا کہ علی برادران نے گاندھی جی پر جادو کر دیا ہے۔ لیکن مولانا اپنے اور پرایوں کا یہ سلوک دیکھنے اور سننے کے باوجود ہمالہ کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور یہ اعتراف کرنے میں بھی بخل نہیں کرنا چاہیے کہ گاندھی جی کا رویہ بھی منصفانہ رہا۔ انہوں نے بھی تحریک خلافت میں جو خالص اسلامی تحریک تھی بھرپور ساتھ دیا اور مسلمانوں نے ان کی قیادت میں کام کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کا نقطہ معراج تھا

بات مولانا جوہر کی استقامت اور اپنے موقف پر پختگی کی ہو رہی تھی جس کی بنا پر وہ ہندو اور مسلم دونوں کی نظر میں غیر مقبول ہو رہے تھے

پہاڑ کی طرح قائم ہیں

۱۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو قومی ہفتہ کے سلسلے میں دھرم سالہ جمشیدی میں کانگریس کا ایک جلسہ منعقد ہوا حاضرین کی تعداد حیرت انگیز حد تک کم تھی۔ مولانا جوہر نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

[1] سیرت محمد علی ص ۴۰۰، ۴۰۱　[2] بحوالہ ایضاً ص ۴۱۲　[3] بحوالہ ایضاً ص ۴۱۲

تو اس کے خلاف اوروں کو اس طرح اپنا حلیف بنالو، جس طرح رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنالیا تھا، اگر کوئی جماعت بھی تمہارے بابی تدبر سے رام ہو کر تمہاری حلیف نہ بن سکے تب بھی ہر محاذ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور جس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے پورا زور صرف کر دو ادھر جگہ صبر و ضبط سے کام لو، جب سب سے بڑے محاذ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے گی اور اس وقت ایک ایک کر کے ہر دشمن سے دل کھول کر انتقام لے لینا یہ نامردی نہیں ہے بلکہ اس کو "عزم" کہتے ہیں۔

اللّٰہ الخصام کون ہے

اگر چین و عرب بھی تمہارا ہے اور ہندوستان بھی تمہارا ہے اور تم سب مسلمان ہو اور سارا جہان تمہارا وطن ہے تو اس دشمن کو اللّٰہ الخصام سمجھو جو سارے جہان پر حاوی ہونا چاہتا ہے یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے اس غریب کی تگ و دو تو سمندر کے کنارے تک ہے یہ گوسر کا بھنگا ہے جس کی ساری دنیا اس گوسر میں محدود ہے ایمان سے کہو کیا تم اس سے خائف ہو؟ ریل میں کسی ڈبہ میں چھ سات ہندو ہوں اور ان میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ تو کیا تمہیں ان سے ڈر لگے گا بعض اوقات تو انہیں کو تم سے ڈر لگتا ہے البتہ اگر اس ڈبہ میں دو چار گورے ہوں تب تو تم کو اور ان کو دونوں کو ڈر لگتا ہے کہ یہ ماریں گے یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے یا پاؤں دبوائیں گے۔" [1]

اب اس پر رئیس احمد جعفری کا تبصرہ پڑھیے:۔

"کانگریس کی حمایت میں، انگریزوں کی مخالفت میں، ہندو مسلم اتحاد کی موافقت میں اس سے بڑھ کر کچھ کیا جا سکتا ہے؟ یا کسی بڑے سے بڑے مدبر نے ایسے نفسیاتی دلائل کبھی پیش کئے ہیں"؟ [2]

اختلاف بڑھتا گیا

مولانا محمد علی کی انتھک کوششوں اور مساعی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کم ہوتا گیا اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی اس کے لیے ایک "یونٹی کانفرنس" دہلی میں اور ایک شملہ میں منعقد ہوئی جس میں اکثر ہندو مسلم زعماء شریک ہوئے۔ کئی کئی دن اس کے اجلاس ہوتے رہے مولانا نے بیحد کوشش کی کہ کسی طرح وہ فضا پیدا ہو جائے جو تحریک خلافت میں تھی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ فسادات ہوتے رہے اور ہندو مسلم تعلقات میں تلخی و کشیدگی بڑھتی رہی۔ گاندھی جیسا آدمی بھی یہ کہکر کہ "اب میری بات کوئی نہیں سنتا" اپنے آشرم میں چلے گئے۔

(حاشیہ پر قلمی تحریر: بریلوی غلط بیانی ص ۸۳۵ [illegible])

مسئلہ حج و حجاز

شریف حسین نے پہلی جنگ عظیم میں جس طرح ترکوں، اسلام اور قبلۂ اسلام سے غداری کی اس کا ہر ایک کو علم ہے۔ اس کی غداریوں سے عالم عرب ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ ان حالات کو دیکھ کر عبدالعزیز ابن سعود نے شریف حسین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انگریز شریف حسین کے طرفدار تھے۔ انگریز کی شاطرانہ چالوں۔ شریف حسین کی طرفداری و حمایت کے باوجود ابن سعود کامیاب ہوئے اور حجاز کے باشندوں نے شریف حسین کے مظالم سے تنگ آ کر ابن سعود کو سایہ رحمت سمجھ

---

[1] سیرت محمد علی صد ۴۱۹-۴۲۰ (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء)

[2] سیرت محمد علی ۴۴۲

کرن کا ساتھ دیا۔ حج کا موسم آرہا تھا۔ انگریزی حکومت چاہتی تھی کہ اس سال ہندوستان سے حاجی حج کے لیے نہ جائیں کہ وہاں فسادات ہیں اور لڑائی ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک اعلان جاری کیا۔ مولانا محمد علی نے اس اعلان کی مخالفت کی اور کہا کہ حاجیوں کا جانا کسی صورت میں ملتوی نہیں کیا جا سکتا حجاج کرام بمبئی پہنچنے لگے بالآخر حکومت کو جھکنا پڑا اور اس نے حاجیوں کو جانے کی اجازت دی۔ شاہ ابن سعود مرحوم نے حجاج کرام کی جان و مال کے تحفظ کا وعدہ کیا اور حجاج بخیر و عافیت واپس آئے۔

آویزش نجد و حجاز

شاہ ابن سعود مرحوم اور شریف حسین کی لڑائی کا ہندوستان پر بھی اثر پڑا۔ ہندوستان میں "بریلی اور فرنگی محل" سے فتوے شائع ہونے لگے کہ شریف حسین سید زادہ اور نجیب الطرفین ہے اور شاہ ابن سعود "وہابی" ہے اس کو ہٹا کر خود حجاز پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا محمد علی شاہ ابن سعود کے حامیوں میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شریف حسین کو اس کی بدکرداریوں کی سزا ملنا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو اس حمایت کرنے پر "بریلی" اور "فرنگی محل" دونوں جگہ کی مخالفت کرنا پڑی۔ "بریلی" سے مخالفت تو خیر ان کو آسان تھی۔ لیکن فرنگی محل سے مخالفت "کارے دارد" تھی کیونکہ یہ ان کا پیر خانہ تھا۔ فرنگی محل کے علماء نے تحریک خلافت میں جو حصہ لیا تھا اس کی بناء پر یہاں کے علماء و مشائخ کی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ لیکن مولانا کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ انہوں نے حق کی خاطر بریلی سے لڑائی تو خیر لڑی ہی فرنگی محل سے بھی لڑائی لڑی۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ مولانا جوہر کے مرشد تھے اور مرشد و شیخ سے اختلاف و مخالفت کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اور مخلص احباب سے اختلاف بھی مشکل ہوتا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اپنے مرشد سے بھی اختلاف کیا اور اپنے مخلص احباب مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا نثار احمد کانپوری اور اپنے محسن، دیرینہ رابطہ نمود آباد سے بھی مخالفت مول لی۔ اور اپنے دعوے کو خوب صفائی اور معقولی سے پیش کیا اور ان کے موقف و مسلک کے دلائل کو پارہ پارہ کیا اور مذہبی اختلاف میں لوگ جہاں تک جاتے ہیں مولانا کے بارے میں لوگ وہاں تک گئے گالیاں دی گئیں۔ پٹوانے کا سامان کیا گیا۔ ہر طرح ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ قتل تک کے منصوبے بنے۔ لیکن مولانا جوہر تھے کہ اپنے مسلک و موقف پر کوہ جاں سے اڑے ہوئے تھے اور اس میں کسی قسم کی لچک لانے کے لیئے تیار نہ تھے۔ یہ ان کے اپنے اشعار ہیں اور ان کے مطابق ان کا عمل تھا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

پنجاب میں احرار کا گروہ بھی ان کا حامی تھا اور احرار کو بھی ان سب مراحل سے گزرنا پڑا جس سے جوہر گزرے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مولانا ظفر علی خان، مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا غلام رسول مہر نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

یہ سلسلہ بدستور چل رہا تھا اور افواہوں پر افواہیں اڑ رہی تھیں۔ یہاں تک افواہ گرم ہوئی کہ وہابی حکومت نے وہاں تمام مقابر و مآثر گرانے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گنبد خضرا بھی گرا دیا ہے۔ اس بات کے پھیلنے اور سننے پر مولانا جوہر کو شاہ ابن سعود سے اختلاف ہو گیا۔ شریف حسین کی مخالفت میں وہ شاہ ابن سعود کے ساتھ تھے۔ قبے اور مزارات گرانے پر شاہ ابن سعود کے مخالف ہو گئے۔ اس طرح احرار، مولانا آزاد اور مولانا جوہر میں اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں دہلی میں مجلس خلافت مجلس احرار اسلام قائم نہیں ہوئی تھی لیکن پنجاب کے جو زعماء شاہ ابن سعودؒ کے حامی تھے انکی اکثریت نے جماعت احرار قائم کی۔ (آٹھواں ایڈیشن)

اعزار اسلام کے تمام زعماء شریک تھے ، خلافت کمیٹی سے یہ تجویزیں منظور کرائیں کہ مکہ میں تمام عالم اسلام کی کانفرنس بلائی جائے اور اور اس میں یہ مسئلہ رکھا جائے اگر مؤتمر کا متفقہ فیصلہ ہو کہ مزاروں کی مرمت کرائی جائے تو شاہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کا فیصلہ مانے نیز یہ کہ حجاز پر ملوکیت نہ ہو۔ شاہ ابن سعود نے وعدہ کیا کہ وہ عالم اسلام کے نمائندوں کی بات مانیں گے۔ اور انہوں نے یہ بھی عذر کیا کہ مزارات کی شکست وغیرہ میرے حکم سے نہیں ہوئی بلکہ داخلہ فوج کے وقت اضطراراً ہو گئی۔

بہر حال اس قسم کی افواہوں کی بناء پر پورے عالم اسلام میں ایک کہرام برپا تھا۔ برصغیر ہندوستان میں بھی یہی کیفیت تھی جو شیلے ، جذباتی مفند بین کہتے تھے کہ یہ لوگ گشتنی اور قابل گردن زدنی ہیں شریف حسین کی ناکامی اور شاہ ابن سعود کی کامیابی سے چونکہ حکومت برطانیہ کے وقار و غلبہ کو کافی دھکا لگا تھا۔ لہذا اس کی حکمت عملی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ شاہ ابن سعود کی مخالفت زیادہ ہو اور عالم اسلام میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کا ابن سعود مقابلہ نہ کر سکے۔ اور اس کی فتح شکست میں تبدیل ہو جائے اور پھر اس کی جگہ اپنے خاص مہروں کو آگے لایا جائے۔ ابن سعود کے وعدہ پر مولانا محمد علی جوہر نے (جو اس کی حمایت سے ہٹ کر مخالفت پر آگئے تھے) یہ کہکر رفع نزاع کی کوشش کی کہ ابن سعود کو موقع دو کہ وہ اپنے وعدہ کا ایفا کر سکے۔ اسے مؤتمر اسلامی بلانے دو۔ وہاں جاکر اس سے مطالبہ کریں گے۔

اس دوران میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں مخالفین سعود نے برابر کئی جلسے کر کے مسلمانوں کو اس قدر مشتعل کر دیا تھا کہ شاہ کی حمایت میں جلسہ کرنا مشکل تھا۔ ایک ایسے ہی جلسہ میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مولانا آزاد کے خاص نیاز مند) کو تقریر کرنے کے دوران میں دھکے دئے گئے ایک بڑے آدمی نے کہا کہ اس کا سر قلم ہو تو ان کا جی خوش ہوگا۔ ایک جلسہ دونوں گروہوں کا مشترکہ قرار پایا مولانا محمد علی اس میں تقریر نہ کر سکے۔ ایک جلسہ اور ہوا اور اس کو خراب کرنے کی بیحد کوشش کی گئی۔ بقول رئیس احمد جعفری :-

> "تنے میں ہزاروں کی تعداد میں چماروں اور پاسیوں کا ایک لٹھ بند گروہ آیا۔ سینہ پر "خدام الحرمین" کے بلے لگے ہوئے تھے۔ وہ سب بدزبانیاں کرتے ہوئے آئے اور ہال اور پارک کو گھیر لیا اور داخلہ کی کوشش کی جس کی مدافعت کی گئی اور وہ داخل نہ ہو سکے" [2]

بالآخر یہ جلسہ بھی ملتوی ہو گیا۔ لیکن آخر مولانا نے قابو پا ہی لیا اور لکھنو کی اکثریت مولانا کی ہمنوا ہو گئی۔

خلافت کمیٹی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں اپنی پالیسی متعین کر دی کہ وہ یعنی خلافت کمیٹی حجاز پر ملوکیت اور شخصیت نہیں چاہتی نیز منہدم شدہ مقابر کی از سر نو مرمت کرائی جائے۔ تاکہ یہ ہنگامہ فرد ہو اور شاہ سعود کو عالم اسلام کی تائید و حمایت سے شریف حسین کے اثرات ختم کرنے کا موقع مل سکے......

---

[1] مخالفین سعود نے ایک جماعت بنائی تھی جس کا نام "خدام الحرمین" تھا [2] سیرت محمد علی ص ۴۲۲

لیکن کچھ عرصہ کے بعد خبر آئی کہ سلطان ابن سعود نے حجاز کے باشندوں کے مجبور کرنے پر بادشاہت قبول کرلی ہے ۔ مولانا نے "ہمدرد" میں اس خبر کو سیاہ حاشیہ لگا کر شائع کیا اور اس کے بعد وہ سلطان کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے ۔ لیکن اس مرحلہ پر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنجاب کی خلافت کمیٹی نے مولانا جوہر سے اختلاف کیا ۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہمارے پاس اخلاقی قوت تھی جس کے سہارے ہم اس کو بادشاہت سے روک سکتے تھے ۔ اب جبکہ اس نے اس اخلاقی دباؤ کو قبول نہیں کیا اور اپنی سلطانی کا اعلان کر دیا تو سوائے اس کے کیا کیا جا سکتا ہے کہ اپنی کوششیں برابر جاری رکھی جائیں لیکن ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جس کی وجہ سے شریف حسین جیسے لوگوں کو دوبارہ برسر اقتدار آنے کا موقع مل سکے ۔ یہ بجا کہ سلطان نے وعدہ خلافی کی لیکن وہ شریف حسین سے بدرجہا اچھا ہے ۔

مؤتمر عالم اسلامی

۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود نے عالم اسلام کی مؤتمر بلانے کا اعلان کیا اور تمام عالم اسلام کے نمائندے شاہ کی دعوت پر گئے شاہ نے مؤتمر کا افتتاح کیا مولانا محمد علی نے اس مؤتمر میں سلطان کو اس کے مواعید یاد دلائے اور پر زور الفاظ میں یہ بیان کیا کہ اسلام میں شورائیت ہے ملوکیت و قیصریت نہیں ۔ اور ہر وہ بات جو مولانا کے نزدیک حق و صواب تھی ۔ اس کا برملا اظہار کیا اور اس میں سلطان کے جلال و جبروت سے ذرا متاثر نہیں ہوئے ۔ اس مؤتمر میں خلافت کمیٹی کے وفد کی قیادت سید سلیمان ندوی نے کی علی برادران اس کے ممبر اور شعیب قریشی سیکرٹری تھے ۔ جمعیۃ علماء ہند کے وفد کی قیادت حضرت مولوی کفایت اللہ دہلوی ؒ نے کی ۔ علامہ بشیر احمد عثمانی بھی اس مؤتمر میں شریک ہوئے ۔ ان پر دو حضرات کی علمی و فقہی تقریروں نے پورے عالم اسلام کے نمائندوں کو متاثر کیا ۔

اسپیشل خلافت کانفرنس

پیچھے گذر چکا ہے کہ شدھی کی تحریک اور اس مقابلہ میں مسلمانوں کی جانب سے تبلیغی مہم کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور حالات ایسے ہو گئے تھے کہ گاندھی جی بھی اپنے آشرم میں "معتکف" ہو گئے تھے ۔ مہاسبھا کے لیڈر شدھی تحریک کی تائید و حمایت کر رہے تھے ۔ کانگریس کے ہندو زعماء ان حالات میں مہر بلب تھے ۔ لیکن ایک مولانا محمد علی اپنے مشن میں لگے ہوئے تھے اور برابر ہندو مسلم اتحاد کی بوٹ دئے جا رہے تھے ۔ یونٹی کانفرنسیں کیں ۔ اپنوں کی مخالفت مول لی ۔ ہندو لیڈروں سے اپنے در بدر سے گرے ہوئے الفاظ میں منت کی کہ ملک کی آزادی کے لیے اتحاد کی راہ اختیار کرو ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ مہر سکوت کو توڑ کر مہاسبھا کے لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش کریں ۔ لیکن کوئی ہندو لیڈر اپنی قوم کی مخالفت کے خوف کی بنا پر یہ جرأت نہ کر سکا کہ وہ مولانا محمد علی کی راہ اختیار کرے ۔ ان حالات میں مولانا محمد علی نے ہی یہ جرأت کی کہ وہ ڈاکٹر مونجے ۔ پنڈت مدن موہن مالوی ۔ اور دوسرے ایسے لیڈروں کے نفاق کا پردہ چاک کریں ۔ چنانچہ انہوں نے یہ فریضہ سر انجام دیا اور خوب انجام دیا ۔ ہندو پریس جو پہلے مولانا کی اتحاد پرور کوششوں پر سکوت اختیار کئے ہوئے تھا اب صرف اس قصور پر کہ وہ ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالوی کی نقاب کشائی کرنے لگے تھے ۔ مولانا کے خلاف زہر چکانی کرنے کے لیے پورے ساز و سامان سے مسلح ہو کر میدان میں آ گیا اس پر مجبور ہو کر مولانا نے خلافت کانفرنس کا اسپیشل اجلاس بلایا ۔

(بمبئی [illegible] ۱۹۲۶ء [illegible])

جو حکیم اجمل خاں کی تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا شوکت علی کی تائید سے مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اور اس میں مسلم زعماء نے بالاتفاق اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور کہا گیا کہ آزادی کی خاطر ہم ہندو دوستوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو دوست کا ہاتھ سمجھیں جو مصافحہ کے لیے بڑھتا ہے یا ایک پہلوان کا جو اکھاڑے میں اتر کر اپنے حریف پہلوان کی طرف بڑھاتا ہے —— اس کانفرنس کے بعد مولانا جوہر وفد حجاز میں شامل ہو کر دہلی سے عرب کو روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ :-

”یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلاء و آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقعہ دیں میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر وہ چھری اٹھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔“

آل پارٹیز کانفرنس

مولانا محمد علی جوہر عمر کے لحاظ سے اب اس دور میں ہیں۔ جب کہ انسان کے قویٰ مضمحل اور کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو دو تین مستقل عارضے تھے۔ خانگی پریشانیاں تھیں۔ ان حالات کے باوجود وہ اپنے مشن میں برابر کوشاں تھے۔ لیکن ہندو مسلم فسادات اور اتحاد کو نقصان پہنچانے والے حوصلہ شکن واقعات و حالات نے مولانا کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ لیکن آپ نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ مولانا اور مولانا کے ہم خیال ساتھیوں نے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ آل پارٹیز کانفرنس بلائی جائے۔ جس میں ملک کی تمام قابلِ ذکر جماعتوں کے زعماء شریک ہوں۔ یہ کوششیں ہوتی رہیں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہر طرف سے حوصلہ شکنی ہوئی۔ مسٹر گاندھی ابھی تک اپنے اسی آشرم میں معتکف ہیں اور تقریباً مایوس ہو چکے ہیں۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد ہر مرحلے پر نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ پورے ہندوستان میں مولانا جوہر اور مولانا آزاد دو شخص ایسے ہیں جو روح فرسا حالات کے باوجود نہ مایوس ہوئے اور نہ کام کرنا چھوڑا۔ اگرچہ دونو بزرگوں کے کام کرنے میں تھوڑا بہت فرق رہا۔ لیکن مشن دونو کا ایک رہا۔ شملہ یونٹی کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی ملتوی ہوگئی۔ اور اس کو ملتوی کرنے کے لیے بہانہ بنانے والوں نے یہ بہانہ بنایا کہ حالات ابھی سازگار نہیں ہیں۔

سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن آیا۔ اور اس کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان نے گذشتہ اصلاحات سے کتنا فائدہ اٹھایا اور آئندہ جدید اصلاحات کیا کی جائیں مطلب یہ کہ انگریز ہندوستان کو اصلاحات وغیرہ کے چکر میں رکھنا چاہتے تھے بقول رئیس احمد جعفری :-

”ہندوستان کو پھر ”مجلس آئین و اصلاح و رعایت حقوق“ کا شیریں مگر ”خواب آور“ شربت پلا دیا جائے تاکہ ایک عرصہ دراز تک یہ مرغ زرین بال اسیر دام رہے“

کانگریس نے اس کمیشن کا مکمل طور پر بائیکاٹ کیا لبرل حضرات جو اب تک تذبذب میں تھے وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیے حتیٰ کہ تعلقدار قسم کے لوگ مہاراجہ محمود آباد اور راجہ کالا کانکر بھی اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ حکومت نے جب

بائیں اور مشورے کرکے بمبئی سے روانہ ہوکر پیرس پہنچ کر ڈاکٹروں سے ضروری معلومات اور طریقہ علاج دریافت کیا چونکہ علاج ابھی شروع نہ ہوا تھا لہٰذا کھانے پینے کے معاملے میں خوب بدپرہیزی کی ——— اور پھر ایک ڈاکٹر سے علاج شروع کیا - ذیابیطس میں اگر پھوڑے پھنسیاں نکلنا شروع ہوجائیں تو ہلاکت کا سبب بنتی ہیں - کیونکہ شوگر کی کمی کی وجہ سے زخم بھرتے نہیں آپ کے دنبالہ نکل آیا تھا - لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور آپ صحتیاب ہونا شروع ہوگئے - لیکن مولانا اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے کیونکہ اسی عمر، اسی مرض اور اسی حالت میں ان کے چچازاد بھائی اور خسر کا انتقال ہوا تھا - اور اسی مایوسی کی بناء پر آپ نے بیگم اور مولانا شوکت علی کو بلا بھیجا کہ اگر وہ پہنچ جائیں تو آخری دیدار ہوجائے - وہاں رہنے والے اعزا کو نماز جنازہ بھی سکھادی کہ میری نماز جنازہ اس طرح پڑھانا - لیکن اللہ کو ابھی منظور نہ تھا - آپ کی اکثر شکایات رفع ہوگئیں - اگر چند دن اور ٹھہر کر علاج کراتے تو مکمل صحتیاب ہوجاتے - لیکن ہوا یہ کہ ملک میں نہرو رپورٹ کے شائع ہونے پر جو سخت اختلاف ہوا اس نے آپ کو مجبور کردیا کہ فوراً وطن واپس ہوں - آپ اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زار و نزار حالت میں ممالک عربیہ کے راستے عازم وطن ہوگئے -

نہرو رپورٹ

دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس کے التوا پر فیصلہ ہوا تھا کہ مئی کے آخر میں بمبئی میں ایک بار پھر اس کا اجلاس بلایا جائے - چنانچہ اجلاس بلایا گیا - لیکن اس میں ملک کی جماعتوں نے حصہ نہ لیا - اور صرف گاندھی جی - موتی لال نہرو - ڈاکٹر انصاری - مسز اینی بسنٹ اور مولانا شوکت علی شریک ہوئے - گاندھی جی نے پھر تجویز التوا پیش کردی اور کہا کہ ایک کمیٹی بنادی جائے جو لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب تیار کرے اور ایسا دستور اساسی وضع کرے جس پر سارے طبقے متحد و متفق ہوسکیں - مولانا شوکت علی اس کی زبردست تائید کی - چنانچہ ایک کمیٹی بنادی گئی جس کے صدر موتی لال نہرو اور ارکان میں مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے - مسٹر جیکر - سبھاش چندر بوس اور سردار منگل سنگھ شامل تھے - اس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی اس کے تیار ہونے پر "آل پارٹیز کانفرنس" لکھنؤ طلب کی گئی اور خلاف توقع اس میں اکثر جماعتوں کے مندوبین شامل ہوئے ——— ہندو مہاسبھا کے اقانیم ثلاثہ لالہ لاجپت رائے، پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے بھی ان میں شامل تھے - اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں شروع ہوا - پہلے اجلاس میں رپورٹ تیار کرنے والوں کی محنت و عرق ریزی پر انہیں مبارکباد دی گئی - اور دوسرے اجلاس میں یہ رپورٹ جو "نہرو رپورٹ" کے نام سے مشہور ہوئی منظوری کی غرض سے پیش ہوئی - رپورٹ جب پڑھ کر سنائی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں مسلمانوں سے پورا انصاف نہیں کیا گیا - مولانا شوکت علی نے ان تجاویز سے اختلاف کیا اور ماننے سے انکار کردیا[1] ——— مولانا محمد علی جب یورپ سے واپس آئے تو انہوں نے بھی اختلاف کیا اور ہندوستان پھر ایک دفعہ معرکہ کارزار بن گیا - تمام ہندوؤں نے رپورٹ کی تائید کی - مگر مسلمانوں میں دو پارٹیاں بن گئیں (اس آل پارٹیز کانفرنس میں) نہرو رپورٹ کی حمایت میں کانگریس تھی - لبرل حضرات تھے - ہندو مہاسبھا تھی - مسلمانوں کی ایک جماعت تھی - گاندھی جی جو اب تک خاموش تھے اس مرحلے پر نہرو رپورٹ کے منظور ہونے پر وہ اس کے حامی ہوگئے - مولانا محمد علی، شوکت علی جنہوں نے ہر مرحلے پر کانگریس کا ساتھ دیا تھا اور اپنوں کی گالیاں سنی تھیں اب" اختلاف کو کانگریس نے پرکاہ کی حیثیت بھی نہ دی اور ان کی بات سننے سے انکار کردیا -

---

[1] نہرو رپورٹ کے مندرجات کیا تھے؟ اس کی تفصیل ہم یہاں پیش کرنے سے قاصر ہیں کہ کتاب ضرورت سے زیادہ بڑھ رہی ہے -

کلکتہ کانگریس

۱۹۲۸ء میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس کی تیاریاں کلکتہ کے لیے شروع ہوئیں۔ کانگریس کے اجلاس کے صدر موتی لال نہرو، مسلم لیگ کے مہاراجہ محمود آباد اور خلافت کے مولانا محمد علی مقرر ہوئے مسلمانوں کی مسلسل چیخ و پکار پر صدر کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ اس زمانہ میں ایک نیشنل کنونشن کا اجلاس بلا کر تمام اختلافات رفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ کنونشن میں تمام جماعتوں کو نمائندے منتخب کر کے بھیجنے کی اجازت دی گئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علماء ہند نے متفقہ طور پر مولانا جوہر کو اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا۔ سب سے پہلے مباحثہ ڈومینین اسٹیٹس کے اصول پر ہوا کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ۔ سین گپتا نے اس کی حمایت میں تقریر کی اور کہا کہ اسے درمیانی منزل سمجھ کر قبول کر دیا جائے اور مکمل آزادی کی طرف قدم بڑھایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا جوہر نے تقریر کی اور اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے آزادی کامل کی حمایت کی اور کہا کہ کانگریس نے گذشتہ سال آزادی کامل کی جو تجویز پاس کی ہے اسے ہرگز فراموش نہ کیا جائے اور تقریر کی رو میں یہ بھی منہ سے نکل گیا کہ "جو لوگ آزادی کامل کے مخالف اور درجہ مستعمرات کے حامی ہیں وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل ہیں" اس پر ایک شور اٹھا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ "محمد علی بیٹھ جاؤ" "ہم نہیں سننا چاہتے" مگر مولانا نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس کے بعد اور تقریریں ہوئیں جن میں سے اکثر درجہ مستعمرات کی حمایت میں تھیں۔ مباحثہ ابھی جاری تھا کہ مغرب کا وقت آگیا مولانا نماز پڑھنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ درجہ مستعمرات پاس ہو گیا۔ اور بحث ختم ہو گئی۔ مولانا نے انا للہ پڑھا اور الٹے پاؤں واپس آگئے —— اس کے بعد ہالیڈے پارک میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں مولانا نے زبردست تقریر کی۔ سفر یورپ کے حالات بیان کئے۔ ممالک اسلامیہ کے تاثرات پیش کئے۔ اس کے بعد سیاسیات وطنی نہرو رپورٹ وغیرہ پر مفصل تبصرہ کیا اور کانگریس سے اپنی علیحدگی کے اسباب بتائے۔ اور فرمایا کہ اب ہم اس وقت تک کانگریس سے تعاون نہ کریں گے جب تک کہ وہ ... "تجاویز دہلی" منظور نہیں کر لیتی —— قائد اعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس تک نہرو رپورٹ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ مسٹر چھاگلا نے نہرو رپورٹ کی زبردست حمایت کی تھی (مسٹر چھاگلا مسلم لیگ کے سرکردہ رکن تھے)، مہاراجہ محمود آباد بھی بہت حامی تھے۔ اور وہ مولانا جوہر کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر اس لئے کامیاب ہوئے کہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں سے منوا سکیں۔ سر علی امام بھی نہرو رپورٹ کے حامی تھے۔ اب ان سب حامیوں نے مل کر قائد اعظم کی سرکردگی میں "نیشنل کنونشن" کے آخری اجلاس میں شرکت کی کہ تجاویز دہلی کنونشن کے سامنے منظوری کے لیے پیش کریں۔ قائد اعظم نے اپنے موقف پر زبردست تقریر کی، اور محنت و اخوت کے نام پر اپیل کی کہ ان تجاویز پر غور کر کے انہیں منظور کر کے اختلافات کا خاتمہ کر دیجیے کہ اس وقت قوم کی ضروریات کا تقاضہ یہی ہے —— آپ کے بعد مسٹر جیکر (مہاسبھائی لیڈر) نے تقریر کی جب ووٹنگ ہوئی تو قائد اعظم کو شکست اور جیکر کو فتح ہوئی۔ سر تیج بہادر سپرو نے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو مگر ان کی ایک نہ چلی اور تجاویز دہلی منظور نہ ہو سکیں۔[1]

آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی

کانگریس اور کنونشن وغیرہ سے جب مولانا جوہر مایوس ہو گئے تو انہوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس بلائی جائے۔ جس میں تمام مسلم جماعتوں کے نمائندے مل کر ایک لائحہ عمل مرتب کریں اور اب اس کے سوا مولانا کے لیے اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کیونکہ کانگریس میں ان کی اس درجہ مخالفت ہو گئی تھی کہ کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں جب مجلس عاملہ کے رکن کا انتخاب ہو رہا تھا تو مدراس کے ایک ممبر نے مولانا کا نام بھی پیش کر دیا۔ اس پر اجلاس میں "ہاں نہیں، نہیں" کے شور نے گرمی محفل کا سامان پیدا کر دیا —— ان حالات کے بعد دہلی میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس سر آغا خاں کی صدارت میں شروع ہوئی۔ کونسلوں، اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ

کے علاوہ مسلم لیگ ۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند کے سربرآوردہ ارکان نے شرکت فرمائی ۔ سر شفیع نے دعویٰ کیا کہ یہ کانفرنس پوری نمائندہ ہے اور بات بھی ٹھیک تھی جس کانفرنس میں علی برادران اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان شریک ہوں ۔ سر شفیع جیسے لوگ بھی موجود ہوں اور سر آغا خاں کی صدارت ہو وہ کانفرنس یقیناً نمایندہ کانفرنس ہوگی ۔ رئیس احمد جعفری کے الفاظ میں :-

" کانفرنس میں سب سے بڑا مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کانفرنس کا نصب العین کیا ہو ! سر شفیع اور ان کے ہمنوا حضرات کا جہاں تک تعلق تھا وہ تو اس پر بھی راضی ہو سکتے تھے کہ " ڈومینین اسٹیٹس " بھی نہ رکھا جائے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کم از کم درجۂ مستعمرات کے طلبگار ضرور تھے ان کے ذوق کی رعایت بھی ضروری تھی اور ایسا ممکن بھی تھا لیکن سب سے زبردست مرحلہ یہ تھا کہ محمد علی مکمل آزادی کے علمبردار تھے اور یہ وہ چیز تھی جسے کانفرنس میں بطور نصب العین پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی تو سر آغا خاں دہلی میں نہ نظر آتے نہ سر شفیع کی یہ سرگرمیاں ظاہر ہوتیں نہ مسلم لیگ کے سیاستدان بزرگ اس پلیٹ فارم پر تشریف رکھ سکتے تھے ۔ اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ محمد علی اس " درمیانی راستہ " کو قبول کر سکتے یہ ایک ایسا مسئلہ آن پڑا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں کانفرنس ہی نہ ختم ہو جائے " [۱]

آخر یہ طے پایا کہ کانفرنس آزادی کے بارے میں کوئی نصب العین مقرر نہ کرے جو جماعتیں یہاں اکٹھی ہوئی ہیں وہ اس بارے میں اپنے اپنے نظریہ کے مطابق کام کریں اگر خلافت اور جمعیۃ علماء ہند مکمل آزادی کی علمبردار ہیں تو وہ اس کے لیے کوشش کریں اگر دوسری جماعتیں کسی اور نصب العین کو اپنانا چاہیں تو وہ اس کو اختیار کریں ۔ یہاں صرف مسلمانوں کے حقوق و مفادات اور ان کے موجودہ سیاسی لائحہ عمل کے لیے کوئی مشترکہ پروگرام بنا لیا جائے چنانچہ پھر اس نکتہ کو سامنے رکھ کر اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی ۔ اور ایسی مشترکہ جد و جہد کے لیے مولانا جوہر تیار ہو گئے ۔ اور ایک مشترکہ تجویز منظور ہوئی جس کی تفصیل " سیرت محمد علی مولفہ رئیس احمد جعفری " میں دیکھی جا سکتی ہے ۔ یہ تجویز سر شفیع نے پیش کی ۔ مولانا عبد الماجد بدایونی ۔ مفتی کفایت اللہ ۔ مولانا محمد علی جوہر ۔ ڈاکٹر اقبال ۔ سیٹھ یعقوب ۔ حاجی عبد اللہ ہارون اور شفیع داؤدی نے تائید کی

مولانا جوہر کی تائید

مولانا جوہر نے تائیدی تقریر کرتے ہوئے کہا :-

میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو میں اسے قبول کر لونگا میں

(حاشیہ گذشتہ صفحہ) تجاویز دہلی مختصراً یہ تھیں : اکثریت کو کسی جگہ اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے ۔ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں ہے بلکہ عددی ہے اس لیے ان میں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں ۔ ان کی اکثریت کو نقصان نہ پہنچایا جائے ۔ دوسرے ۔ دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انہیں رعایتیں دی جائیں ۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے وہ ہندو اقلیت کو اسی طرح کی مراعات سے مستفید ہوں کریں ۔ مرکزی اسمبلی میں ان کی ۳۳ فیصد نمایندگی ہوگی ۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دی جائیں صوبہ سندھ کو مستقل اور جداگانہ صوبہ بنایا جائے ۔ بلوچستان کو الگ صوبہ بنایا جائے وغیرہ وغیرہ (سیرت محمد علی صفحہ ۴۹۰)

[۱] سیرت محمد علی صفحہ ۳۶۵ - ۵۲۷

اس مسلمان کو بزدل سمجھتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوگی' میں اس اندیشہ کو اہمیت نہیں دیتا میرے نزدیک ایک سچا مسلمان دس آدمیوں پر بھاری ہوتا ہے کیا جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمانوں کی تعداد قلیل نہ تھی لیکن کامیابی و کامرانی کس کو حاصل ہوئی؟ مسلمانوں کو! میری خواہش یہ ہے کہ مصالحت ہو' امن ہو' اتحاد ہو' میری تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن و اتحاد کا حامی ہوں۔" (سیرت محمد علی صفحہ ۵۲۳)

مولانا کانگریس سے نکل چکے ہیں۔ کانگریس کے لیڈران سے بیزار ہیں لیکن اس کے باوجود مولانا شریف دشمن کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اور جس کام کے لیے انہوں نے اپنی ساری زندگی جدوجہد کی تھی۔ ابھی تک اسی موقف پر قائم ہیں۔ اور پھر کس جذبۂ ایمانی سے "مسلمان بہادر ہوتا ہے" کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ "پیش لفظ" کے مفہوم کے مطابق مولانا جوہرؒ۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ہر مسلمان کو اپنے آئینہ میں دیکھتے تھے اور حضرت تھانویؒ۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مسلمانوں کو حالات کے آئینہ میں بیرون کی ملی کمزوریوں کو دیکھتے تھے۔ اور یہی وجہ نظریہ آزادی میں اختلاف کا باعث ہوئی

مفتی کفایت اللہ صاحب کی تائید

"میں جس ریزولیوشن کی تائید کے لیے حاضر ہوا ہوں وہ ایک نہایت اہم ریزولیوشن ہے اور یہ ریزولیوشن ایک ایسے جلسے کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ ہے اس میں ہر خیال اور ہر طبقے کے مسلمان شریک ہیں۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو تسلیم کیا ہے اگر کوئی شخص ایسا کہے تو اس کا کہنا غلط ہوگا اور یہ طرز عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کیا کرے۔ میں جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں" (سیرت محمد علی ص ۵۲۳-۵۲۲)

جنوبی افریقہ

مولانا جوہر نہ صرف ہندوستان کے محبوب راہنما تھے بلکہ بیرون ملک جہاں کہیں ہندوستانی موجود تھے اور عالم اسلام میں ان کی قیادت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی باشندوں کی عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً پے درپے دعوتیں آئیں کہ آپ تشریف لائیں۔ آپ نے اس خیال سے کہ تبدیلی آب و ہوا کا صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا اور وہاں کے لوگوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی جانے کا ارادہ کر لیا اور اپنے احباب کو اطلاع دے دی۔ پہلے مولانا شوکت علی کو روانہ کیا بعد میں بیگم کے ہمراہ خود جانے کی تیاری تھی بمبئی پہنچ کر ٹکٹ لے لیا سامان بندھ گیا کہ جنوبی افریقہ کے گورنر نے شرط لگائی کہ داخلہ اسی وقت ممکن ہے جب چند پونڈ بطور ضمانت جمع کرائیں۔ مولانا یہ اہانت آمیز شرط کیسے قبول کر سکتے تھے آپ نے یہ شرط قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور گورنر کو تار دیا کہ اس قسم کی مہمل شرط کے بغیر اجازت دی جائے اور ایک عجیب تار دیا لیکن گورنر نے شرط بحال رکھی۔ اس کے بعد مولانا نے ایک تار وائسرائے کو اور ایک تار سر فضل حسین ممبر حکومت کو دیا لیکن حکومت ہند نے کسی قسم کی مداخلت سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس کے بعد مولانا نے جنوبی افریقہ کے گورنر کو آخری تار دیا جو پڑھنے کے قابل ہے:۔

"ہندوستان کی حکومت کو یہ سبق دینے پر کہ دوستانہ معروضات سے کس قدر توقع ہو سکتی ہے۔

قائم مقام وائسرائے نے قانون کو منسوخ کرنے سے معذوری ظاہر کی حالانکہ وائسرائے اگر چاہے تو وہ بغیر کسی تحریک کے بھی ویٹو استعمال کر سکتا تھا۔

لارڈ ارون سے ملاقات

کچھ عرصہ کے بعد لارڈ ارون واپس آئے تو مولانا نے ان سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ یہ بل مداخلت فی الدین ہے۔ وائسرائے نے جو جواب دیا وہ وہی ہے جس کو آج تک مغربی تہذیب و تمدن کے دلدادہ دہراتے چلے آرہے ہیں گویا "زبان میری ہے بات ان کی" —— وائسرائے نے کہا:

"کہ مذہب و معاشرت کی حدود جہاں متصادم ہوں وہاں ایک مہذب اور متمدن حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرت کا خیال رکھے"

مولانا محمد علی اس جواب سے برہم ہوگئے اور آپ نے فرمایا کہ ہم آپ کے قطعاً ہمنوا نہیں ہو سکتے ہماری آپ کی ہتک ہے میں جاتے ہی اس قانون کی خلاف ورزی کروں گا اور لوگوں کو بھی اس پر آمادہ کروں گا۔ اس تقریر اور چیلنج سے مولانا کے سرکاری رفقاء کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ وائسرائے نے یہ کہا کہ جو کچھ کیجئے اور کیجئے قانون کے اندر رہ کر کیجئے —— لیکن مولانا نے جواب دیا کہ:-

"مذہب کے معاملہ میں قانون اور آئین میرے سنگِ راہ نہیں بن سکتے اگر ضرورت ہوگی تو میں مذہب کے لیے قانون شکن بن سکتا ہوں اس لیے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا"

اس طرح وائسرائے سے گرما گرم بحث کر کے مولانا نے واپس آکر اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اور پورے ہندوستان میں حق پسند علماء نے اس بارے میں قانون شکنی شروع کر دی تھی۔ مسلمان اس جدوجہد میں کامیاب ہوئے اور وہ بل منسوخ کر دیا گیا۔ لیکن مولانا جوہر اس تنسیخ سے قبل واصل بحق ہوگئے۔

لاہور کا قومی ہفتہ

دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس اور خلافت کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ملک کی آزادی کامل کے مطالبہ کی قرارداد پاس ہونے والی تھی اور دریائے راوی کے کنارے آزادی کامل کا پرچم لہرایا جانے والا تھا۔ —— مولانا جوہر نے گاندھی جی سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا تاکہ آخری بار ان سے مسلمانوں کے حقوق و مراعات کی بات چیت کی جا سکے چنانچہ یہ ملاقات ہوئی مولانا نے گاندھی جی سے کہا کہ اگر آپ ہمارے مطالبات منظور کر لیں تو پھر تمام مسلمان کانگریس کے شانہ بشانہ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔ گاندھی جی نے کہا کہ غیر مشروط پر شامل ہو جاؤ آزادی ملنے کے بعد یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی۔ اور حقوق کی تقسیم ہوگی۔ لیکن ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ مولانا یہ سن کر مایوس ہوگئے۔ اور انہوں نے کوشش شروع کر دی کہ تمام مسلمان مل کر کوئی لائحہ عمل مرتب کریں —— لاہور ان دنوں قومی ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ اس ہفتے کے دوران بہت کوشش کی گئی کہ روٹھے ہوئے محمد علی کو منایا جائے لیکن مولانا کی جو شرط تھی وہ ان کے لیے ناقابل قبول تھی اور مولانا غیر مشروط پر اب ساتھ ملنے کے لیے تیار نہ تھے۔

گول میز کانفرنس

۱۹۳۰ء میں گاندھی ارون پیکٹ ہوا اور طے پایا کہ لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ہندوستان کے بڑے زعما شریک ہوں۔ مولانا محمد علی جوہر کا نام اس کانفرنس کے ممبروں کی فہرست میں آنا چاہیئے تھا لیکن مختلف گروہوں اور دہلی کے ایک مشہور معاند کی پیہم کوششیں جاری رہیں کہ مولانا اس کے

لیے منتخب نہ ہوں۔ لیکن وہ گول میز کانفرنس کیا ہوتی جس میں مولانا ممبر نہ ہوتے۔ بالآخر مولانا گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے نامزد کر دیے گئے اور آپ شروع اکتوبر بمبئی سے جہاز میں بیٹھ کر برطانیہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا ان دنوں بے حد علیل اور نہایت کمزور تھے۔ برطانیہ کا سفر تو بہت طویل تھا۔ اندرون ملک کسی چھوٹے سفر کے بھی متحمل نہ ہو سکتے تھے لیکن ملک و قوم کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مولانا وہاں جا کر کس قدر مصروف رہے ہوں گے۔ مستعدی اور کارگزاری کی انتہا کر دی اخبارات کے ایڈیٹروں۔ وزراء۔ امراء اور سیاسی لیڈروں سے طویل طویل ملاقاتیں کیں۔ اور جب چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تو پھر چارپائی پر لیٹے لیٹے ٹیلی فون کرتے رہے۔

شیر کی آخری گرج

مولانا کے ضعف و نقاہت کا حال معلوم ہو چکا ہے اتنی قوت نہ تھی کہ کھڑے ہو کر تقریر کر سکیں لہٰذا گول میز کانفرنس میں بیٹھے بیٹھے جو تقریر کی اس کے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

ڈیلی ہیرلڈ کا جواب

"جب میں اس ملک میں پہنچا تو یہاں کے ایک اخبار ڈیلی ہیرلڈ نے جس کے استحکام میں میں نے بھی حصہ لیا تھا میری تصویر شائع کی اور میری نسبت لکھا کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا ہے"۔

"میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں۔ جنہوں نے مجھے قید کیا تھا میں سامی نسل سے تعلق رکھتا ہوں اور اگر لارڈ ریڈنگ نے صیہونیت سے برگشتگی اختیار نہیں کی (قہقہہ) تو میں نے بھی اسلام کو ترک نہیں کیا۔ میں جہاں پہلے تھا وہیں اس وقت تک ہوں"۔

ضرورت ہے ایک انسان کی

میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ آپ ہمارے لیے کون سا دستور سیاسی تیار کرتے ہیں لیکن کاش! آپ کے پاس انگلستان میں ایک آدمی بھی ہو (یہاں آپ نے مشہور برطانوی مدبر لارڈ برک کے الفاظ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔ تجاویز کی ضرورت نہیں آدمیوں کی ضرورت ہے) جو درحقیقت انسان ہو اور جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے 'اے خدا! ایسا انسان دے جو دل و دماغ اور ہاتھ رکھتا ہو وہ ان بعض بڑے آدمیوں کی طرح ہو جو ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں ایک شور و غوغا سے لبریز سرزمین میں ایک طاقتور آدمی کی ضرورت ہے وہ خواہ امیر ہو، خود مختار ہو، جمہوریت پسند ہو، کچھ بھی ہو، مگر ایسا ہونا چاہیے جو حکومت کر سکے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے"۔ مجھے امید ہے کہ میرے قدیم دوست مسٹر میکڈانلڈ کم از کم اپنے تئیں اس حکمران آدمی کو ثابت کر دکھائیں گے اور وہ اپنی جماعت اپنے ضمیر اپنی مردہ بیوی کی روح اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گے"۔

آزادی یا موت

آج جس ایک مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤنگا، میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی (نعرۂ تحسین)

مؤرخِ اسلام حضرت مولانا سید محمد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء — ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء

تھے کہ انہوں نے ایک بار ان الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا:

"یہ (تقویۃ الایمان) پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں۔ اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسوں آندھیاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علمِ کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی اور ابنِ رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ قائم رہی۔"

باقاعدہ تعلیم

سید صاحب اپنے برادر بزرگ سے ابتدائی تعلیم اور بنیادی تربیت پا کر اپنے والد ماجد کے پاس اسلام پور پہنچے۔ کچھ کتابیں یہاں رہ کر ختم کیں۔ اس کے بعد پھلواری (پٹنہ) کی خانقاہِ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہِ پھلواری) سے کچھ اور کتابوں کی تکمیل فرمائی۔

اس ماحول میں ان کی توحید پسندی کے بعض قابلِ ذکر واقعات دیکھنے میں آئے کہ وہ اس دوران خانقاہ کی بعض غیر شرعی رسوم اور ہفتہ دار زائروں سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ یہاں کے بارے میں ایک بار انہوں نے یہ بات اپنے ایک ارادت مند کو بتائی:

"جو رنگ بھائی صاحب کی مجالس میں چڑھ چکا تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ طبیعت کو یہاں کے رسوم سے ذرا بھی مناسبت نہ ہو سکی۔"

پھلواری کے بعد سید صاحب کو مدرسہ امدادیہ (دربھنگہ) بھیج دیا گیا۔ جہاں انہوں نے ایک سال تک رہ کر درسِ نظامیہ کی بعض اور کتابیں ختم فرمائیں۔

سید صاحب عہدِ طفولیت کے ایام میں بھی نہایت متین اور خاموش طبیعت تھے۔ مولینا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اُن کے ایک ہم درس مولوی سید محمد حنیف کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"ایامِ طفلی ہی سے فطرتاً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے۔ بچوں کی عام شرارتوں سے اُن کی طبیعت کو جبلتہً کسی قسم کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ اِس لئے شرارت وغیرہ کے قصّوں میں سید الملت تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے۔"

اُن کے بارے میں اُن کے ایک اور ہم درس اور بے تکلف ساتھی مولوی جواد علی خان کہتے ہیں:

"اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کبھی کلام یا لب و لہجہ سخت نہ ہوتا۔ درسی کتابوں کی تکرار میں لب و لہجہ البتہ زوردار ہوتا۔ اور بیان کی قوت و روانی سے شرکا کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا۔ متانت ہر انداز پر غالب رہتی کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے۔ بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے۔ اس میں بھی متانت قائم رہتی۔ کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے مگر زبان پر قابو رہتا۔"

سید صاحب کے گھر کا ماحول تربیت کے سلسلے میں کچھ مسنون پابندیوں کا حامل تھا۔ ان کے اطوار و عادات کی سنجیدگی میں اس ماحول کا بھی کافی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

ایک روز جب وہ اپنے والدِ ماجد کے ساتھ دسترخوان پر کھانے میں مشغول تھے تو کھانا چباتے ہوئے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ اُن کے والد نے بے ساختہ ایک چپت رسید کر دی اور کہا کہ آدمی کے بچوں کو آدمی کے بچوں کی طرح کھانا کھانا چاہیے۔ کھاتے ہوئے منہ سے آواز تو کتے نکالتے ہیں۔

علامہ شبلی کی جانشینی

نومبر ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ علامہ شبلی کا وقت آخر نزدیک سے نزدیک تر آگیا۔ انہوں نے سید صاحب کو تار دے کر پونا سے طلب فرمایا اور ہمیشہ کے لئے اپنے لب اور آنکھیں بند کرنے سے پہلے انہیں نہایت شفقت و محبت سے اپنی زیر تکمیل علمی مہمات بالخصوص سیرت النبی ﷺ کو مکمل کرنے کی وصیت فرمائی اور یہ عہد مستحکم کر کے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو اس بزم رنگ و بو کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس دنیائے پائدار کی طرف رحلت فرما گئے۔

اب علامہ شبلی کی مسند خالی تھی۔ مگر کس کا حوصلہ تھا کہ اس شہ نشین کی طرف بڑھنے کی جرأت کرتا۔ اگرچہ سید صاحب موصوف ہر اعتبار سے اس منصب بلند کے اہل تھے لیکن انہی کو سب سے زیادہ استاد کی عظمت و فضیلت اور اُن کی مسند کے احترام و وقار کا خیال تھا۔ آخر علامہ شبلی مرحوم کے وابستگانِ ارادت نے متفقہ طور پر استادِ مرحوم کی جانشینی کا تاج سید صاحب کے سر پر رکھا اور اس طرح گویا سید صاحب کی علمیت اور فضیلت کا برملا اعتراف کر لیا۔ یہ جون ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت سید صاحب دکن کالج پونا سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ پہنچ چکے تھے۔

دارالمصنفین کی بُنیاد

جب سید سلیمان ندوی اعظم گڑھ تشریف لائے تو یہاں ابھی تک "دارالمصنفین" کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ کوئی ایک سال پہلے علامہ شبلی مرحوم نے اس کا خاکہ ضرور تیار فرمایا تھا لیکن یہ ایک تصور ہی تھا جس کا ابھی تک کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ صرف اور صرف سید صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک روز شبلی مرحوم کا خواب شرمندۂ تعبیر و تعمیر ہو گیا اور پھر اسے ترقی دینے کے سلسلے میں انہوں نے اپنے قلب و دماغ کی جملہ صلاحیتوں کو اس طرح مرکوز کر دیا کہ کچھ ہی عرصہ بعد علمی دنیا میں "دارالمصنفین" اور اس کی علمی خدمات کا شہرہ دور و نزدیک پھیل گیا۔

سیاسیات سے گریز

"دارالمصنفین" کے قیام کے بعد سید صاحب کے روز و شب پہلے سے بھی بڑھ کر علمی مشاغل میں صرف ہونے لگے۔ اس دور میں کچھ موقعوں پر بعض قومی رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً انہیں سیاسی سرگرمیوں کی طرف دعوت دی۔ لیکن سید صاحب حتی الامکان خارزارِ سیاست میں اُترنے سے اجتناب کرتے رہے۔ ورنہ اگر وہ سیاست کے میدان میں کبھی پوری طرح داخل ہو جاتے تو شاید ملک و قوم کی سیاسی رہنمائی میں بھی وہ چوٹی کا مقام حاصل کر لیتے۔ سیاسی سرگرمیوں سے بہت حد تک الگ تھلگ رہنے کی خواہش و کوشش کے باوجود اُن کے اکثر ہم عصر ان کی سیاسی بصیرت و فراست کے قائل و معترف تھے۔

ایک بار مہاتما گاندھی نے ان کے بارے میں کہا تھا۔

"یہ مہا چاتر مولوی ہے"۔

کچھ مسلمان سیاست والوں نے بھی بعض موقعوں پر سید صاحب کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ اپنا دامن چھڑا لیتے رہے۔ سید صاحب نے ایک موقع پر سیاست کے بارے میں خود کہا تھا۔

"میں نے کبھی یہ خود ٹوپی خود نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی (جوہر) نے پہنا دیا اور کبھی شوکت علی نے۔ اور جب کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اُتار پھینکا"۔

سیاسیات سے اس گریز کا سبب انہوں نے خود ایک بار ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا۔

"ڈپلومیسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانت دار مانا جائے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانت دار سمجھا جائے۔ پھر اگر اس کی بد دیانتی ثابت

ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کیا جائے۔"

سید صاحب اسی بنا پر عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرتے رہے اور اگر مجبور ہو کر اس میں حصہ لینا بھی پڑا تو وہ زیادہ سے زیادہ مشورہ اور رائے کی حد تک تعاون کرتے تھے۔ اپنے اس مسلک کے بارے میں انہوں نے ازراہِ مزاح فرمایا تھا کہ

"بھئی! مجھے چیمبر پریکٹس تو آتی ہے، پبلک پریکٹس نہیں آتی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب سیاست کے اس مفہوم اور طریق کار سے گریز کرتے تھے جس میں فریب اور بددیانتی کا شائبہ ہوتا ہے۔ ورنہ انہوں نے اپنی زندگی میں بعض ایسے کارہائے نمایاں بھی انجام دیئے جنہیں ہم ان کی شاندار ملکی و قومی خدمات قرار دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند واقعات درج ذیل ہیں۔

- سید صاحب نے ۱۹۱۷ء میں مجلسِ علمائے بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرمائی اور اس میں انگریزی حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود ایسا جرأت آموز خطبہ دیا جس سے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے انگریز کی مرعوبیت اُٹھ گئی۔
- وہ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ کے اصرار پر وفدِ خلافت کے ساتھ علمائے ہند کے واحد نمائندے کی حیثیت سے یورپ تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔
- ۱۹۲۶ء میں سید صاحب نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس اجلاس کے شرکا میں اُستاذ العلماء مولانا محمد انور شاہ کشمیری مرحوم ایسے جلیل القدر عالمِ دین بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں انہوں نے جو خطبۂ صدارت دیا، وہ مسلمانوں کی سیاست میں تاحال یادگار ہے۔
- ۱۹۲۰ء میں انہوں نے انجمن حمایتِ اسلام کی دعوت پر "عہد رسالت میں اشاعتِ اسلام" کے عنوان پر تقریر فرمائی۔ اس اجلاس میں دیگر علماء و فضلاء کے علاوہ علامہ اقبال مرحوم ایسے مشاہیر بھی شامل تھے جنہوں نے سید صاحب کی علمیت و فضیلت اور اہلیت و صلاحیت کا اعتراف فرمایا۔

ہندوستان کی آزادی اور متحدہ حکومت کی صورت میں جو مسائل پیدا ہو سکتے تھے اور جو خدشات پیش آ سکتے تھے، انہیں اپنی خداداد بصیرت اور فراست سے بھانپ کر انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ

"سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیشِ نظر جو معاملات ہیں، ان میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی، اصلاح اور استحکام کے لئے علیحدہ انتظام ہونا چاہیئے۔"

ان چند مثالوں سے اُن کی قومی و ملکی خدمات کے دائرۂ کار اور اُن کے مزاج و طبیعت کے مطابق اقدامات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حسنِ اخلاق

سید صاحب مرحوم حسنِ اخلاق میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی کوشش کرتے تھے۔ حلم، غیرت، مروّت، حیا، تواضع، انکسار وغیرہ سب نیک اوصاف ان کی سرشت میں شامل تھے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ایک بار اپنی گفتگو میں اُن کے بارے میں گواہی دی تھی کہ:

"رذائلِ اخلاق بالطبع اُن میں موجود ہی نہ تھے۔"

پھر سید صاحب کی وفات پر مولانا دریاآبادی موصوف نے صدقِ جدید (۲۴ دسمبر ۱۹۵۳ء) میں جو پہلا تعزیتی مضمون سپردِ قلم کیا، اس میں

میں بڑے سلمان

نہیں بھی۔ ممکن ہے اس قسم کی کچھ اور مثالیں بھی موجود ہوں۔ جن سے ایک بات ظاہر و باہر ہے کہ سید صاحب مرحوم کی ذاتِ گرامی علمی کمالات کے
سلسلے میں اپنوں اور بیگانوں سب کے لئے افادیت کا موجب تھی اور ہے۔

حُبِ رسالت

سید صاحب اس اعتبار سے واقعتاً نہایت خوش نصیب تھے کہ انہیں مولینا شبلی مرحوم کی شہرۂ آفاق تصنیف "سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کی تکمیل کا شرف حاصل ہوا۔ گویا جو سعادت علامہ شبلی کو آخر عمر میں حاصل ہوئی وہ سید صاحب
کو بہت پہلے مل گئی۔

"سیرۃ النبی" میں سوانح کی ترتیب کا کام تو بہت حد تک شبلی مرحوم کر گئے تھے۔ لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے ہر پہلو کو
قرآن کے مطابق کر دکھانا ایک وقت طلب کام تھا۔ سید صاحب نے سالہا سال تک روز و شب کی عرق ریزی کے بعد یہ فخر بھی حاصل کر لیا
اور قرآن و حدیث کے مطابق تحقیق میں محو ہو کر اور اپنی مفسرانہ، محدثانہ، فقیہانہ، متکلمانہ اور فلسفیانہ غرض جملہ اقسام کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کو
بروئے کار لا کر الفاظ کی مدد سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ثابت کر دی کہ

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن (کے عین مطابق) تھا۔

سید صاحب کے دل میں پیغمبرِ اسلام، سید الانبیاء، رحمۃ للعٰلمین، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس قدر موجزن تھی
کہ وہ سلوک کی منزل طے کرنے سے پہلے بھی آپ اور آپ کے پیغام کے خلاف سوءِ ادب کا کوئی کلمہ سُن کر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سوءِ اتفاق
سے اگر کوئی ایسا مرحلہ آجاتا تو ان کا قلم تلوار بن جاتا تھا۔

ان کی زندگی میں یورپ کے مستشرقین نے اس محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو محاذ قائم کیا تھا۔ اس محاذ کو شکست دینے کے
سلسلے میں سید صاحب کی کوششوں کو تاریخِ اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس زمانے میں سید صاحب نے "رسولِ وحدت" کے نام سے ایک رسالہ تحریر
فرمایا تھا۔ جس میں وحدتِ الٰہی، وحدتِ کتاب، وحدتِ انسانیت اور آخر میں دین و دنیا کی وحدت کو نہایت موثر اور مدلل انداز میں پیش کیا
تھا۔ اس کتاب کی ایک ایک سطر میں صاحبِ قلم کا جذبِ دروں اور خلوص و محبت کار فرما تھی۔ اس لئے "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق جہاں
اس سے اہلِ اسلام مستفید ہوئے وہاں بعض غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

تلاشِ مُرشد

سید سلیمان ندوی مرحوم ایک جید عالمِ دین ہونے کے باوجود نہایت منکسر المزاج شخص تھے۔ اگرچہ وہ خود علم و معرفت کے بلند
مقام پر فائز تھے لیکن اس کے باوجود انہیں کسی ایسے رہبرِ طریقت کی تلاش تھی جو ان کی آتشِ محبت کو تیز تر کرنے میں مدد دے
سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ تقریباً دس برس تک شیخ کی تلاش میں رہے۔ آخر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ساتھ دل لگاؤ کے باعث ان کے خلیفۂ ارشد
مولینا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ جس میں ان سے پہلے عبدالماجد دریاآبادی اور مولینا عبدالباری ندوی وغیرہ بھی شریک
ہو چکے تھے۔

مولینا اشرف علی تھانویؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کے اس واقعہ سے پہلے ہی سید صاحب کے دل میں ان کے بارے میں محبت و عقیدت
کے جذبات موجود تھے۔ لیکن اس سلسلۂ ارادت میں منسلک ہو جانے کے بعد ان میں جس میں قدر اضافہ ہو گیا، وہ قابلِ رشک و تقلید ہے۔ اس کے بعد
سید صاحب مولینا تھانوی علیہ الرحمہ سے زندگی کے ہر معاملے اور ہر مسئلے میں ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔ سید صاحب نے

خود مولینا عبدالباری ندوی کو ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

"حضرتِ تھانوی میرے ہر معاملہ حتّٰی کہ ذاتی معاملات سے بھی باخبر ہیں۔ یہ میرا جوشِ محبت ہے کہ اپنے والدِ شفیق کی طرح اُن کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین ہی نہیں ملتا۔"

یہ الفاظ اپنے مرشد کے ساتھ سید صاحب کے ذہنی اور دلی لگاؤ کا اندازہ کرنے کے لئے بہت حد تک مدد دے سکتے ہیں۔

اعزازِ خلافت

سید سلیمان مرحوم نے اپنے شیخ کی زندگی ہی میں سلوک و معرفت کے جملہ مراحل طے کر لئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مرشد کی نظر میں اس راستے کے سب نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر ہو گئے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو مولینا اشرف علی تھانوی مرحوم کے دل میں ناواقفوں کی رہنمائی کے لئے سید صاحب کو ہر طرح لائقِ اعتبار دیکھ کر انہیں اپنا خلیفہ بنانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے استخارہ فرمایا۔ جب اس ذریعے سے تائید و تقویت حاصل ہوئی تو سید صاحب کے نام ایک مکتوب تحریر کیا۔ جس میں یہ تحریر تھا کہ:

"میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دُوں۔ میں نے اس سلسلہ میں استخارہ بھی کر لیا ہے۔ اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

سید صاحب دو تین روز میں خود ہی اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے والے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس گرامی نامہ کا جواب نہیں لکھا۔ جب حاضرِ خدمت ہوئے تو بھی خاموش رہے۔ آخر ایک دن خود حکیم الامت مرحوم کی طرف سے ایک کاغذ پر مرقوم یہ الفاظ ملے کہ:

"آپ نے میرے استشارہ کا جواب نہیں دیا۔"

اِس اصرار پر سید صاحب نے جواباً عرض کیا کہ:

"حضرتِ والا کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری!

جب حضرتِ والا کو یہ جواب باصواب پہنچا تو نہایت مسرور ہوئے اور حاضرین سے فرمایا کہ:

"الحمد للہ! وہی جواب آیا۔ جس کی توقع تھی۔"

اس کے بعد مرشد تھانوی نے مرید ندوی کو خلافت عطا فرما دی اور اُن کو مسندِ ارشاد پر متمکن فرما دیا:

حضرت مولینا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے فیضِ صحبت سے سید صاحب کی زندگی میں اس قدر واضح انقلاب رونما ہوا۔ کہ وہ ایک طرح دنیائے علم سے دنیائے معرفت کی طرف آگئے۔ اس زمانے کی کیفیات کا اندازہ سید صاحب کے اپنے مکاتیب وغیرہ سے بھی ہوتا ہے۔

مولینا عبدالباری ندوی کے نام وہ ایک خط میں رقمطراز ہیں،

"دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور پر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ عملاً سمجھ میں آگئی اور اب تلافیٔ مافات میں مصروف ہوں۔"

اسی طرح مولینا مسعود عالم ندوی (مرحوم) کو ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

"واہ واہ کا مزہ بہت اٹھا چکا اور اب یہ رنگ اتر چکا۔ اب تو آہ آہ کا دور ہے۔ اور اپنی پچھلی تباہی پر ماتم اور آئندہ کی فکر درپیش ہے۔"

(مکاتیبِ سلیمان مرتبہ مولینا مسعود عالم ندوی۔ مکتوب ۱۱۹)

سید سلیمان ندوی کی زندگی میں یہ جو انقلاب آیا تھا۔ اُس کی شہادت دارالمصنفین کے دیگر رفقاء کے بیانات سے بھی ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں درجِ ذیل دو اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

امیرِ شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۱ء ○ ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء

شجر امت سے پیوستگی

صف علماء میں یہ عزت تھی کہ محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب مفتی اقلیم ہند مولانا کفایت اللہ دہلوی اور قطب وقت حضرت مولانا احمد علی لاہوری جیسے بزرگوں نے آپ کو امیر شریعت تسلیم کیا اور آپکے ہاتھ پر بیعت کی پاک و ہند کا خطیب اعظم اپنی سحر بیانی اور طلاقت لسانی سے عوامی نفسیات کا بھی بلاشرکت غیرے مالک تھا تاہم آپ نے متعدد امفسر اور مفتی کے انداز میں اظہار شخصیت سے ہمیشہ پرہیز کی آپ کی سیاسی بصیرت کا فیصلہ تھا کہ ہندوستان میں تفسیروں، فتووں اور اختلافی مسائل کی پہلے ہی کمی نہیں دبے ہوئے اختلافات کو اچھالنا اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد ڈالنا پرانے فرقوں میں ایک نئے فرقے کا اضافہ تو ہے مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں ان پر ایک ظلم ہے ہاں پچھلوں کے انتساب سے تفسیر و فقہ کا بیان فرقہ آرائی نہیں شجر امت سے پیوستگی ہے۔

تحریک آزادی کے پلیٹ فارم پر آپ کے ساتھ شیعہ، سنی، اہلحدیث، حنفی، دیوبندی، بریلوی سب مکاتب فکر جمع تھے آپ کی رائے تھی کہ پہلے مکاتب فکر سے اشتراک کیا جائے لیکن اس بات کی بھی پوری کوشش کی جائے کہ کوئی نیا مکتب فکر یا فرقہ پیدا ہونے نہ پائے آپکی خواہش تھی کہ قرآن و سنت کی تعبیر میں نئی اختلافی راہیں نہ نکالی جائیں اور جو اختلافات کتابوں میں سوئے ہوئے ہیں اور اس دور میں علماء موجود نہیں انہیں کتابوں سے اچھال اچھال کر نئے سرے سے زندہ نہ کیا جائے۔

آپ کہا کرتے تھے کہ زمانہ حال کے مفکرین نے پرانے اختلافات ابھار ابھار کر جو نئے مکاتب فکر سامنے لا کھڑے کیے ہیں اس نئی گروہ بندی سے فرقوں میں —— ایک نئے فرقے کے اضافے کے سوا مسلمانوں کو کچھ حاصل نہیں ہوا اگر یہ مفکرین اپنی سرگرمیاں سیاسی تعمیر اور عملی خدمات تک محدود رکھتے رسائل و مسائل کی خار دار وادی میں نہ اترتے تو ان کا وجود مسلمانوں کے لیے ایک سعادت ہوتا آپ نے خود اس امر کی پوری کوشش کی کہ نئے مفسر یا مفتی کے جلوں میں کبھی جلوہ گر نہ ہوں جب بھی مسائل کی نوبت آتی آپ اکابر علماء کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے اور انہی علماء کی طرف متوجہ کرتے جو پہلے علماء اور سلف صالحین سے انتساب رکھتے ہوں آپ کی رائے تھی قلعہ اسلام کی حفاظت کے لیے علمائے دین کے اعتماد کو قائم رکھنا از حد ضروری ہے اس اعتماد کے رہتے ہوئے کوئی زندقہ اور الحاد راہ نہیں پا سکتا۔ ایک محفل میں آپ سے پوچھا گیا کہ مرزا غلام احمد کو اسلام سے خارج کیوں سمجھتے ہیں؟ آپ اس کے جواب میں ختم نبوت اور مرزا صاحب کے عقائد و سیرت پر بڑی مفصل بحثیں کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس کی بجائے یہ جواب دیا

اکابر علماء جن پر امت کے تمام فرقوں کا اعتماد ہے مرزا غلام احمد کو اجماعاً دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں "میں علمائے دیوبند کے مسلک پر ہوں اور وہ مرزا صاحب کو انکے عقائد کی وجہ سے مسلمان نہیں سمجھتے"۔

شجر امت سے پیوستگی آپ کے ایمان کی دولت تھی اخلاص و انکسار نے انا و لا غیری کی جاہلی آگ بالکل بجھا رکھی تھی اپنے جماعتی سربراہوں کے فیصلوں کی مجسم تعمیل تھے حضرت رائپوری قدس سرہ کے حلقہ ارادت نے آپ کے اخلاص و انکساری کو اور نکھار دیا تھا آپ پر آپ کی جماعت کے کسی پرانے یا نئے کارکن نے کبھی آمر اور ڈکٹیٹر ہونے کا الزام نہیں لگایا علم اور منصبی ذمہ داری میں آپ نے جسکو بڑا سمجھا اس کے تعمیل حکم نے آپکے کبھی انحراف نہ کیا اپنے اکابر کی تعظیم و توقیر آپ کی روح کی پکار اور آپ کے عمل کا منہاج تھی۔

تقسیم ملک کے بعد زعمائے احرار میں بھی اختلافات ابھرے بعض ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوئے اور بعض میں قلمی جنگ بھی ہوئی لیکن کبھی شخص کے خلاف کبھی کسی کی زبان نہ کھلی اور جس کا پر عظمت کردار اور ضمیر کی بلندی ہر کارکن کے دل و دماغ پر برابر چھائی رہی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں احرار کے ہر فرد اور گروپ کا دل آپ کے اجلال و اکرام اور والہانہ عقیدت سے سرشار ہے اس سے

ہم نے اپنے اس وطن عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علماء اور فضلا آغوش لحد میں اتارے گئے۔ لیکن شاہ جیؒ کی میت کے گرد عشاق کا جو ہجوم تھا اور لوگوں نے جس بے اختیاری کے ساتھ ان کا ماتم کیا فقراء و علماء کی پوری صف اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب دماغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوصف انہیں اس اقلیم میں جو وقار اور اقتدار حاصل تھا اس کا اقرار و اعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رفاقت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ سر دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان کے فدائیوں کا قبیلہ ملک کے ہر گوشے میں موجود ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا وہ کبھی پُر نہ ہو گا۔ خطابت بیوہ ہو گئی۔ لوگ کبھی اس طرف سے گذریں گے جہاں شاہ جی گرجتے اور گونجتے رہے ہیں تو دلوں سے ہُوک اُٹھا کرے گی کہ یہاں کبھی وہ مرد مجاہد صرصر آغوش راتوں میں اپنا چراغ جلایا کرتا تھا جس کی نوا پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ قرون اولیٰ کا کوئی غزوہ نقاب الٹ کر سامنے آ گیا ہے یا پھر لوگ غار حرا کے اردگرد کھڑے ہیں۔ قرآن اترا آیا ہے اور قند و نبات کی طرح گھلتا ہُوا کانوں کے راستے سے دلوں کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح بیٹھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن اب وہ رعنائی خیال کہاں؟ (ہفت روزہ "چٹان")

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہُوا۔ اس پورے برصغیر کی ممتاز اور محترم شخصیت کی حیثیت سے لاکھوں انسانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز رہے۔ وہ ایک جادو بیان مقرر اور برصغیر کی تاریخ کے سب سے زیادہ مؤثر خطیبوں میں شامل تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی ساری عمر قومی خدمت میں گذری۔ پندرہ سال تک وہ قید افرنگ میں رہے اور سامراجی طاقت کے ساتھ لڑنے میں اپنا تن من دھن لٹاتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک مخلص، دیانتدار، اصول پرست اور عوام دوست رہنما کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ حق یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت تھی جو ہم سے جُدا ہو گئی۔ ایک مخلص رہنما سے یہ قوم محروم ہو گئی لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور انہوں نے قوم کو آزاد کرنے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لئے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔ ان کی مجلس احرار نے آزادی سے پہلے جس خلوص اور جذبہ سے کام کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور اسے اس ملک کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اس قوم کے نوجوانوں میں وہ خلوص وہ جذبہ اور وہ کردار پیدا کرے جس کا مظاہرہ اس مجاہد نے عمر بھر کیا۔ (روزنامہ "جنگ" کراچی)

وہ شعلہ نوا اُٹھ گیا ہے جس نے ربع صدی تک سپاہ آزادی کا دل گرمائے رکھا اور حوصلے بڑھائے۔ دنیائے خطابت کو اس پر ناز تھا اور اس کی یہ صلاحیت ملک و ملت کی خدمت کے لئے وقف رہی لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا عمل کا دھنی بھی تھا۔ وہی کچھ کہتا جس پر کاربند تھا اور وہی کچھ کرنے کی تلقین کرتا۔ اگر ہم ان بزرگوں کی فہرست مرتب کریں جنہوں نے دور غلامی میں برطانوی سامراج کے خلاف گفتار و کردار سے رائے عامہ کو بیدار کیا تھا تو امیر شریعت کا نام سب سے پہلے آئے گا۔

شاہ صاحبؒ کی زندگی کا یہ پہلو خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ وہ صرف سیاست کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے، اسلام کی تبلیغ کا فرض بھی ہمیشہ ان کی نظروں میں رہا تھا۔ دین فطرت کی سربلندی ان کی سب سے بڑی تمنا تھی اور ناموس رسولؐ کی پاسبانی اور ملت کا اتحاد اُن کا مقصد حیات تھا۔ زہد و پاکبازی اور مذہب کے گہرے مطالعہ اور علم کی بنا پر وہ امیر شریعت کے منصب پر فائز ہوئے تھے اور اس

میں بڑے مسلمان

منصب پر اپنا حق ثابت کر دیا تھا۔ (روزنامہ "امروز" ۔ لاہور)

ملک میں سید عطاء اللہ بخاریؒ کی موت کی خبر انتہائی رنج و ملال سے سنی جائے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو ہماری آزادی کی شاہراہ ربع صدی قبل کے ان تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں سے جا ملتی ہے جہاں چند اولوالعزم انسان درماندہ مسافروں کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کبھی ان کی شعلہ نوائی سے مردہ زندگی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور اپنے حال سے پریشان اور مستقبل سے مایوس یکایک نئے حوصلوں اور ولولوں سے سرشار ہو کر ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کڑی آزمائشوں کے دور میں ان کے پیچھے چلنے والے قافلوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن ان کوہ پیکر انسانوں کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزادی کی تمنا کرنے کے جرم کی پاداش میں ان کے لئے قید خانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کی زبانوں پر سنگینوں کے پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مصیبت و ہر ناکامی اور ہر آزمائش ان کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتی ہے۔

سید عطاء اللہ بخاریؒ کی زندگی کا مقصد کروڑوں انسانوں کو آزادی کی تڑپ عطا کرنا تھا۔ اگر ہم آزادی کے ایک نڈر مبلغ کی حیثیت سے ان کے حالات پر غور کریں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیں ان کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اس وقت سید عطاء اللہ بخاریؒ کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔ (روزنامہ "کوہستان" لاہور)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم کی صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تقریر کا جادو استعارہ نہیں ۔ مرحوم کی ذات میں ایک حقیقت تھا۔ وہ اپنی سحر بیانی سے لاکھوں کے مجمع کو گھنٹوں محو حیرت رکھتے، ہنساتے، رلاتے، تڑپاتے اور آمادہ عمل کرتے۔ اتنا بڑا شعلہ نوا اور معجزہ بیاں اب پیدا نہ ہو گا اور وہ اس لئے کہ بقول ایک معاصر "وہ روایت جس میں نغمہ گری آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا اور وہ روایت جس نے خطابت کو جنم دیا۔ کمزور ہو چکی ہے۔ (ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اردو اور پنجابی کے بے مثل خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز شاہی قلعے پر مرکوز کئے تھے۔ انہیں اختلاف عقیدہ کے علاوہ احمدیوں سے غیر فانی کد کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ بانی سلسلہ نے انگریز سلطنت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا خدا تعالیٰ ابر رحمت کی طرح ہمارے لئے انگریزی سلطنت کو دور سے لایا اور ہم پر اور ہماری ذریت پر یہ فرض ہو گیا کہ اس مبارک گورنمنٹ برطانیہ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں۔ اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولی باری جاری رکھی اور دونوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔ (ہفت روزہ "اقدام" ۔ لاہور)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم جامع کمالات شخصیت تھے۔ برصغیر میں اس پائے کا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ جنگ آزادی میں شاہ صاحبؒ نے نمایاں طور پر حصہ لیا اور عمر عزیز کا ایک حصہ تقریباً ۱۸ سال جیل میں بسر کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری زندگی بھی کیا تھی

کا باعث فخر سمجھتےہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر بخاریؒ نہ ہوتے تو ان لوگوں کا وجود بھی نہ ہوتا۔ غرض جس طرح لوگ اقبال بننے کی کوشش لاحاصل کر رہے ہیں، اسی طرح بخاریؒ بننے کی بھی کوششیں کر رہے ہیں۔ اقبال اور بخاری کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتیُ ہے

غنیمت اور شاہ صاحب | غنیمت کنجاہی نے پنجاب کی تعریف کی ہے اور شاہ صاحب نے بھی۔ دونوں رنگ ملاحظہ ہوں۔

غنیمت

ندیدم کشور غارت گر تاب
بخوبی ہائے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خوردہ بخاکش آبِ کوثر
فضائے نشۂ ہستی ہوائش
زمینے کاسمانہا خاک پائش
بنائے کعبۂ دلہا زخاکش
عروج نشۂ معنی زتاکش
غبارش آب و رنگِ چہرہ گل
گیاہش دلربائے زلفِ سنبل
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ
رُخِ خوباں بہ پشتش خط کشیدہ
زلالش بادہ سازِ مستی عشق،
نسیمش رُوح بخش ہستی عشق
گلش بر خاک ہر جا سایہ انداخت
زمیں از آتشِ یاقوت بگداخت
بخاکش سایۂ پرہائے بلبل
جواب یک چمن خندیدن گل
شفق سرمایۂ چشم از دیدن گل
چمن ساماں نگہ از چیدن گل
زشوق آں کہ تا آمد بہ پنجاب
دل کشمیر صد رہ میشود آب
خنک ہر کس کہ در ہنگام سرما
دریں گلشن بود گرم تماشا

شاہ صاحبؒ

ندیدم کشورے مردود و مرتاب
بہ شوی ہائے کفر آباد پنجاب
چہ ملکے ننگ و عارِ ہفت کشور
زشرق و غرب بادش خاک بر سر
خمیر طینتش مردم کشی ہا
زقتل مسلمش باشد خوشی ہا
چہ پیرانش مُریدان فرنگی
لقب کافور و ذاتِ پاک زنگی
زلواب و رئیسانش چہ پرسی
سگ و سگ زادگان کرسی بہ کرسی
چناں فرزند ناہموار زاید
کہ از خرقیتش برتر نیاید
چکد از لالہ اش خون مسلمان
از و نالاں حجاز و مصر و ایران
جوانانش غلامان فرنگی
پناہِ شاں بدامان فرنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را معسکر
مسکر! غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب
فرنگی را معسکر ہست پنجاب
فضائش کفر ریز و کفر بیز است
بہ آئین الٰہی در ستیز است
زمین فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطان پیشِ پا [illegible] سجدہ زے

لے تشریف لے گئے۔ ملاقات کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ حضرت اپنے حجرے میں تشریف لے جا چکے تھے۔ خدام نے عرض کیا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ شاہ جی لاری کے اڈے پر واپس تشریف لے گئے۔ حضرت شیر محمد اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ عطاء اللہ شاہ نام کا کوئی آدمی ہے؟ خدام نے عرض کی چونکہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لئے واپس تشریف لے گئے۔ انہوں نے یہ سن کر شاہ جی کو واپس بلوایا، بغل گیر ہوئے اور فرمایا امرتبہ بہت بلند ہے، بہت اونچا ہے۔ الفاظ دہراتے جاتے اور اپنا ہاتھ اونچا کرتے جاتے۔ پھر پیٹھ ٹھونک کر رخصت کیا۔

روحانی فیض ان کو اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ جو اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ شاہ جی اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بے حد وظائف رٹے گئے۔ طبیعت میں بے حد جلال تھا۔ جب میں کسی راستے سے گزرتا تو مجھے درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ (حافظ لدھیانوی)

شخصیتیں توفیقات ایزدی سے پیدا ہوتی ہیں —— ان کا وجود قدرت کے معمولی قوانین کا کرشمہ نہیں ہوتا —— وہ تو قدرت کے کسی غیر معمولی اور پر اسرار عمل سے ظہور میں آتی ہیں —— یوں قدرت (نیچر) کی اپنی کارفرمائی بھی بوقلموں گل کاریاں کرتی رہتی ہے اور اس کے ہاتھ کی ہمزوری کے تمام عجوبے بھی کچھ کم نہیں —— صرف پھولوں کی کائنات پر ہی غور کیجئے۔ آپ قلمرو گل کی وسعتوں کو دیکھ دیکھ کر محو حیرت تو لازماً ہوں گے، مگر آپ بالیقین اس کی پہنائیوں، اس کی رنگ رنگیوں، کرشمہ آفرینیوں اور دل فریبیوں کے انداز ہائے بے شمار کو دیکھ کر تھک —— جائیں گے اور بالآخر کہہ اٹھیں گے ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

یہ تو ہوا حال نیچر کی عام تخلیقات کا —— اور اس کے ادراک کی کوشش کچھ کامیاب بھی ہے مگر نیچر کی تخلیقات فائقہ کی کائنات کہ عظیم انسان بھی اسی کا ایک حصہ ہیں۔ خدائے مصور الاجسام والارواح کا ایک بھید ہے، یعنی ایک جہان راز جس کا مرکز خود خدا کی ذات مجرد ہی ہے، جس کے انعکاسات عظیم فائق انسانوں کا روپ دھارتے رہتے ہیں —— اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق میر تقی نے سادہ سے الفاظ میں پتے کی بات یوں بتا دی تھی ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اور جب بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ذکر سنتا ہوں اور ان کے کمالات فائقہ کا تصور کرتا ہوں تو میر تقی کا مندرجہ بالا شعر فوراً میری زبان پر وارد ہو جاتا ہے —— اللھم اغفرہ وارحمہ! (ڈاکٹر سید عبداللہ)

قیام پاکستان کے بعد شاہ جی نے قائد ملت خاں لیاقت علی خاں صاحب مرحوم کے مُکّہ کی تائید میں دفاع و استحکام وطن عزیز کے لئے سو طوفانی دورے کئے۔ ہر موڑ پر دشمنان وطن کو ڈانٹا اور انہیں خبردار کیا کہ رسول عربی صلعم کے نام پر حاصل کی گئی سرزمین کی طرف جو نگاہ بد اٹھے گی اسے نکال دیا جائے گا۔ اور جو ہاتھ اٹھے گا اسے کاٹ دیا جائے گا۔ وہ ایک صاف دل اور صاف گو قائد تھے۔ انہیں مذہب اور وطن دونوں سے پیار تھا۔ وطن انگریز سے چھیننا اور مذہب دشمنان رسالت سے محفوظ کرنا ان کا نصب العین تھا۔ ان کی زندگی میں دونوں کام ہوئے اور یہ ملت اسلامیہ کا مایۂ ناز سردار اطمینان اور کامیابی کے ساتھ اس دار فانی سے سرخرو اٹھا۔

اگر تھپڑ جائز ہے تو گولی کیوں نہیں سلطان ابن سعود پر عین احرام میں ایک حاجی نے چھرے سے حملہ کر دیا۔

خطیبانہ شہ پارے

وفاداری کے طالب ۱۹۴۸ء

میں نے جو کچھ کیا اللہ اور اس کے رسول کے لیے کیا۔ مجھے ایک لحظ کے لیے بھی اپنی کسی حرکت پر ندامت نہیں۔ میرا دماغ غلطی کر سکتا ہے۔ لیکن میرے دل نے کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھ سے وفاداری کا ثبوت مانگنے والے پہلے اللہ اور اس کے رسولؐ کو اپنی وفاداری کا ثبوت دیں۔ میں ان لوگوں میں نہیں، جو انسانی ضمیر کی سوداگری کرتے ہیں۔ میں اس شخص کو دھوپ اور چھاؤں کی اولاد سمجھتا ہوں۔ جو قوم کو بیچتا پھرتا، ملک سے غداری کرتا، اور جس ہنڈیا میں کھاتا ہے اسی میں چھید ڈالتا ہے ——— میں نے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنا سیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کا وارث نہیں جنھوں نے درباروں کی دہلیزیں چاٹی ہیں۔ میں ان کا وارث ہوں۔ جو شہادت کے راستہ میں سروں کو ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔

پاکستان کی حفاظت ۱۹۵۲ء

میں ان لوگوں میں سے نہیں، جو یہ صدا دیتے پھیریں۔ کہیں توشہ وفاداری لیے پھرتا ہوں میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو، اور جس مقتل میں چاہو، مجھے ذبح کر دو، ——— ایسا کبھی نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔ میری خوشی بیکراں ہے۔ کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصہ میں بھی سامراج کو دیکھ نہیں سکتا۔ میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں ——— تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو، میری رائے ہار گئی۔ اور اس کہانی کو یہیں ختم کر دو اب پاکستان نے جب بھی پکارا، واللہ باللہ میں اس کے ذرے ذرے کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے ——— میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائیگا ——— میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلہ میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد۔ میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا۔ اب بھی تمہارا ہے۔

ختم نبوت کا سپاہی ۱۹۵۰ء

ختم نبوت کی حفاظت میرا جز ایمان ہے۔ جو شخص بھی اس ردا کو چوری کرے گا، جی نہیں چوری کا حوصلہ کرے گا۔ میں اُس کے گریبان کی دھجیاں پھاڑ دوں گا میں میاںؐ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہ جی میاں کہا کرتے تھے) کے سوا کسی کا نہیں۔ نہ اپنا نہ پرایا میں انہیں کا ہوں وہی میرے ہیں۔ جس کے حسن و جمال کو خود رب کعبہ نے قسمیں کھا کھا کر آراستہ کیا ہو۔ میں اُن کے حسن و جمال پر نہ مر مٹوں۔ تو لعنت ہے مجھ پہ اور اُن پہ جو اُنؐ کا نام تو لیتے ہیں لیکن سارقوں کی خیرہ چشمی کا تماشا دیکھتے ہیں۔

لاہور کے تماشائی ۱۹۳۸ء

صدر محترم اور تماشائی بھائیو! لاہور آئے ہوئے مجھے بیس سال ہو گئے ہیں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بال سفید ہو چکے ہیں۔ آج تک مجھے یہ پتہ نہیں چلا کہ آپ ہیں کیا؟ غوث ہیں، قطب ہیں، ابدال ہیں، ولی ہیں، کیا ہیں سمجھ میں نہیں آتا، کہ آپ کو کس خطاب سے مخاطب کروں۔ بیوی کے حق مہر میں جیل جانا لکھا ہوا ہے، اگر تم نہیں چاہتے، کہ ہم تمہارے سامنے آئیں، تو پھر تم ہمارے سامنے کیوں آتے ہو؟ ——— کیا میری کٹی کرنی ہے تو پکی کرلو، یہ کیا کہ عطاء اللہ نے کی تقریر، تم نے کہا، واہ شاہ جی واہ، عطاء اللہ ہو گیا قید، تم نے کہا، آہ شاہ جی آہ،

تمہاری آہ اور واہ میں شاہ جی ہو گئے تباہ۔

قرآن مجید ۱۹۴۶ء

اللہ کی کتاب کی بلاغت کے صدقے جائیے۔ خود بولتی ہے کہ میں محمدؐ پر اتاری گئی ہوں۔ بابو لوگو! اس کی قسمیں نہ اٹھایا کرو، اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیلؒ کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح پڑھا کرو —— دیکھا، اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا، تو مغرب پر ہلّہ بول دیا، پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تمہارے بت کدے میں اللہ اکبر کی صدائیں۔

عقاب کی آنکھ ۱۹۳۹ء

تم میرے بارے میں جو چاہو سوچ لو، مسلمانوں کا یہ شعار ہو گیا ہے، کہ وہ برائیاں عقاب کی آنکھ سے چنتا اور ہوا کی رفتار سے پکڑتا ہے۔ کبھی کبھی نیکیوں پر بھی نگاہ کر لیا کرو —— ! تمہاری فطرتیں اس سے خوبصورت ہوتی چلی جائیں گی۔

راجپال کی گستاخی ۱۹۲۷ء

(اس جلسہ میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید موجود تھے۔ یہ جلسہ راجپال کی کتاب (خاکم بدہن) رنگیلا رسولؐ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا) آج مفتی کفایت اللہ، اور مولانا احمد سعید کے دروازے پر ام المومنین عائشہؓ اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ آئیں اور فرمایا ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں اکہ کافروں نے ہمیں گالیاں دی ہیں —— (پھر اس زبردست کروٹ کے ساتھ لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا، کہ جلسہ دہل گیا)، ارے دیکھو تو —— ام المومنین عائشہ صدیقہؓ دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں (جلسہ میں کہرام مچ گیا لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے)، دیکھو، دیکھو سبز گنبد میں (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تڑپ رہے ہیں۔ خدیجہ و عائشہ پریشان ہیں۔ امہات المومنین تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ عائشہ پکارتی ہیں، وہ عائشہ، جنہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیارے حمیرا (رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے جنہوں نے رسول اللہ (فداہ امی وابی) کی رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ انکے ناموس پر قربان ہو جاؤ سچے بیٹے ماں پر کٹ مرا کرتے ہیں۔

۷ر جولائی ۱۹۲۷ء

میں پہاڑوں سے مخاطب ہوتا ۱۹۴۵ء

چالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا، پہاڑوں کو سناتا، تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے، غاروں سے ہمکلام ہوتا، تو جھوم اٹھتے، چٹانوں کو جھنجھوڑتا، تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا، تو ہمیشہ کے لیے طوفان بلند ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا، تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا، تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا، تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا، تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے۔ میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا جن کی زمینیں بنجر ہو چکی ہیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے۔ جن کے ضمیر عاجز آ چکے ہیں۔ جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں۔ جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں۔ جن کا ٹھہرنا المناک، اور جن سے گزر جانا طربناک ہے۔ جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔

مراجعت ۱۹۶۰ء

میں وہاں چلا جاؤں گا۔ جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا، پھر تم مجھے پکارو گے —— مگر تمہاری پکار تمہارے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی —— اور تم مجھے نہ پاؤ گے ——

کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر مطالعہ کا یہ ذوق کچھ دنوں ساتھ رہا۔ آخر قرآن پاک ہی کو رفیق بنا لیا مولانا محمد طفیل منگلوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ایک زمانہ میں ساتھ رکھتے اور ساتھیوں کو اسکے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے ——— مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال"، ظفر علی خاں کا "ستارہ صبح"، انہوں نے ڈوب کر پڑھے تھے ——— علامہ اقبال کے کلام کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا تھا۔ "بال جبریل" تو سفر و حضر میں ساتھ رکھتے ———

(۱۶)۔ اپنی ذات کی ہر حال میں نفی کرتے اور جماعت کے دوستوں یا جماعت سے باہر کے انگریز دشمنوں کے قصیدے پڑھاتے اور دعائیں دیتے تھے۔ ———

(۱۸)۔ خط و کتابت کے مطلق عادی نہ تھے۔ بہت کم خطوں کا جواب دیتے اور شاذ ہی کسی کو خط لکھتے تھے۔ البتہ بعض جوابات بیٹوں سے املا کرا دیتے تھے۔ مضمون نگاری کا شوق مطلق نہ تھا۔ صرف بیاض رکھتے تھے۔

شورش کاشمیری

انکی باتوں میں گلوں کی خوشبو

شاہ جی تحریر کے سخت مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کوئی مضمون نہیں لکھا۔ وہ خط بھی شاذ ہی لکھتے تھے۔ وہ خود ایک بڑے آدمی تھے۔ لیکن اپنے عہد کے بڑے آدمیوں سے انکی مطلق خط و کتابت نہ تھی۔ فرماتے، انسانی سوسائٹی میں سب فتنے تحریر سے پیدا ہوتے ہیں۔ تلواروں نے انسانوں کے جسموں کو قتل کیا لیکن قلموں نے انسانوں کی روح میں فنا کر ڈالی ہیں۔ اس معاملہ میں ان سے زیادہ بے نیاز آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ جن دنوں میں ان کی سوانحمری لکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ذرہ بھر تعاون نہیں کیا۔ بلکہ جب میں سوانحمری مکمل کر کے ان کے خاندانی حالات کا باب سنانے کے لیے حاضر ہوا۔ تو فرمایا چھوڑو اس کو، کس راہ پر پڑ گئے ہو، صاف انکار کر دیا گو اسکے اور بھی وجوہ تھے۔ جنہیں میں یہاں قلم بند کرنا نہیں چاہتا تاہم انکی بے نیازی معراج کمال پر تھی وہ کسی کو اپنی فوٹو کھینچنے نہیں دیتے تھے۔ اور کھنچوانے کا تو سوال ہی خارج از بحث تھا۔ انکا ایک فوٹو جو کیلنڈر میں دیا جا رہا ہے عام ہے اور شاید کسی طرح ان کی اجازت سے کھینچ گیا ہے۔ تاہم اس پر سخت ناراض تھے۔ باقی تمام تصویریں ان کی منشا و مرضی اور ارادے کے خلاف ہیں۔ اور فوٹو گرافروں کی اپنی ہوشیاری کا نتیجہ ——— ان کی بعض تصویریں "چٹان"، کے فوٹو گرافروں کی حاصل کردہ ہیں۔ جو انہیں گفتگو میں مشغول رکھ کر بنائی گئی ہیں۔ راقم الحروف کی تحریر کردہ سوانحمری میں انکی جو تصویر ہے۔ کتاب کا پہلا نسخہ ان کے ہاں پہنچا۔ تو کسی معتمد یا بزرگ نے اعتراض نما سوال کیا۔ تصویر پھاڑ کر اسکے حوالے کر دی۔ اور کہا اس کو جوتے مارو، مزدور مارد، سوچتے کیا ہو، یہ بے نفسی اب کہاں؟ اور اس استغنا کے نمونے کوئی کہاں سے لا سکتا ہے!۔

فی الحقیقت وہ ایک عہد، ایک ادارہ، ایک انجمن اور ایک تاریخ تھے۔ گفتگو طرازی میں انکا مثیل ملنا مشکل ہے۔ وہ خاص صحبتوں

(۶) کسی شیعہ دوست نے سوال کیا۔ علی اور عمر (رضی اللہ عنہما) میں کیا فرق ہے۔ فرمایا بڑا فرق ہے۔ علیؓ مرید تھے، عمرؓ مراد حضورؐ نے خود انکی آرزو کی اور اللہ سے دعا مانگی تھی۔ فرمایا میں علیؓ کا بیٹا ہوں۔ نفس میرا بھی چاہتا ہے کہ سب کچھ انہیں کی جھولی میں ڈال دوں، مگر چھوڑتے نہیں وہ خود منواتے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ کو نکال دو اور سوچو تاریخ میں رہ کیا جاتا ہے؟

---

(۵) اسی دوست نے پوچھا حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) میں کیا فرق ہے۔ فرمایا خدیجہؓ کا نکاح محمدؐ بن عبداللہ سے ہوا تھا۔ عائشہ کا عقد محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ بنیں۔ یہ نبوت کی۔ یہ گویا ایک ناقص سوال کا شگفتہ جواب، لیکن ان لوگوں کے لیے مسکت جواب تھا جو ازواج مطہرات میں بھی بغاوت کے حاشیے باندھتے ہیں

---

(۹) انہی صاحب نے لگے ہاتھوں یہ سوال بھی کیا کہ حضرت فاطمۃ الزہرآ اور ان کی دوسری صاحبزادیوں رقیہؓ، ام کلثومؓ اور زینبؓ میں کیا فرق ہے؟ فرمایا فاطمہ نبوت کے بعد کی بیٹی ہے۔ اور باقی نبوت سے پہلے کی بیٹیاں تھیں۔ (مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں سرے سے مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ انہیں سوال کی صورت دینا بے سود تھا۔ تاہم " غنچہ طرازوں "، کو کس بانکپن سے جواب دیتے تھے۔

---

(۷) صاحبزادہ فیض الحسن شاہ ایک زمانے میں جماعت احرار کے اکابرین سے تھے۔ آجکل بریلوی عقائد کے مبلغ ہیں اور نوری و خاکی کے چکر میں محصور ——— کسی نے سوال کیا، شاہ جی، صاحبزادہ صاحب آپ کو کیوں چھوڑ گئے۔ فرمایا

" بھائی وہ نوری ہیں ہم خاکی ہیں ان نوریوں سے وفا کی امید ہی کیا سب سے بڑے نوری (جبریل علیہ السلام) میرے نانا کو (شب معراج) راستہ میں چھوڑ گئے تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ آگے چلو کہا اس سے آگے پر جل جائینگے۔ نتیجۃً نوری رہ گیا، خاکی آگے نکل گیا "

ہائے نہ ہوا بخاری، میاںؒ کا حکم مان لیتا، خواہ پر ہی جل جاتے، میاںؒ کی طاعت اور آقا کی دہلیز پر تو جلتے اس سے بہتر کون سا موقع تھا۔ ؎

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنّا

---

(۸) درگاہ امام ناصر جالندھر کے جلسے میں کسی نے اس وقت کے اختلافی مسئلے زیارت قبور کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ مخالفوں نے شاہ جی کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا۔ کہ وہابی ہیں۔ سوال کیا گیا۔ کہ آپ کا زیارت قبور کے بارے میں کیا خیال ہے فرمایا۔

" اپنے اپنے ظرف اور ذہن کی بات ہے۔ کچھ لوگ انگور نعمت خداوندی سمجھ کر کھاتے ہیں کچھ اس میں سے شراب نکالتے، اور عقل کی بازی بدتے ہیں۔ میں بھی اس مزار کی زیارت کر کے آیا ہوں اور تم بھی زیارت کرتے ہو۔ خدا کے فضل و کرم سے کچھ لے کر آیا ہوں اور تم ایمان میں سے کچھ دے کر آتے ہو

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا "

---

(۹) ۔ سیرت کے ایک جلسہ میں فرمایا یہ بڑا نازک مضمون ہے۔ سیاسی تقریر ہو۔ ایک آدھ جملہ نیچے اوپر یا ادھر اُدھر ہو جائے تو ڈر نہیں لگتا۔ زیادہ سے زیادہ قید ہو جاتی ہے۔ سال، دو سال، پانچ سال، لیکن سیرت یا حدیث کے مضمون پر بولتے ہوئے ایک آدھ جملہ بھی کم و بیش ہو جائے تو ایمان کا ضیاع ہے۔ اور دوزخ کی آگ، اس میدان میں بخاری بزدل ہے۔ جہنم کے قید خانے کی تاب اس میں نہیں ہے۔

---

(۱۰) ۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بشریت کے منکرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"بھائی لوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی نسل ہو اور بٹیروں کی بھی ——— لیکن ایک ہم سید ایسے ہیں کہ جن کی نسل نہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تم بشر نہیں مانتے ہو، تو پھر ہم کس کی اولاد ہوئے؟"

---

(۱۱) ۔ فرمایا (بحوالہ مولانا قاری محمد طیب مدظلہ)، علماء، اسلام کی پولیس ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کرائیں۔ اہل حال بزرگوں کو جو کچھ کہنا ہے۔ اپنے تک محدود رکھیں اگر وہ کھلم کھلا قانون اسلام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہونگے تو ہم انہیں پکڑ لیں گے خواہ عدالت میں چھوٹ ہی جائیں۔

---

(۱۲) ۔ کسی نے سوال کیا۔ شاہ جی یہ مردے سنتے ہیں کہ نہیں فرمایا "سنتے ہونگے جن کی سنتے ہونگے ہماری تو زندے بھی نہیں سنتے ہیں" حاضرین ہنس پڑے۔ مسئلہ ختم ہو گیا۔

---

(۱۳) ۔ موری دروازے کے باہر کندن شاہ کا تکیہ ہے۔ جسے عام لوگ گدو شاہ کہتے ہیں اس سے پیوست کبھی ایک باغ تھا۔ جہاں کانگرس کے جلسے ہوتے تھے۔ سائمن کمیشن کے زمانے میں شاہ جی نے یہاں ایک تقریر کی۔ سرکاری لوگوں نے اس تکیے کے چرسیوں، بھنگیوں اور سلفہ بازوں کو رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے اکسایا۔ وہ سلفہ کا کش کھینچ کر یا علی مدد کے نعرے لگانے لگے۔ شاہ جی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ او چرسیو! یہ غلاظت پی کر میرے باپ علی (رضی اللہ عنہ) کا نعرہ کیوں لگاتے ہو کیا تمہارے باپ دادا نہیں ہیں۔ (کیا بات کس شگفتگی سے کہی ہے)

---

(۱۴) ۔ ایک وکیل نے رمضان کے دنوں میں شاہ جی سے بزعم خویش مذاق کرتے ہوئے کہا۔ حضرت علامہ تعبیر و تاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمایئے، کہ آدمی کھاتا پیتا رہے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے۔ فرمایا۔ سہل ہے قلم و کاغذ لیکر لکھو!۔

"ایسا مرد چاہیے جو اس وکیل صاحب کو صبح صادق سے مغرب تک جوتے مارتا جائے۔ یہ جوتے کھاتے جائیں اور غصے کو پیتے جائیں اسطرح کھاتے جائیں اور پیتے جائیں۔

جاؤ اس طرح کھاتے پیتے رہو۔ روزہ کبھی نہ ٹوٹے گا۔"

مُجاہدِ ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۱۸ھ
۱۹۰۱ء

○

۱۳۸۲ھ
۱۹۶۲ء

کو اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا رہا۔
مولانا حفظ الرحمٰن ادارہ حربیہ کے افسر انچارج یا کمانڈر تھے۔ مولانا اسی حیثیت سے مراد آباد پہنچے مگر حسب معمول سادے کپڑوں میں ملبوس کھدر کی شیروانی جو بوسیدہ تھی۔ احباب نے عرض کیا کہ آپ کو تو فوجی لباس میں ہونا چاہیے۔ آپ کی خاموشی اس کا جواب تھا۔ چند روز بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی، مقدمہ چلا لیکن جرم ثابت نہ ہوا اور رہا کر دیے گئے۔ اور اس سلسلے میں ایک بات حکومت کی شاطرانہ پالیسیوں میں سے یاد رکھنے کی ہے کہ اس نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دے رکھا تھا۔ لیکن جمعیۃ علماء ہند کو خلاف قانون قرار نہیں دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت اور اس کے کارندے عام طور پر یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ ہندو تحریک آزادی چلا رہے ہیں۔ مسلمان اس میں شریک نہیں ہیں اگر جمعیۃ علماء ہند کو خلاف قانون قرار دیا جاتا تو اس کے فریب اور پروپیگنڈہ کا پردہ چاک ہوتا تھا۔ لیکن عملاً جمعیۃ کے ساتھ یہ ہوتا تھا کہ اس کے دفاتر پر چھاپے پڑتے تھے۔ نمایاں کارکنوں کو گرفتار کیا جاتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ

دہلی گھنٹہ گھر میں کانگریس کا خلافِ قانون جلسہ

کانگریس خلاف قانون تھی لیکن اس کے باوجود اس نے طے کیا کہ اس کا سالانہ جلسہ حسب معمول ہو گا صدر کا انتخاب ہوا۔ تاریخ مقرر کی گئی وقت بھی مقرر ہوا اور دل چسپ بات یہ کہ اس جلسہ کی جگہ دہلی کا گھنٹہ گھر تجویز ہوا جو چاندنی چوک میں واقع ہے۔ کانگریس اور حکومت دونوں کے لیے یہ جلسہ وقار کا مسئلہ بن گیا۔ حکومت نے سی آئی ڈی کا جال پھیلا دیا۔ بسوں میں گاڑیوں میں انتظار گاہوں میں ہر جگہ سی آئی ڈی دہلی کے چپہ چپہ پر سی آئی ڈی موجود تھی چند منٹ پہلے تک مجوزہ جگہ پر کوئی انتظام نہ تھا۔ حکومت کے کارندے خوش تھے کہ ہم کامیاب ہو گئے۔ لیکن عین وقت پر آس پاس کے گلی کوچوں سے ایک جھپکے میں اتنی تعداد اکٹھی ہو گئی کہ پولیس کی خاصی نفری اپنے کو ناکافی سمجھنے لگی۔ جب تک مزید پولیس آئی۔ آنے والوں نے کارروائی شروع کر دی انقلاب زندہ باد، کانگریس زندہ باد وغیرہ نعرے لگے۔ صدر نے حلف نامہ آزادی پڑھا۔ آزادی کی تجویز پیش کی جو منظور ہوئی۔ جلسہ برخاست ہوا اور سامعین و منتظمین غائب۔ اس پورے جلسے کی کارروائی پھر اس کے انتظام میں مولانا حفظ الرحمٰن کا تدبر اور حاضر حواسی شریک رہی اور کہا جا سکتا ہے کہ جلسہ کی کامیابی میں ان کا خاصہ دخل تھا۔ آپ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ بیچاری پولیس آپ کو وہیں سمجھتی رہی مگر آپ وہاں سے خفیہ نکل گئے۔ آپ ہمیشہ کھدر کے کپڑوں میں ملبوس رہتے مگر اس دن راستے اور دہلی میں گرفتاری سے بچنے کے لیے لٹھے کا پاجامہ ولایتی کپڑے کی شیروانی جسے پوری صفائی سے پورے انداز میں باندھ کر سفر کیا دہلی سٹیشن پر اترتے ہی ہاتھ میں بیش قیمت عمدہ چھڑی تھی اور اس نوابی شان سے دہلی میں داخل ہوئے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ یہ حفظ الرحمٰن ہے۔ حالانکہ پولیس کو آپ کی آمد کی توقع تھی۔ کیونکہ ہمیشہ ایسے کاموں میں آپ سرگرم رہتے تھے۔

جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کا اتحاد

۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کا نفاذ ہوا ———— اگر ایکٹ کو اپنایا جائے۔ تو وزارتیں قائم ہوتی تھیں اور اس کے لیے انتخابات ضروری تھے۔ تحریک آزادی میں شمولیت اور قائدانہ حصہ لینے پر جمعیۃ علماء ہند کا وقار اور اس کی شہرت یو پی، سی پی اور بہار وغیرہ میں بہت تھی۔ اگر وہ دوسری قوم پرست جماعتوں سے مل کر محاذ بناتی تو خاصی سیٹیں لے جاتی، لیکن اس موقعہ پر قائد اعظم محمد علی جناح نے جمعیۃ علماء کی طرف دست تعاون

بڑھایا، اور جمعیۃ علماء ہند کے عام اجلاس منعقدہ دہلی میں تشریف لانے کی خواہش کا اظہار کیا، ادھر سے پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ قائد اعظم، مولانا شوکت علی مرحوم، نواب محمد اسمٰعیل نے اکابر جمعیۃ سے گفتگو کی اور جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کا آپس میں اتحاد ہو گیا اور یہ معاہدہ یہاں تک پہنچا کہ اگر کانگریس کسی حلقے سے مسلمان امیدوار کو کھڑا کرے گی۔ وہاں مسلم لیگ کا امیدوار کھڑا نہیں ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ اب پلیٹ فارم دو رہ گئے تھے مسلم لیگ اور کانگریس۔ جب انتخابات ختم ہوئے تو قوم پرور مسلمانوں کا کرئی سٹیج نہ رہا۔ ان جماعتوں کا اتحاد کیوں ختم ہوا یہ ایک طویل داستان ہے یہاں اس اتحاد کا ذکر اس لیے ناگزیر ہے کہ عام طور پر لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے مسلم لیگ اور قائد اعظم کی مخالفت کی حالانکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دونوں جماعتیں بغلگیر ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں جمعیۃ کی ساکھ بھی کمزور ہوئی لیکن اتحاد و اتفاق کے پیش نظر یہ قبول کیا گیا ان باتوں کی موجودگی اور ایسے واقعات کے تاریخ کا ایک حصہ ہونے کے باوجود بعض حلقے یہی رٹ لگائے جاتے ہیں کہ یہ ہمیشہ قائد اعظم کے مخالف رہے۔

۱۹۴۲ء کوئٹ انڈیا کی تجویز

۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی۔ ہٹلر کی فوجیں سٹالن گراڈ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں اور اس کے نئے حلیف جاپان نے سنگاپور کے قریب برطانوی بحری بیڑے کے سب سے بڑے جنگی جہاز (پرنس آف ویلز) کو غرق کر دیا تھا اور اس کے ہوائی جہاز کلکتہ تک تاخت و تاراج کرنے لگے تھے۔ برطانیہ کی حکومت پر ایسی پریشانی کا عالم تھا کہ شاید ہی کبھی آیا ہو اور اسی پریشانی کے عالم میں کانگریس نے بمبئی میں سالانہ اجلاس کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ان حالات میں کانگریس سے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ وہ حکومت برطانیہ کا ہاتھ بٹائے گی بلکہ یہ یقینی تھا کہ وہ ان نازک حالات سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ پر ایک بھرپور وار کرے گی۔ حکومت کی کوشش تھی کہ اجلاس کو ناکام بنایا جائے اور کانگریس کی کوشش تھی کہ اجلاس کامیاب ہو۔ ان ہنگامی حالات میں اس اجلاس کے متعلق کام کرنا ہر کسی کا کام نہ تھا، بلکہ ان حربوں اور اقدامات کو دیکھ کر جو حکومت بروئے کار لا رہی تھی اچھے اچھے آدمیوں کے پتے پانی ہو رہے تھے۔ مسلح پولیس اور فوج مستعد، مشین گنیں اور ٹینک تیار، خیال تھا کہ جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی تاریخ کو دہرایا جائے گا یا قصہ خوانی بازار کی روداد تازہ کر دی جائے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور ملک کے ہر باشندہ سے زیادہ مستعد و جفاکش، قوم کی طرف سے آپ کو مجاہد ملت کا خطاب ملنے والا تھا۔ لہٰذا آپ انہی حالات میں سیوہارہ سے بمبئی پہنچے اور علی بہادر خاں کے پاس قیام فرمایا۔

حکومت کو علم تھا کہ کانگریس اس اجلاس میں ہندوستان خالی کردو کی QUIT INDIA کی تجویز پاس کرنے والی ہے۔ اگر برطانیہ پر جنگ کی اتنی بڑی مصیبت نہ ہوتی تو شاید کانگریس کو قبل از وقت ہی خلاف قانون قرار دے دیا جاتا۔ مگر اب اس اجلاس کے بعد بھی شاید حکومت مجبوریوں کی بنا پر خلاف قانون قرار نہ دیتی۔ لیکن یہ قرارداد تقریباً بغاوت کے مترادف تھی اس کو پاس کرنے والے باغی، لیکن سوال یہ تھا کہ ان باغیوں کو گرفتار کون کرے۔ صوبہ بمبئی کی حکومت یا اس میں شریک ہونے والے کے وطنی صوبہ کی حکومت، حکومت بمبئی اس کے لیے تیار نہ تھی کہ بمبئی جیسے شہر میں سینکڑوں ممبروں اور لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل خانوں میں غیر محدود مدت تک ان کی ناز برداری کے فرائض انجام دیتی رہے۔ لہٰذا سرکاری پالیسی یہ طے پائی کہ گرفتار کرنے کا فرض دوسرے صوبوں کی حکومتیں انجام دیں یعنی جو ممبر جس صوبے کا ہو اسی صوبے کی حکومت اس کو گرفتار کرے۔

مولانا کی گرفتاری: مولانا حفظ الرحمٰن صاحب چونکہ یو۔پی کے تھے لہٰذا ان کی گرفتاری یو۔پی حکومت کے حکم سے ہونا تھی۔ گرفتاری ناگزیر

جمعیۃ کے باضابطہ ناظم اعلیٰ

۱۹۴۲ء میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو جمعیۃ کے ناظم اعلیٰ بنانے کی تجویز تھی۔ لیکن سیاسی حالات نے اپنی طرف متوجہ رکھا اور پھر گرفتاریاں ہو گئیں۔ ۱۹۴۴ء میں جرمنی کی جنگ دم توڑ رہی تھی، ہٹلر کی خودکشی اور میزوشیما پر ایٹم بم داغنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کامیابی کی روشن توقعات نے برطانوی دماغ کی گرہیں کھول دی تھیں اور وہ مابعد جنگ کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے ہندوستان کے معاملہ میں کچھ خاص فیصلہ کرنا چاہتا تھا لہٰذا گرفتار شدگان کو رہا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مئی ۱۹۴۴ء کو مولانا حفظ الرحمٰن اور ۲۹ اگست ۱۹۴۴ء کو حضرت مدنیؒ رہا کر دیے گئے۔ ۴ تا ۷، ۱۹۴۵ء مطابق ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ کو جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس سہارنپور میں منعقد ہوا۔ حضرت مدنی صدر اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔

مجاہد ملت شہ سوار

مجلس استقبالیہ نے صاحب صدر کے جلوس کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ لیکن حضرت مدنی ان چیزوں کے سخت خلاف تھے اور خصوصاً اپنے لیے تو وہ اس قسم کی کوئی چیز برداشت نہ کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت تو تیار نہ ہوئے۔ البتہ مولانا حفظ الرحمٰن نے دلداری کے لیے شرکت منظور کر لی مجلس استقبالیہ نے ایک نہایت عمدہ شوخ گھوڑا ناظم اعلیٰ کو سواری کے لیے پیش کیا۔ آپ اس سے قبل گھوڑے پر شاید ہی کبھی سوار ہوئے ہوں، لیکن جب سوار ہوئے تو معلوم ہوتا تھا پرانے شہ سوار ہیں۔ آپ نے اپنی غیر معمولی جرأت سے گھوڑے کو قابو میں رکھا حضرت مخدوم خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ جوانی کے زمانے میں شاہ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی کے سامنے سے گزرے تھے۔ تو انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا۔

گلگوں لباس کردو سوار سمند شد!
باراں خدر کنید کہ آتش بلند شد

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات

اجلاس سہارنپور کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۹۴۵-۱۹۴۶ء کا الیکشن تھا جس میں وزارتوں کے علاوہ قوم و ملت کا فیصلہ ہونا تھا کہ مسلمان پاکستان کے حق میں ہیں یا خلاف ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ تھے اور جمعیۃ علماء ہند کا موقف تھا کہ تقسیم نہیں ہونی چاہیے اور اب اس مسئلے میں ان کے ساتھ مقابلہ تھا۔ اکابر دیوبند بھی دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے زیر قیادت تحریک پاکستان کی حمایت کر رہا تھا اور دوسرا حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں مخالفت لیکن ان دونوں گروہوں میں اختلاف دیانتداری کا اختلاف تھا۔ ہر گروہ دیانتداری اور اجتہاد سے اپنے موقف کو صحیح سمجھتا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان بہت بلند ہے تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ میں آپس میں بعض دفعہ ایسا سخت اختلاف ہوا جنگ جمل اور جنگ صفین جیسی لڑائیاں ہوئیں لیکن پوری امت مسلمہ کا فیصلہ ہے کہ ان میں سے ہر گروہ دیانتدار تھا۔ کوئی بدنیت نہ تھا۔ ان صحابہ کے ساتھ اس اختلاف کی تشبیہ سخت بے ادبی ہے تاہم سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پیروکاروں میں بھی اختلاف ہوا قوم کے سامنے دونوں گروہوں نے اپنے اپنے دلائل اور شواہد پیش کیے اور ملت اسلامیہ کی اکثریت پاکستان نے حق میں رائے دی اور اب پاکستان خدا کے فضل و کرم سے اپنی زندگی کے بائیسویں[1] سال میں ہے اور دنیا کے ہر طبقے کا مسلمان اس کی خوشحالی اور ترقی کے لیے دعاگو۔

ارباب علم کا اس بارے میں یہی فتویٰ ہوگا کہ جو صاحبان سچائی اور دیانتداری کے ساتھ جس نظریہ کے بھی حامی تھے ان میں سے کسی ایک کو خطائے اجتہادی میں تو مبتلا قرار دیا جا سکتا ہے۔ گنہگار کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجتہد کے لیے دو ثواب ہیں یا ایک ——— دو ثواب اس کو جس نے اجتہاد کیا اور اس کا یہ اجتہاد صحیح نکلا ——— ایک ثواب کوشش کرنے کا اور

[1] اب انتیسویں سال میں فالحمدللہ (طبع ثالث)

کرنے کا اور دوسرا صحیح اجتہاد کرنے کا ایک ثواب اس مجتہد کو کہ جس نے کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش صحیح نہ نکلی تو اس کو کوشش کرنے کا ثواب ضرور ملے گا۔

اس انتخاب میں متحدہ ہندوستان کے موقف کی حمایت کرنیوالی جماعتوں جمعیۃ علماء ہند۔ مجلس احرار اسلام۔ خدائی خدمتگار وغیرہ پر مشتمل ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا گیا اور اس کی طرف سے امیدوار کھڑے کئے گئے۔ اس طرح پورے ملک میں اگرچہ یہ بورڈ ہار گیا (یو۔پی بہار وغیرہ میں تیس سیٹیں حاصل ہوئیں) لیکن مجموعی طور پر جب ووٹوں کے اعداد شمار حاصل کئے گئے تو قوم پرور مسلمانوں کو ۲۵ فیصد ووٹ ملے تھے اور ۷۵ فیصد ووٹ مسلم لیگ کو۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان کس حیثیت سے رہتے۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس کے لئے ایک فارمولا تیار کیا تھا۔ جس کے اہم اجزاء یہ تھے :۔

۱۔ صوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کردیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لئے کردی گئی ہو باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کرسکے مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔

ہندو ۴۵	مسلمان ۴۵	دوسری اقلیتیں ۱۰

۵۔ جس مسئلے کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کردے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے۔ وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہوسکے۔

اس فارمولے کو جمعیۃ علماء ہند اور ہند اور دوسری جماعتیں پیش کرتی تھیں۔ لیکن قوم نے اس کو مسترد کردیا اور پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے۔

وزارتی مشن کی آمد

صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ابھی تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن جسے کرپس مشن کہا جاتا ہے کراچی پہنچ گیا۔ اس مشن میں تین ارکان تھے۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر۔ ایک ہفتہ مطالعہ و آرام کے بعد اس نے یکم اپریل کو ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کردی۔

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے حضرت مدنیؒ کو دعوت ملی۔ آپ نے اپنے ساتھ شیخ حسام الدین (مجلس احرار اسلام) خواجہ عبدالمجید (صدر مسلم مجلس) شیخ ظہیر الدین (صدر آل انڈیا مومن کانفرنس) کو دوسری جماعتوں کے نمائندہ کی حیثیت سے حافظ محمد ابراہیم کو (جو بھارت میں وزیر برقیات رہے) ترجمان کی حیثیت سے لیا۔ اس جماعت کو ایک ایسے مشیر اور نمائندہ کی ضرورت تھی۔ جو پریس نمائندگان وغیرہ کو خطاب کرسکے اس ضرورت کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو شریک کرکے پورا کیا گیا۔ اس وفد نے اپنا فارمولا (جس کا ذکر اوپر ہوا) پیش کیا۔ کرپس مشن نے اس فارمولے سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور مقررہ وقت سے ۴۵ منٹ زائد ملاقات جاری رہی۔

عارضی حکومت

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ایک کتاب میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ بھی اس فارمولے کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ اس فارمولے کو وزارتی مشن نے خاص طور پر پسند کیا۔ ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو اپنی سفارشات

ہیں بڑے مسلمان

پیش کیں وہ تقریباً انہی لائنوں اور خطوط پر تھیں۔ ان سفارشات کی بنا پر ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا کیبنٹ کے ۱۴ ممبران میں پانچ مسلمان تھے یعنی ⅓ سے کچھ زیادہ۔ مالیات کا اہم محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاںؒ کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن یہ عارضی حکومت بالکل ہی عارضی ثابت ہوئی اور بات پاکستان کی منظوری پر آکر ختم ہوئی اور ۱۴ اگست کو قیام پاکستان کا عمل ظہور میں آیا۔

ہمارے ملک میں اب تک یہ ناخوشگوار بحث چل رہی ہے کہ کون پاکستان کا مخالف تھا اور کون موافق، دیکھنا یہ چاہیے کہ جن لوگوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی قیام پاکستان کے بعد کیا وہ اب تک پاکستان کے مخالف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ایسے لوگ غدار اور قابل گردن زدنی ہیں لیکن اگر وہ محب وطن ہیں تو پھر ان کی مخالفت کیسی؟ مملکتِ پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد بیسیوں تک پہنچتی ہے جو تحریک پاکستان کے مخالف تھے مگر قیام پاکستان کے بعد وزارتوں میں شریک کیے گئے۔ ملک کی مقتدر جماعتوں کے صدر اور اعلیٰ عہدے دار رہے اور ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے جو پاکستان کی تحریک کے ہراول دستے میں تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد اپنے مفاد اور خود غرضی کی وجہ سے پاکستان میں انتشار و افتراق کا باعث ہوتے۔ ہمیں خاص کسی فرد کا نام لینے کی ضرورت نہیں، ملک کے تمام افراد ہر دو گروہوں کے ان افراد کو جانتے ہیں۔ اگر کل کوئی (قیام پاکستان سے قبل) تحریک سے دیانتداری سے اختلاف کرتا تھا، لیکن قیام پاکستان کے بعد نظریہ پاکستان کو یہاں عملی شکل میں دیکھنے کے لیے جد و جہد کرتا اور ایثار و قربانی سے کام لیتا رہا ہے تو وہ اس آدمی سے ہزار درجہ اچھا ہے جو کل پاکستان بنانے والوں میں تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد اپنے مخصوص مفادات کی خاطر ایسے افعال و کردار کا حامل رہا کہ جس سے ملکی ترقی اور نظریہ پاکستان کی عملی تشکیل میں رکاوٹ پیدا ہوتی رہی۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ اکیس[1] سال گزرنے کے باوجود ہم اپنے محبوب نظریاتی ملک کو اسلامی آئین سے ہمکنار نہ کر سکے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قیام پاکستان کے دیانتداری سے مخالف تھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ان خدمات نے ان کو اُمت مسلمہ کے ان افراد کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے کہ جن کی ذات پر پوری امت مسلمہ کو فخر ہے اور وہ تاریخ اسلام کے اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔

مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن ۱۹۴۷ء میں

۱۴ اگست کو قیام پاکستان عمل میں آیا اور ۱۵ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اسی شب کو بارہ بجے پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں انتقال اختیارات کا منشور پڑھا گیا اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں ایک پر شکوہ تقریب منعقد ہوئی ـــــ مولانا حفظ الرحمٰن نے خوشی خوشی تمام تقریبات میں شرکت کی۔ مولانا مرحوم نے آزادی وطن کے لیے جس طرح جان کی بازی لگائی اور جوانی کی تمام امنگیں اس کے لیے قربان کر دی تھیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک کی فضاؤں پر حریت و استقلال کی صبح مقصود نمودار ہو رہی تھی اس کی مسرتوں اور طرب آفرینیوں کا پورا لطف بھی کچھ انہی کو حاصل ہوا ہوگا اور ان ہی جیسے لوگوں کا حق تھا۔

بہر حال ملک آزاد ہونا تھا ایک تاریخ آئی اور آزادی کی رسم پوری ہو گئی۔ آزاد ہندوستان کے جھنڈے لہرانے لگے آزادی کے ترانوں سے فضائیں گونج اٹھیں یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے ـــــ اور اس کے بعد ـــــ یکایک ـــــ ایک سناٹا ـــــ

[1] اور اب انتیس سال کے بعد بھی (طبع ثالث)

گھٹا ٹوپ اندھیرا ایک ہیبت ناک منظر اور جان لیوا دہشت۔ ——— گویا بھارت کی دھرتی پر بلاؤں کا دیوتا اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھ برس ہی پڑا ہو۔ تاریخ کو شاید ایک ایسے وقت کا انتظار تھا جو ۱۵ اگست کی خوشیاں بھلا دے ——— مگر یہ سب بلائیں۔ آفات اور مصیبتیں، شدائد اور تکلیفیں پورے بھارت کے لیے نہ تھیں یہ سب کچھ بھارت کی اقلیت اور صرف ایک اقلیت کے لیے تھا جس کا نام مسلمان تھا اور اس اقلیت کے لیے تھا جو سینکڑوں برس ہندوستان پر حکومت کرتی رہی۔ لیکن پھر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے انگریز کی غلام بن گئی اور ڈیڑھ سو سال تک اسی طرح گزر گیا۔ اس کے بعد اس کا ایک بڑا حصہ خوبی قسمت سے آزاد ہو گیا۔ لیکن دوسرا حصہ شومئی قسمت سے انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنے ہی ملک کی اکثریت کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گیا اور کہنے کو تو وہ آزاد ہے، لیکن غلاموں سے بدتر ———

——— دلی اپنے اندر کئی انقلابات کو سموئے ہوئے ہے کبھی وہاں اشوک کمار اور بکرماجیت کا جھنڈا لہراتا تھا۔ لیکن ایک صبح دیکھا گیا کہ جمنا کے کنارے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام وضو کر رہے ہیں انھوں نے توحید و رسالت سے بھرپور نغمے اذان کی صورت میں ہر چہار طرف بکھیر دیے اور تقریباً سات سو برس یہ توحیدی نغمے دلی سے راس کماری آسام اور پشاور تک گونجتے رہے اور دلی کے تخت پر قطب الدین ایبک محمد تغلق، بابر، شاہجہان اور اورنگ زیب جیسے اولوالعزم انسان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بن کر پورے ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے پھر دیکھا گیا کہ مسلمانوں کا زوال ہو رہا ہے۔ لیکن اسی زوال کے دور میں شاہ ولی اللہ محدث جیسے نادرۂ روزگار انسان نے یہاں جنم لیا انھوں نے نرمی گرمی سے حکمرانوں کو نصیحتیں کیں جو بے اثر رہیں تاآنکہ دلی کا آخری تاجدار صرف قلعہ میں تاجدار رہ گیا اور پھر اسی تاجدار کے سامنے اس کے عزیزوں کے سر تھال میں رکھ کر پیش کیے گئے اور اس کو رنگون میں جلاوطن کر دیا گیا۔

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لیے دو گز زمیں نہ ملی کوئے یار میں

اور دلی کے گوشے گوشے میں علماء کے لیے پھانسیاں لٹکائی گئیں۔ اشراف کو ذلیل کر دیا گیا۔ دلی کے درو دیوار نے دیکھا کہ جن شہزادوں کے خرام ناز سے موج آجاتی تھی وہ دربدر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ ہندوستان کی دولت لٹتی رہی اور اس سے انگلستان کے کوچہ و بازار میں زینت کے سامان جمع ہوتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ دلی میں اس ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور ایک دن دیواروں پر اشتہار چسپاں تھے کہ ہندوستان خالی کر دو ——— ۱۵ اگست، ۱۹۴۷ء کو قانونی طور پر انگریز ہندوستان سے چلا گیا اور لال قلعہ پر ہندوستان کا اپنا جھنڈا پورے شکوہ سے لہرانے لگا۔

۱۸۵۷ء کے پورے نوے سال اسی دن بعد دلی کے کوچہ و بازار پھر خون سے رنگین ہونا شروع ہوئے۔ لیکن اب کے قتل و خون کی اس گرم بازاری میں دلّی کے صرف مسلمان کا خون بہتا تھا اور بہانے والے اسی ملک کی اکثریت کے باشندے تھے۔ انتقال آبادی کے نتیجے میں مغربی پنجاب سے غیر مسلم پناہ گزینوں کے قافلے دھڑا دھڑ دہلی میں داخل ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وحشت و بربریت کا بے قابو سیلاب دلّی کی طرف بڑھ رہا تھا تین روز تک نہ صرف دہلی اسٹیشن پر قتل عام ہوتا رہا بلکہ شہر کے اندر بھی کشت و خون کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ آناً فاناً نئی دہلی کی وسیع آبادی پہاڑ گنج۔ قرول باغ، سبزی منڈی شاہدرہ اور قرب و جوار کے دیہات سے لاکھوں مسلمان اجڑ کر جامع مسجد اور مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزین ہو گئے۔

اسلامی تاریخ میں جب ہم بغداد، کوفہ، شیراز، قرطبہ، غرناطہ، بخارا اور غزنی کا نام پڑھتے ہیں تو ایک خاص قسم کا شکوہ ان ناموں میں نظر آتا ہے۔ بعینہٖ یہی تصور و شکوہ دلی میں نام پایا جاتا ہے۔ مگر جس طرح انقلابات عالم کے ہاتھوں مسلمانوں کی شامتِ اعمال کی وجہ سے اب

تھے ـــــ جو شخص اپنے عقائد کا پکا ہو بہادر بھی ہوا کرتا ہے اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کیے ہیں مولانا بھی اپنے دھن کے پکے تھے اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ میں گھبراتے نہیں تھے میں نے ان کو کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا۔ ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا میں پولیس لے کر فوراً موقعہ پر پہنچا۔ دیکھا کہ مولانا پہلے ہی وہاں موجود ہیں میں نے گزارش کی کہ اب آپ تشریف لے جائیے میں یہاں کی دیکھ بھال کر لوں گا میں نے ہر چند چاہا کہ پولیس ساتھ کر دوں تاکہ مولانا گلی قاسم جان تک پہنچا آئے، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کے لیے بھیج دیا۔ مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جان کی طرف چل پڑے بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں آہستہ سے ان کے پیچھے ہو لیا تاکہ راستے میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آ جائے۔ مولانا کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سرمایہ تھی جسے ہم کسی قسم کے خدشہ میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے اس واقعہ کا ذکر آج پہلی بار کر رہا ہوں مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔[1]

مجاہدِ ملت کے تین خاص وصف

مجاہدِ ملت کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے جنہوں نے مجاہدِ ملت کو ملک و ملت کا بہترین رہنما بنا دیا اور جن کی وجہ سے نہ صرف ان کی شخصیت ابھری بلکہ ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی ان صفات اور شخصیت سے حیاتِ تازہ کا پیام پایا ورنہ ہندوستان میں ان کی حیثیت غلامانہ ہو گئی تھی۔ مولانا کے یہ تین جوہر تدبر، جرأت اور خطابت تھے۔ تدبر سے تقاضۂ وقت سمجھ کر جرأت سے عملی قدم اٹھاتے اور قوتِ بیان سے سمجھاتے تھے۔

مجاہدِ ملت کا حسنِ تدبر اور گاندھی جی

مجاہدِ ملت اور ان کے رفقاء کا تعارف گاندھی جی سے پہلے سے تھا۔ جیسے ہی گاندھی جی نواکھالی اور کلکتہ سے واپس ہو کر دہلی پہنچے۔ مجاہدِ ملت کا حسن تدبر تھا کہ آپ نے اپنے پرانے تعلقات کو از سر نو تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کر کے ایسا اعتماد حاصل کر لیا کہ گاندھی جی حکومت کے سربراہوں اور کانگریس کے بڑے ہندو لیڈروں پر بھی اتنا اعتماد نہ کرتے تھے جتنا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے ساتھیوں پر گاندھی جی ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے تو فرقہ پرستوں نے ان کی اتنی مخالفت کی کہ انھیں اپنی پرارتھنا کی مجلس میں ترمیم کرنا پڑی، مجاہدِ ملت جو فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما تھے گاندھی جی کے دست راست بن گئے مجاہدِ ملت کو سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی رفاقت و معیت حاصل تھی۔ بلکہ عجیب و غریب حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد سعید جو چند سال سے قلب کے مرض میں مبتلا تھے۔ نقل و حرکت سے معذور ہو کر تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مجاہدِ ملت نے ان کو کنج عزلت سے نکالا بلاشبہ سحبان الہند کا خود اپنا جذبہ اور ان کے قلب بیمار کی بھی تڑپ تھی کہ انھوں نے مجاہدِ ملت کی دعوت پر لبیک کہا اور ضعف و نقاہت کے باوجود مولانا کا ساتھ دینے کے لیے گوشۂ عافیت سے نکل آئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں اس وقت تک کوئی گاڑی نہ تھی دلی کے مشہور تاجر حافظ محمد نسیم صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی وہ صبح گاڑی لے کر دفتر پہنچ کر مجاہدِ ملت کو ساتھ لے کر مولانا احمد سعید کے پاس جاتے وہاں ایک مشہور صحافی سید محمد جعفری سابق ایڈیٹر "ہمدرد" دہلی بھی وہاں موجود ہوتے یہاں سے پھر چاروں حضرات گاندھی جی کے پاس جاتے اور ان کو شہر کے صحیح صحیح حالات بلا کم و کاست روزانہ سناتے۔ شروع شروع میں گاندھی جی نے اپنے طور پر دوسرے اسباب و ذرائع سے بھی حالات کا جائزہ لیا اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ یہ حضرات مجھے بالکل صحیح حالات سے روشناس کراتے ہیں تو پھر ان پر اتنا اعتماد کرنے لگے کہ مدیر داخلہ سردار پٹیل باوجود پوری کوششوں کے انکے اس اعتماد کو ختم نہ کر سکے

۱۔ مہر درخشاں یہ "از کنور مہندر سنگھ بیدی، مجاہد ملت نمبر" الجمعیۃ" دہلی ص ۱۵۹

رہے۔ قوم پرستی ہی قرار دیا۔ بہت سے بہت لفظ "جارحانہ" کا اضافہ کر دیا یعنی فرقہ پرستوں کی ہنگامہ آرائیاں قوم پرستی ہی کا تقاضا ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ جارحانہ قوم پرستی ہے۔ جبکہ مظلوم مسلمان کی آہ و زاری کو بھی فرقہ واریت اور نہ صرف فرقہ واریت بلکہ پاکستانی ذہنیت کا شاخسانہ قرار دیا جاتا رہا۔

مجاہد ملت کا ظرف وسیع اور حوصلہ عالی یقیناً اپنی مثال آپ تھا کہ باوجودیکہ سربراہوں کی یہ مسموم ذہنیت مجاہد ملت کے لیے رات دن کی کڑھن تھی تب بھی سیکولرازم کی حمایت میں اٹھا ہوا قدم تیز سے تیز تر ہو رہا تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی لغزش اس قدم میں آئے۔ لیکن چند سال بعد ہی ذمہ داران حکومت کی اس چشم پوشی کا نتیجہ سامنے آگیا جب ۵۹ء میں انہوں نے دیکھا کہ خود ان کا ماحول ان کے خلاف ہو چکا ہے اور کارپردازان حکومت کی اکثریت فرقہ واریت کی وبا میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے وقتی ہنگاموں کے بعد جو فسادات گزشتہ پندرہ سال میں ہوئے ان کا شمار مشکل ہے۔ ہر فساد کے موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے وفود بھیجے جاتے تھے، اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کی جاتی تھی، مگر ان وفود میں خود مجاہد ملت شریک نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ اہم مواقع پر مولانا محمد میاں صاحب کو بھیج دیا کرتے تھے، ورنہ اور ساتھیوں کو مامور فرما دیتے تھے، مگر ۵۹ء میں رمضان شریف کے ایام میں مبارک پور اور بھوپال میں ہنگامے ہوئے ان کا جائزہ لینے کے لیے خود مجاہد ملت نے سفر فرمائے۔ روزہ میں مجاہد ملت کی ذیابیطس کی تکلیفیں بڑھ جاتی تھیں، مگر ان سفروں کے لیے نہ روزہ عذر بن سکا نہ ذیابیطس کی تکلیف راستہ روک سکی۔

۵۷ء کے ہنگاموں میں مراد آباد وغیرہ میں بھی بعض موقعوں پر ثابت ہوا تھا کہ مقامی حکام اور پولیس نے مظلوموں کی بجائے ظالموں کا دست و بازو بن کر کام کیا ہے، مگر واقعات کچھ اس قسم کے تھے کہ حکام کی اس غلط کاری کا عذر قابل تسلیم ہو سکتا تھا، لیکن مبارک پور اور بھوپال کے ہنگاموں نے کھلے طور پر ظاہر کر دیا کہ فرقہ واریت کی وبا سرکاری حلقوں کو بھی یہاں تک متاثر کر چکی ہے کہ بدامنی کے زمانہ میں پولیس بھی وہ کر گئی ہے جو فرقہ وارانہ جماعتوں کے والنٹیئر اور رضا کار کر سکتے تھے۔

مجاہد ملت کانگرسی حلقوں میں بہت کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ کانگریس ان کو الیکشن کے موقعہ پر ٹکٹ دیا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت اور کانگریسی حلقوں میں محبوبیت امیدواروں کی عملی طاقت کو کمزور اور ان کی قوت گویائی کو سلب کر دیتی ہے، لیکن مجاہد ملت کی ہمت عالی اس کمزوری سے پاک تھی، آپ نے خاموشی کے بجائے بے پناہ خطابت سے کام لیا، مبارک پور اور بھوپال وغیرہ کے ہنگاموں پر وہ بیانات دیئے، جنہوں نے ان ریاستوں کے چیف منسٹروں کے درمیان ایسا محاذ قائم کر دیا جس کو توڑنے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کو دخل دینا پڑا۔

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک طرف مجاہد ملت تھے اور دوسری جانب مدھیہ پردیش اور یوپی کے چیف منسٹر اور ان کے حامی، مگر صداقت، انصاف اور حقیقت پسندی نے حضرت مجاہد ملت کی قوت خطابت میں استدلال کی بے پناہ طاقت پیدا کر دی تھی، جس نے صرف ان چیف منسٹر صاحبان کو لاجواب ہی نہیں کیا بلکہ پوری ورکنگ کمیٹی کو مجاہد ملت کی حمایت پر مجبور کر دیا۔ یہ درست ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند کی جماعتی طاقت، اس کی مجلس عاملہ کی تجاویز وہ متعدد میمورنڈم جو مرکزی حکومت کے ارکان اور کانگریس کے ہائی کمان کو بار بار پیش کیے گئے تھے۔ حضرت مجاہد ملت کی پشت پر تھے، مگر یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں بالخصوص جمعیۃ علمائے ہند کی خوش نصیبی تھی کہ مجاہد ملت کی پرشوکت خطابت اور ناقابل تسخیر قوتِ استدلال ان کو میسر آئی تھی۔ آج اس قوت و طاقت کے نقصان پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

کنونشن کی تجویز: ہندوستان کے دستور میں اگرچہ ہندوستان کی حکومت کو سیکولر (غیر مذہبی) کہا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام لوگوں میں تو کیا حکومت کے دائرہ کار میں بھی اس کا احترام نہ کیا گیا۔ لوکل باڈیز، اسمبلی پارلیمنٹ وغیرہ کے سرکاری اداروں میں فرقہ پرستی کی تباہ کاریوں سے آئے دن مسلمان تباہ ہو رہے تھے اور پھر یہ فرقہ پرستی فسادات کی صورت میں ہی ظہور پذیر نہ ہوتی

استغناء و بے غرضی

طبیعت کے استغنا کا یہ حال تھا کہ زندگی کے اس دور میں تو بڑے بڑے دولت مند تاجر، نواب اور اصحاب اختیار ان کے احترام میں دو زانو رہتے تھے اپنے ہاں دعوتوں پر بلاتے۔ بڑے بڑے قیمتی ہدیے پیش کرنا چاہتے، مگر مولانا کی بے نیازی اور بے رخی نے کبھی کسی کو موقع ہی نہ دیا، جمعیۃ علماء کی انہوں نے عمر بھر خدمت ہی نہیں کی بلکہ چار چاند لگا دیے۔ اٹھارہ برس اس کے سربراہ رہے اور اپنی بھرپور صلاحیتیں اس کی آبیاری پر صرف کیں لیکن کبھی کسی قسم کا کوئی معاوضہ، کوئی الاؤنس، آنریریم یا کسی طرح کی منفعت اس سے حاصل نہیں کی، اپنی کتابوں کی آمدنی ہی ان کا کسب معاش تھا۔

کانگریس کے حلقوں میں بھی ان کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے۔ کانگریس ٹکٹ پر انہوں نے تین بار پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے (۵۲ء میں حلقہ بادی اور ۵۷ء، ۶۲ء میں حلقہ امروہہ ضلع مراد آباد سے) مگر پیش کش اور اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی کانگریس کے انتخابی فنڈ سے کوئی امداد قبول کرنا گوارا نہیں کیا

ہمدردیٔ خلائق

مخلوق خدا کی ہمدردی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ بلا استثناء و بلا امتیاز ہر کس و ناکس، اپنے اور بیگانے، مسلم اور غیر مسلم سب کی خدمت ان کا عزیز ترین شغل تھا اور دن رات کا بیشتر حصہ اسی میں گزرتا تھا، کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کا خواہاں ہے کوئی وظیفہ اور امداد کے لیے سرگرداں، کسی کو کالج کے داخلہ میں دشواری پیش آ رہی ہے تو کوئی امتحان میں دو چار نمبروں سے رہ گیا ہے۔ کوئی اپنے پرمٹ کی میعاد میں توسیع چاہتا ہے، کوئی اپنی مقدمہ بازی کے لیے وکیل سے فیس میں رعایت کے لیے کوشاں ہے کسی کو مکان یا دکان کی ضرورت ہے تو کوئی بجلی یا پاور کا کنکشن لینا چاہتا ہے کسی کی فصل اور کھیتی خراب ہو گئی ہے اور پورا لگان دینے کے قابل نہیں ہے۔ تو کسی کی بیٹی جوان بیٹھی ہوئی ہے اور کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا ہے غرضیکہ صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صدہا کام تھے جن کے لیے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں کسی کو سفارشی خط لکھ کر دے رہے ہیں۔ کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کرا رہے ہیں اور کسی کے لیے بالواسطہ در واسطہ سفارشیں کرا رہے ہیں خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد تو سرکاری حلقوں میں ان کی عزت و منزلت ایک عوامی رہنما ہونے کے لحاظ سے یا پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے ان کے اثر و رسوخ پر لوگوں نے گویا جھولنا شروع کر دیا تھا، مولانا کی طبعی شرافت اور ہمدردی کا دامن اس قدر وسیع تھا کہ جس نے بھی ان کے سایہ میں سر چھپانا چاہا انہیں نہ راستہ چلتے کسی ضرورت مند کی مدد سے گریز تھا نہ آدھی رات گئے کسی کے آنے پر کوئی ناگواری بعض اوقات تو بڑی بڑی اونچی شخصیتیں بھی اپنے کاموں کے لیے ان کی مدد اور سفارش ڈھونڈتی تھیں، آج کون اندازہ کر سکتا ہے صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صدہا کام تھے جن کے لیے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا، کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں۔ کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کرا رہے ہیں اور کسی کے لیے واسطہ در واسطہ سفارشیں کرا رہے ہیں۔

قلب کی وسعت اور عالی ظرفی

دنیا میں ان کے پایہ کے انسان ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں بھی شاید دو چار ہی مل سکیں۔ یوں تو ہر وقت ہی ان کے وسعت قلبی کے مشاہدات آنکھوں سے گزرتے رہتے تھے اور ہم خدام کار کے ساتھ تو انکے سلوک مہر و شفقت کا ذکر ہی کیا ان کے جیتے جی افسر و ماتحت کا کوئی امتیاز کبھی درمیان میں حائل ہی نہیں ہوا۔

اپنے عقیدہ اور مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے جہاں تک خدمت عمل کا تعلق ہے ان کی دردمندیوں کے سایہ میں دار العلوم دیوبند

اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک ہی درجہ تھا، جدید و قدیم، مقلد اور غیر مقلد، شیعہ اور سنی، خوجے اور بوہرے، مسلم لیگی اور کانگریسی بلکہ مسلم اور غیر مسلم ہر انسان کی خدمت وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ عقیدہ اور مسلک کا اختلاف ان کو کسی کی خدمت سے باز نہیں رکھتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان تمام حلقوں میں یکساں طور پر ان کو احترام اور اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کسی بھی گروہ نے ان کو اپنے لیے غیر اور اجنبی محسوس نہیں کیا۔

رواداری اور اعتماد

ان کی شرافتِ نفس کا قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ دوسروں کے ساتھ بے انتہا رواداری، احترام اور اعتماد کا معاملہ کرتے تھے ہمیشہ ہر معاملہ میں دوسروں کا احترام ملحوظ رکھتے اور ہر موقع پر دوسروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے اپنے ساتھیوں اور رکارکنوں پر حد درجہ اعتماد کرتے کسی سے شکایت کا موقع بھی ملتا تو وقتی ناگواری کا اظہار ضرور کرتے، مگر دلی تعلق میں کبھی بال برابر فرق نہ آنے دیتے۔

جرأت حق اور مقام عزیمت

مولانا مرحوم کے افکار و کردار کا سب سے اہم اور جوہری وصف ان کی جرأت حق اور استقامت و عزیمت تھی ان کی پوری زندگی اس وصف و کمال کا ایک مسلسل اور شاندار مظاہرہ رہی ہے اہم سے اہم اور نازک معاملات میں بھی جب وہ اپنی کوئی رائے قائم کرتے تو کسی اندیشہ اور کسی لالچ کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی تھیں ہر معاملہ میں کھلے دل سے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان سوچنا اور فیصلہ کرنا اور فیصلہ کر لینے کے بعد اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا، یہی ان کا صحیح موقف تھا ان کی زندگی میں بارہا ایسے موقعے بھی آئے جہاں ان کی جرأت و حوصلہ اور ثباتِ فکر و نظر کے لیے بڑی آزمائشیں درپیش تھیں، مگر ان کے کردار میں کوئی تزلزل راہ نہ پا سکا۔ چند برس پہلے ہی ایک صاحب نے گاندھی جی کی پرارتھنا پر شرعی نقطہ نظر سے فتویٰ چاہا۔ اگرچہ عام طور پر فتویٰ لکھنے سے مولانا ہمیشہ بچتے تھے، اور دوسرے علماء کرام پر محمول کر دیتے تھے، لیکن جب یہ خاص سوال سامنے آیا تو مولانا نے پوری اہمیت کے ساتھ فوراً اس کا جواب خود لکھا اور بہت صاف لفظوں میں مسلمانوں کے لیے یہ پرارتھنا شرعاً ناجائز قرار دی یہ سوال حقیقتاً ایسا تھا کہ مولانا تو خیر پکے کانگریسی اور گاندھی جی کو لیڈر ماننے والوں میں سے تھے۔ اگر کسی غیر کانگریسی عالم کے سامنے بھی رکھا جاتا تو ملک کے حالات اور گردوپیش میں بہت مشکل ہوتا کہ اس صفائی اور جرأت کے ساتھ اس پر نکیر کا فیصلہ دے دیتا۔

اب آخری دنوں میں مسلم کنونشن کا معاملہ بھی مولانا کی جرأتِ فکر و عمل کی ایک مثال بن گیا کیونکہ وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک شروع میں اس کے خلاف تھے، لیکن مولانا کے لیے یہ بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، کسی نے پوچھا کہ پنڈت جی کی قطعی مخالفت کے بعد بھی کیا آپ کنونشن ضرور بلائیں گے مولانا نے پوری مضبوطی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ پنڈت جی کی رائے بھی اس کے خلاف ہے تو ہو۔ ہم ان کی مخالفت کے ڈر سے کنونشن کا خیال ترک کر دیں، یہ ممکن نہیں۔

زندگی کے آخری ایام۔ مرض اور وفات

جبل پور، ساگر وغیرہ کے ان حوادث سے مولانا مرحوم کو جو قلبی اور ذہنی اذیت پہنچی اور اصلاح کے لیے ان تھک جدوجہد کا جو بے پناہ بوجھ پڑا اس نے مولانا مرحوم کی بڑھاپے کی صحت اور توانائیوں کو بے حد مضمحل کر دیا، رمضان کا مہینہ تھا اور اپنے معمول میں وہ سال کے گیارہ مہینے برابر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے، مگر رمضان میں دہلی سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتے تھے، مگر اس حال میں حالات کی سنگینی نے ان کے اس معمول کو بھی قائم نہ رہنے دیا ۸۔ فروری کو جب وہ آسام کے طویل سفر سے واپس آئے بے حد تھکے ہوئے تھے بخار بھی تھا یہاں آتے ہی انہیں جبل پور کی تشویشناک خبروں سے واسطہ پڑا اور پھر مسلسل کام میں لگا رہنا پڑا۔ رمضان ہی میں وہ جبل پور ساگر وغیرہ گئے۔ پھر کنونشن کی تیاریوں کا عظیم بوجھ بھی ان ہی پر پڑا۔ اس دوران میں بعض رفقاء کار نے بھی اپنی غلط روش سے مولانا کی قلبی اذیتوں میں اضافہ کیا اور ایسے نازک وقت میں ان کا دل دکھایا شاید اسی وقت سے مولانا کے شعور پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنی

مزید تحقیق کے لیے خون ٹیسٹ کرایا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے ڈاکٹر پانڈے نے فوراً ہی مولانا کو بمبئی لے جانے کی ہدایت کی چنانچہ ۲۹ جنوری کو صبح ہی ہوائی جہاز سے مولانا کو بمبئی لے جایا گیا۔ گورنر بمبئی شری پرکاش مولانا کے پرانے رفیق اور دوست تھے انہوں نے پورے اہتمام کے ساتھ ٹاٹا ہوسپٹل میں مولانا کو داخل کرایا۔ ایک ماہ وہاں علاج ہوتا رہا اور ۲۶ فروری کو مولانا دہلی واپس پہنچے، یہاں بہترین اور ماہر ڈاکٹروں اور معالجوں سے رجوع رہا، مگر مولانا صحیح معنیٰ میں مریض عشق تھے ان کی حالت بھی یہ تھی کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علاج کی آخری کوششوں کے لیے یہ طے ہوا کہ مولانا کو امریکہ لے جایا جائے چنانچہ ۱۶ اپریل ۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مولانا مرحوم عالمی ایروڈروم "پالم" سے امریکہ روانہ ہوئے مولانا کے داماد مسٹر عزیز الرحمن رفیق سفر رہے امریکہ کی ریاست "وسکونسن" کے مشہور شہر میڈیسن میں ڈھائی ماہ بغرض علاج مقیم رہ کر ۱۲ جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے۔ حالت بہت گر چکی تھی۔ اتفاق سے ان دنوں دہلی میں گرمی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور بجلی کے تعطل نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ گرمی کی تکلیف سے مولانا بہت بے چین تھے اور گلمرگ (کشمیر) جانے کا ارادہ کر رہے تھے، تیاری بھی ہو گئی تھی، مگر قضائے الٰہی ان کے لیے گلمرگ کی بجائے گلزار بہشت میں ابدی و سرمدی راحتوں کا اہتمام کر چکی تھی۔ اکیس دن اور قید حیات کے گزار کر ؎

آخر اس بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

۲ اگست ۶۲ء مطابق یکم ربیع الاول ۸۲ھ کو صبح ۳½ بجے بارگاہِ ربی سے تقرب کی مخصوص ساعتوں میں وقت اور تاریخ کے طوفانوں سے کھیلنے والی پاکیزہ روح نے اس دیار فنا کو خیرباد کہا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حضرت مولانا کی علالت نے پورے ملک کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور ان کی صحت و شفا کے لیے پورے ملک میں دعائیں ہو رہی تھیں مگر مشیت الٰہی کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔

کام تھے عشق میں بہت، پر میر ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

صبح ہوتے ہوتے یہ اندوہناک خبر ہندوستان و پاکستان کی وسعتوں میں پھیل گئی ۱۱ بجے خدام نے اپنے مخدوم مجاہد ملت کو غسل دیا کھادی کا کفن پہنایا، عطر کافور میں بسا کر سفر خلد بریں کے لیے دولہا بنایا اور احباب و مخلصین کے آخری دیدار کے لیے ۴ بجے تک بنگلہ کے ایک کمرہ میں آرام سے لٹا دیا جہاں روش صدیقی صاحب اور دوسرے حضرات قرآن حکیم تلاوت کرتے رہے اور مولانا سے تعلق خاطر رکھنے والی بے شمار مخلوق خدا قطار در قطار اپنے محبوب رہنما کی آخری بار زیارت کرتی رہی ان میں دہلی کے لاکھوں ہندو مسلم عوام و خواص بھی تھے اور باہر سے پہنچنے والے احباب کے قافلے بھی، مولانا کے پرانے رفیق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی آئے دوسرے وزراء اور پارلیمنٹ کے سینکڑوں ممبر بھی، مسلم ممالک کے سفراء اور عمائدین بھی، صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ، اسپیکر لوک سبھا، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، دہلی کانگریس کمیٹی، دہلی میونسپل کارپوریشن وغیرہ کی طرف سے ملک و وطن کے اس عظیم رہنما کے قدموں پر خراج عقیدت و محبت کے نشان "پھولوں کے حلقے" (ریتھ) نچھاور کیے گئے ۴½ بجے دو لاکھ انسانوں کے بے حال و اشکبار ہجوم نے مجاہد ملت کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ دہلی دروازہ کے بیرونی میدان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ

ہیں نئے مسلمان

مہتمم دار العلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور مغرب کے وقت ملک و ملت کا یہ سرمایۂ عزیز سپرد خاک کر دیا گیا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

واقعات و اقتباسات

ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دونوں ایک ساتھ دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے، وہاں یوپی گورنمنٹ کی ایک تعلیمی سب کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ راستہ میں میں نے ان سے کہا کہ پاجامہ اور دھوتی کی جنگ ختم کرنے کے لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مغربی لباس اختیار کر لیا جائے؟ مولانا نے فوراً تڑاق سے جواب دیا کہ اگر مسلمانوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے اسی طرح اپنی قومی تہذیب اور ملی تمدن کو چھوڑ کر مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کر کے اپنی عافیت و اطمینان کا سامان ڈھونڈ لیا تو پھر ہجرت کیا ہوئی؟ اور یہ تو کسی آزاد ملک کے ایک آزاد باشندہ کی زندگی نہ ہوئی۔ اسے میں ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(مولانا احمد سعید اکبر آبادی)

اسی طرح میرا ذاتی خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مسلمانوں کو گاؤکشی کے انسداد کا اعلان کر دینا چاہیے کیونکہ مذہباً ایسا کرنا جائز بھی ہے اور اس سے ہندو مسلم تعلقات کے خوشگوار ہونے کی امید بھی ہو سکتی ہے۔ ایک دن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو حسب عادت سنتے ہی بگڑ پڑے اور لگے تقریر کرنے۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم سے پہلے اگر ہم کرتے تو اس کی قدر بھی ہوتی، لیکن اب کہا جائے گا کہ مسلمانوں نے ڈر کر ایسا کیا ہے۔ ظاہر کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے مسلمانوں سے ہرگز نہیں کہوں گا کہ وہ انسداد گاؤکشی کا اعلان کر دیں۔ حکومت سیکولر ہے، دستور جمہوری ہے۔ اگر ہندو اس سیکولرازم اور جمہوریت کو عریاں کرنا چاہتے ہیں تو وہ بڑے شوق سے گاؤکشی قانوناً بند کروا دیں، اس وقت ہمارا موقف دوسرا ہوگا اور ہم اس مسئلہ پر پھر از سر نو غور کریں گے۔ مجھ کو اپنی رائے پر اصرار تھا، میں نے اس پر "برہان" میں لکھا، مگر ساتھ ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن کو اپنی رائے پر اس قدر پختگی تھی کہ انھوں نے میرے مضمون کا جواب "برہان" میں بھی دیا اور بڑے زور و شور کے ساتھ دیا۔ اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا اور رائے انہی کی درست تھی۔

(از مولانا احمد سعید اکبر آبادی)

پوری عمر کے اشغال ایک رات کے بدلے

حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے ایک مجلس میں (جو دیوبند میں مفتی جمیل الرحمٰن نائب مفتی دار العلوم دیوبند کے مکان پر) ہوئی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے متعلق [illegible] فسادات کے زمانہ میں دہلی کے اندر مسلمانوں کے بچانے کے سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے [illegible] ان کے بدلے میں اپنی پوری عمر کے اذکار و اشغال نثار کرنے کو تیار ہوں۔

(روایت مفتی جمیل الرحمٰن نائب مفتی دار العلوم دیوبند)

حضرت مولانا کی یاد میں بے شمار انسان مضطرب و بے قرار ہیں اور ان کے اعزہ و احباب نیز متعارفین کی لامتناہی تعداد ان کے لیے آج غم گسار ہے ان متعارفین میں بادشاہ اور امراء اور وزراء بھی ہیں اور علماء فقراء بھی ہیں اور عام پبلک بھی، لیکن سب سے زیادہ مضطرب مظلومین کا وہ طبقہ ہے جن کے لیے حضرت مولانا پشت پناہ تھے۔ ان میں وہ بے بس و بے کس اور لاوارث بازیافتہ مسلمان خواتین بھی ہیں جو حضرت مولانا کو اپنا باپ سمجھتی تھیں

جب تک بدن میں جان موجود ہے

۴۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مولانا ریل میں تشریف لا رہے تھے۔ مشرقی پنجاب کے ایک سٹیشن پر جب ٹرین پہنچی تو ایک مخالف مجمع نے جس کا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا حضرت شیخ الاسلام پر سنگ باری شروع کر دی، مولانا نے حضرت شیخ کو آڑ میں لے کر خود کو بلا تامل مجمع کے سامنے پیش کر دیا اور اب مولانا پر بلا تامل پتھر برسنے لگے حتیٰ کہ ایک پتھر نازک مرقع پر آ کر لگا فرماتے تھے کہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ جب تک حفظ الرحمٰن کے بدن میں جان موجود ہے حضرت شیخ پر آنچ نہ آنے دوں گا۔

برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام

اس سنگ باری کے سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے جو مجھ سے حضرت رائے پوری نے بیان فرمایا کہ پاکستان میں کسی مقام پر ایک شخص ان کو ملا اور بے اختیار رونے لگا۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ داستان سنائی کہ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہے اور جس مجمع نے حضرت شیخ الاسلام پر سنگ باری کی تھی بدبختی سے یہ بھی اس میں موجود تھا اس نے بتلایا کہ اس مظاہرہ کے موقع پر اپنی تشفی غیظ کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ برہنہ ہو کر حضرت شیخ کے سامنے ناچنے لگا۔ واقعہ رفت گزشت ہو گیا لیکن لا یضل ربی ولا ینسیٰ کچھ عرصہ بعد جب پنجاب میں ہولناک فسادات ہوئے تو سکھوں نے اس کے ساتھ یہ طریقہ برتا کہ اس کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا اور گھر کی بہو بیٹیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ برہنہ ہو کر اس کے اور مجمع کے سامنے ناچیں وہ کہتا ہے کہ اس وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ آج کا یہ ناچ اس برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام ہے جو حضرت مدنی کی اہانت کی غرض سے میں نے کیا تھا۔

(بروایت مفتی جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند)

غمگسار قوم

ملت کی خدمت کے اس لامتناہی سلسلہ کے علاوہ اسی سلسلہ کا ان کا ایک عظیم اور یادگار کارنامہ یہ بھی ہے کہ حکومتی پارٹی کانگریس کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہونے والی بے انصافیوں اور خاص کر فسادات کے سلسلہ میں انہوں نے پارلیمنٹ کے ایوان میں جس طرح کی تقریریں کیں (جو پارلیمنٹ کے ریکارڈ اور اخبارات کی فائلوں میں محفوظ ہیں) ان میں انہوں نے ملت کی مخلصانہ اور دردمندانہ وکالت اور حق گوئی و بے باکی کا حق ادا کر دیا ہے

اور اس "مجاہدانہ گفتار" کے علاوہ فسادات کے سلسلہ میں ان کا مستقل "خادمانہ کردار" یہ رہا کہ ملک کے جس حصے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی انہوں نے وہاں جلدی سے جلدی پہنچنے کی کوشش کی اور جو کچھ کر سکتے تھے اس کے کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا اور ان کاموں کے تقاضے کے سامنے اپنی صحت بلکہ اپنی زندگی تک کے مسئلہ کو بھی بھلا دیا

۶۱ء نومبر میں علی گڑھ وغیرہ میں فسادات ہوئے تو انہوں نے علی گڑھ کا دورہ اس حالت میں کیا کہ ان کے پھیپھڑے میں کینسر ہو چکا تھا اور اس کے اثر سے پانی کی کافی مقدار پیدا ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے کھانسی کی سخت تکلیف تھی جسم گھلا جا رہا تھا۔ لیکن انہیں اپنے اس حال کی کچھ خبر نہ تھی اور ڈاکٹری معائنہ کرانے کے لیے فرصت نہیں مل رہی تھی علی گڑھ سے انہیں سیدھا دیوبند آنا تھا یہاں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا اسی دن اجلاس تھا، ہم

آج ملک آزاد ہے سب کو برابر کا حق ہے، لیکن ہم ان باتوں کو کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ خود دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس درجہ ڈی مورالائز کر دیا گیا ہے اس درجہ احساس کمتری اور خوف میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو کہتے ہوئے جھجکتے ہیں، چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ہماری اس بات سے ہندو خوش ہوگا یا نہیں۔

ہم اس ملک میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان یہاں اس لیے نہیں ہیں کہ کسی کی چاپلوسی کریں یا یہ سمجھیں کہ اس سے ہندو خوش ہوگا یا پنڈت نہرو خوش ہوں گے۔ اگر جمعیۃ کے خدام کے دل میں ایک منٹ کے لیے بھی ایسا خیال گذرے تو میں کہوں گا کہ اس سے بڑی بزدلی اور نفاق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہم کہتے ہیں کہ جس طرح یہ ملک اکثریت کا ہے اسی طرح اقلیت کا بھی ہے جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح حفظ الرحمٰن کا بھی ہے یہ ایک جمہوری ملک ہے۔

اس مسلسل پریشانی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ آیئے غور کریں کہ کس طرح اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک بات کا تعلق آپ سے ہے اور دوسری بات کا تعلق برادران وطن سے ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اپنا ایک ذہن ہے اور وہ ذہن یہ ہے کہ یہ ہمارا بھی اسی طرح وطن ہے اور اس ملک پر ہمارا بھی اتنا حق ہے جتنا کسی دوسرے کا جس طرح ان کو رہنے کا حق ہے اسی طرح ہم کو بھی رہنے کا حق ہے۔ اس سلسلہ میں میں ایک مثال دیا کرتا ہوں، لیکن بات کو سمجھنے کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے اس لیے عرض کرتا ہوں یہ میرا جسم ہے اس کے بہت سے حصے ہیں، پیر ہیں، ہاتھ ہیں، سر ہے، دل ہے، دماغ ہے، جگر ہے۔ ہر ہر حصہ کا اپنا اپنا مقام ہے۔ بلاشبہ سر کو یہ حق ہے کہ وہ کہے میں سب سے اوپر ہوں۔ دل کو یہ حق ہے کہ وہ کہے کہ میرے دم سے خون کی گردش کا نظام باقی ہے دماغ کو حق ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو مجھی سے قائم ہے۔ ہاتھ پیروں کو حق ہے کہ وہ اپنا اپنا راگ گائیں، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب خوبیاں اور بڑائیاں اسی وقت تک ہیں جب تک یہ تمام اعضاء ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک جسم ہیں پھر یہی نہیں بلکہ اس جسم کی حالت تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے ناخن میں ایک پھانس چبھ جاتی ہے تو دیکھو کیا حال ہوتا ہے نہ دل کو چین ہے نہ دماغ کو سکون نہ ہاتھ کو راحت ہے نہ پیر کو آرام۔ سارا جسم ہی اس درد سے بے چین رہتا ہے پس اس ملک کی مثال بھی ایک جسم کی مثال ہے اس میں رہنے بسنے والے اس کے ہاتھ پیر دل و دماغ ہیں۔ ہمارے ہندو بھائی شوق سے اس جسم کا اپنے کو دل دماغ کہ لیں، اس کے ہاتھ پیر بن جائیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ اگر ناخن کے برابر بھی کسی اقلیت کے سینہ میں ذرا سی پھانس چبھنے لگی تو وہ بھی چین اور آرام محسوس نہ کریں گے۔ ہمیں یہ شوق نہیں کہ ہم اس جسم کے دل و دماغ کہلائیں یا اپنی بڑائی جتائیں لیکن یہ ضرور بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم تو کیا ہم سے کم اقلیت کو بھی کوئی تکلیف پہنچے گی تو سارا جسم اس وقت تک درد میں مبتلا رہے گا۔ جب تک اس پھانس کو نکال نہ دیا جائے گا، آج ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان چودہ سالوں میں مسلسل پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے ان پریشانیوں کو دور کیا جائے ورنہ سارا جسم درد اور بے چینیوں میں مبتلا رہے گا۔ اس درد کا علاج ڈھونڈنا ہوگا۔ اس تکلیف کو دور کرنا ہوگا۔

یہ دیش ہمارا دیش ہے یہ ملک ہمارا ملک ہے۔ اس ذرہ ذرہ سے ہم کو محبت ہے اس وجہ سے محبت ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ میرا مذہب مجھے بتاتا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے ایک حدیث میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما رہے تھے تو شہر مکہ معظمہ کی طرف بار بار دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے مکہ! تو مجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنے کا ڈھنگ بدلنا ہے، ہمارا ملک آزاد ہے، آج اقلیت کی درخواست رحم و کرم کی درخواست نہیں ہے۔ ہم کسی سے "بھیک" نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہر شہری کو ہر ایک چھوٹے بڑے کو ہر افسر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا جائز حق مانگے ہمیں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے کچھ طاقت بنانی ہے۔ وہ طاقت توپ اور بندوق کی طاقت نہیں ہے وہ ایٹم بم اور راکٹ، یا میزائل کی طاقت نہیں ہے۔ وہ طاقت ہے اس دل کی یاد رکھیں جس کے پاس دل کی طاقت ہے اسے کوئی طاقت دبا نہیں سکتی ہے بس طاقت سے ہمیں اپنے حقوق کے لیے لڑائی لڑنی ہے اس ملک کے تمام معاملات کا ہم سے تعلق ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی کمزوری ہے تو ہم اسے دور کریں گے۔ ہم تماشائی بن کر اس کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔

اس حالت میں ہمیں اس بات کا کیا خوف ہے۔ پاکستان کے ساتھ جوڑنے کا ٹیکنک کیوں اپنایا جاتا ہے ہم اس کے خلاف ضرور آواز اٹھائیں گے کیا ہر جگہ ظلم اور بربادی ہوتی رہے گی اور اس کے بارے میں مسلم اقلیت کسی بات کو کہے گی تو یہ کہہ کر منہ بند کر دیا جائے گا کہ پاکستان سے جوڑ ہے، پاکستان ریڈیو سے جوڑ ہے اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جا سکتا۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس طریقہ سے ایک اقلیت کو دبانے کی کوشش کی جائے۔

اسی طرح ٹیکسٹ بک کی بات ہے اس کے بارے میں ہم نے ایک شکایت کی تھی اور وزیر تعلیم کو ایک کتاب دکھائی تھی اور انھوں نے ہماری بات کو صحیح تسلیم کیا تھا اور کہا تھا کہ اس قسم کی کتابیں نہیں پڑھانی چاہئیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تیوہاروں کا ان میں کیوں ذکر کیا گیا ہے سوال یہ ہے کہ دیوالی ہی کا ۔ دسہرہ ہی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے یہ سب ہندوستان کے تیوہار ہیں۔ کسی کورس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن جہاں اکثریت کے تیوہار کا ذکر ہے، وہاں مسلمانوں کے جو تیوہار ہیں عید ہے بقر عید ہے، شب برات کیا ہے، محرم کیا ہے، یا سکھوں کے تیوہار ہیں۔ عیسائیوں کے تیوہار ہیں۔ ان کا بھی اس میں ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہ کیا گیا ہوتا تو سیکولر اسٹیٹ کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا، لیکن اس کے برخلاف اس طرح کی باتیں ان کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ آؤ، ہم بھگوان کرشن کی پوجا کریں، آپ بتائیں کہ مسلمان کے بچے یہ کیسے کریں گے۔ بھگوان کرشن کی پوجا ہندو کر سکتے ہیں، لیکن مسلمان سکھ عیسائی کیسے کر سکتے ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی چیزیں پڑھانے کا اقلیتوں کے بچوں کو آپ کو کس نے حق دیا ہے۔ مسلمان اپنے خداوند قدوس کی عبادت کرتے سکھ اپنے طریقے سے کرتے ہیں عیسائی اپنے طریقے سے۔ اور ان کو پورا حق حاصل ہے، آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ

وفات پر خراجِ عقیدت

ڈاکٹر ذاکر حسین، نائب صدر جمہوریہ ہند

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی وفات، پورے ہندوستان کے لیے ایک سخت سانحہ ہے۔ بعض مرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ پُر کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا شمار انہیں میں کرنا چاہیے انہوں نے اپنی مجاہدانہ زندگی کی ساری صلاحیتیں ہندوستانی قومی تعمیر کے لیے وقف کر دی تھیں ان کی حساس اور فرض شناس شخصیت نے مذہب و ملت کا فرق و امتیاز کبھی روا نہ رکھا وہ ہر اس تحریک کے ساتھ تھے جو مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت میں اُٹھائی گئی ہو۔ جب کبھی اور جہاں کہیں انہیں مظلوم کی چیخ سنائی دی تو وہ بیتاب ہو گئے اور غم گساری کے لیے پہنچ گئے اور جو بھی بن پڑا کیا کبھی حکام کو متوجہ کیا کبھی مالی امداد طبی امداد کے لیے سامان فراہم کیا اور کبھی جرأت اور بے باکی سے حق اور صداقت کو اپنے اہل وطن کے سامنے پیش کیا۔

مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی ۱۹۱۹ء سے شروع ہوئی انہوں نے خلافت اور سوراج کی تحریکوں میں حصہ لیا اور متحدہ قومیت، حریت و آزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخر دم تک برقرار رہی، ان کی زندگی مدح و ستائش سے ہمیشہ بے نیاز رہی۔ جو کچھ کیا اسے فرض سمجھ کر کیا۔ قید و بند کے مصائب برداشت کیے تو فرض سمجھ کر۔ آزاد رہ کر جو سختیاں جھیلیں، وہ بھی فرض سمجھ کر۔ ان کی ذات ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان اتصالی کڑی کے مثل تھی وہ قومی اتحاد اور یک جہتی کے زبردست علمبردار تھے انہیں پورا یقین تھا کہ جب تک اہل ملک میں جذباتی ہم آہنگی اور ہمدردی و موانست نہ پیدا ہو اس وقت تک آزادی کی برکتیں عام نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ حریت و اخوت کے اصول جڑ پکڑ سکتے ہیں، جن پر ہندوستانی دستور کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

افسوس، صد افسوس کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے، لیکن کیا وہ واقعی ہم میں نہیں ہیں؟

نہیں وہ ہزاروں ساتھیوں کے سینوں میں محبت اور عقیدت کے روپ میں ہزاروں بے یاروں، بے مددگاروں بے شمار یتیموں، بیواؤں کے دلوں میں ایک سہارے کی یاد کی شکل میں، لاکھوں ہم قوموں کے ذہنوں میں، خوف کے وقت

جرأت، بے سروسامانی میں ہمت اور ہر حال میں خلوص اور صداقت کے عَلَم کی صورت میں زندہ رہیں گے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں، موت ان کے لیے حیاتِ جاوداں کا دروازہ ہوتی ہے۔ ان کی روح اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں پہنچ گئی ہے اس کی رحمتوں اور برکتوں کی بارش اس پر ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

السید جمال عبدالناصر، صدر متحدہ عرب جمہوریہ:

مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سیکرٹری جمعیۃ علماء ہند کی خبر وفات میں نے گہرے رنج و غم کے ساتھ سنی۔ بلاشبہ ہم ایک جید عالمِ دین سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ خدائے پاک سے میری دعا ہے کہ انہیں اپنی رحمتوں سے نوازے اور آپ کو جو سخت نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کرے۔

جمال عبدالناصر

ڈاکٹر راجندر پرشاد، سابق صدر جمہوریہ ہند:

کیمپ حیدرآباد

مورخہ ۳۱ر اگست ۶۲ء

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم جمعیۃ علمائے ہند کے ایک بلند پایہ رکن، ہماری قومیت کی ایک چمکتی مثال تھے اور میرے ان عزیزوں دوستوں میں سے تھے۔ جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ شل ہے کہ قوم کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنے سچے خادموں کو بھی بھولتے دیر نہیں لگتی۔

راجندر پرشاد

مسز اندرا گاندھی

(خاص مکتوب کے ذریعہ)

مولانا کی وفات سے سب کو دلی صدمہ پہنچا۔ مولانا صاحب کی بیماری کا مجھے علم تھا، لیکن یہ گمان نہ تھا کہ ان کا وقت اتنا قریب آگیا ہے۔ علاج کرانے کے بعد انہوں نے میرے والد (پنڈت جواہر لال نہرو) سے کہا تھا کہ اب میں اچھا ہوں۔

مولانا صاحب نے اپنی تمام زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزاری وہ بڑے حوصلے والے روشن خیال اور

بلند اخلاق انسان تھے ان کی وفات سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے

شریمتی اندرا گاندھی

شری جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہند:

مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ مولانا کو میں کب سے جانتا ہوں، کچھ کہہ نہیں سکتا تیس برس سے جانتا ہوں، یا شاید پینتیس چالیس برس سے جانتا ہوں، بالکل یاد نہیں ہم لوگ شروع میں دونوں یو پی کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے وہاں ان سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ سب مسئلوں پر بات چیت کیا کرتے تھے۔ جب انگریزی حکومت سے مقابلہ کرتے تھے تو ہمارا معمولی کام رک جاتا تھا، صرف مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ جیل جانے اور آنے کا کام رہتا تھا۔ ہم پھر آ کر ملتے تھے تو اس سلسلے کو شروع کر دیتے تھے میں ان سے بہت ملتا تھا اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ بہت محبت تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے بہادر نیتا تھے جو کہتے تھے، اس میں وزن ہوتا تھا، ان کی بات غور طلب ہوتی تھی۔ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے ان کی وفات سے مجھے کافی دھکا لگا ہے۔ آہستہ آہستہ سارے بزرگ گزرتے جا رہے ہیں۔ ان کے کاموں کا بوجھ نوجوانوں کے کندھوں پر آ پڑا ہے۔ دنیا کا اس طرح ہی دستور ہے دستور کیسا بھی ہو، رنج تو ہوتا ہے اور رنج ہونا بھی چاہیے۔

ابھی وہ امریکہ سے واپس آئے تھے تب میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملا تھا۔ مجھے بڑے اطمینان سے انھوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹروں نے ان کو اچھا کر کے بھیجا ہے، ہاں کافی کمزور تھے میں نے انہیں مبارکباد دی شکر ہے کہ اچھے ہو گئے۔ سوچتا تھا کہ ہلکے ہلکے طاقت آ جائے گی ابھی کمزور ہیں ایک روز میں نے سنا کہ وہ گزر گئے۔ بڑا افسوس ہوا، اس بات کو برداشت کرنا ہی ہوتا ہے مناسب ہے کہ جمع ہوں رنج و غم کا اظہار کریں، لیکن کچھ غور کریں کہ کیسا آدمی تھا۔ اس کا کیا طریقہ تھا کیا کر گیا

ہمیں چاہیے کہ اس سے کچھ سیکھیں اس کے راستہ پر چلیں۔

جواہر لال نہرو

شری لال بہادر شاستری (ہوم منسٹر)

ٹاؤن ہال دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر:

مولانا حفظ الرحمٰن کا کل انتقال ہو گیا۔ میرا ان کا ۳۰-۳۲ سال کا ساتھ تھا۔ یو پی میں میرا ان کا ساتھ

رہا، پھر دلی آنے کے بعد میرا ان کا ساتھ رہا ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ ابھی ٹنڈن جی اور مسٹر بی سی رائے کا انتقال ہوا تھا، اب مولانا بھی چل دیے اسی طرح ہم بھی ایک دن چلے جائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ جو چلا جاتا ہے اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی دوسرا سامنے نہیں آتا۔

ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے، گاندھی جی اس ملک میں آئے انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی، ان کے ساتھ مل کر، ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر ان پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے، چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ ان کا ڈھنگ اور طریقہ ایسا ہی تھا۔

لیکن میں آپ سے ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ لیڈر، دولت سے نہیں بنتا۔ بہت سا پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنتا۔ لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے تو ان میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس ۳۲، ۳۳ سال کی مدت میں کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی جلسہ ہو کوئی موقع ہو اور مولانا اس میں شامل ہوں اور انھوں نے سب کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ لی ہو ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی، جہاں وہ بیٹھے ہوں تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ میں نے ان کو کانگریس کے جلسوں میں دیکھا یو پی اسمبلی میں دیکھا۔ پھر یہاں پارلیمنٹ میں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے دیکھا، وہ اپنی بات سے اپنی سچائی اور بردباری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔

مولانا ہمارے لیے بڑا سہارا تھے۔ ملک کے لیے مشکل مسئلوں میں ان کی رائے کا ایک وزن تھا اس لیے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تک تو ان کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ ملک کو آزاد کرانے کا لیکن اس کے بعد سے ان کے سامنے ملک کی ترقی اور ملک کے اتحاد کا سوال سب سے زیادہ رہتا تھا

اس ملک میں کبھی کبھی ایسی باتیں ہو جاتی تھیں جن سے مولانا کو بہت دکھ پہنچتا تھا میں آپ کو بتاؤں وہ کیا باتیں تھیں جن سے مولانا بہت دکھی ہوتے تھے یہی باتیں کہ کبھی ہم یہاں لڑ بیٹھے کبھی وہاں دنگا فساد کر دیا۔ جب لاٹھی اور خنجر کا استعمال ہوتا ہے تو کون ہندوستانی ہے جس کے دل پر چوٹ نہ لگتی ہو۔

مولانا کو ایسی باتوں سے بہت دکھ ہوتا تھا وہ ناراض ہوتے تھے، غصے بھی ہوتے تھے مگر سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ ان باتوں کو سوچتے تھے ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے ان کے اندر ایسے واقعات سے کوئی تلخی پیدا نہیں ہوتی تھی وہ بے چین ہوتے تھے اور غلط باتوں کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھاتے تھے، مگر بردباری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے

جبلپور میں ایسا ہی دنگا فساد ہوا مولانا وہاں گئے اپنی آنکھوں سے وہاں کی باتیں دیکھ کر آئے۔ وہ بہت دکھی تھے انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے، ملک کے لیڈروں کے سامنے، وہ باتیں بڑے دکھ کے ساتھ

بانیٔ تنظیم اہلِ سنّت سردار احمد خان پتافی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۶۰ء

مولانا ابوالحسن علی ندوی
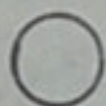
اہلِ تصوّف اور دینی جدوجہد

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کتاب کا مقدمہ لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر اپنی بے پناہ مصروفیتوں، غیر ملکی اسفار و امراض کی بنا پر خاص اس کتاب کے لئے مقدمہ نہ لکھ سکے۔ البتہ ان کا ایک پرانا مضمون بطور تکملہ شامل کر رہے ہیں۔ کتاب میں جن اکابر کے حالات مندرج ہیں وہ تقریباً سبھی سلوک و تصوف کے امام تھے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوا کہ تصوف کے متعلق جو غلط تاثرات عوام بلکہ خواص تک میں پائے جاتے ہیں، ان کی غلطی واضح کرنے کے لئے اسی قسم کی تحریر شامل کتاب کر دی جائے ——— عبدالرشید ارشد

دُنیا میں بہت سی چیزیں خاص اسباب کی بنا پر بغیر علمی تنقید و تحقیق کے تسلیم کر لی جاتی ہیں اور ان کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی مگر خواص بھی ان کو زبان و قلم سے بے تکلف دہرانے لگتے ہیں۔

انہیں مشہورات بے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوّف، تعطل و بے عملی، حالات سے شکست خوردگی اور میدانِ جدوجہد سے فرار کا نام ہے۔ لیکن عقلی و نفسیاتی طور پر بھی اور عملی اور تاریخی حیثیت سے بھی اور اس دعوے کے خلاف مسلسل طریقہ پر داخلی و خارجی شہادتیں ملتی ہیں۔

سیرت سید احمد شہیدؒ میں تزکیۂ اصلاحِ باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسار راقم نے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے جس میں آج بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اس حقیقت پر پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا ہے۔

"یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سرفروشی و جاں بازی، جہاد و قربانی اور تجدید و انقلاب و فتح و تسخیر کیلئے جس رُوحانی و قلبی قوت، جس وجاہت و شخصیت، جس اخلاص و للہیت، جس جذب و کشش اور جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے وہ بسا اوقات رُوحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیب نفس عبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جنہوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سے اکثر افراد رُوحانی و قلبی حیثیت سے بُلند مقام رکھتے تھے، ان آخری صدیوں پر نظر ڈالئے، امیر عبدالقادر الجزائری مجاہد جزائر، محمد احمد السودانی (مہدی سوڈانی) سید ی احمد شریف السنوسی (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے۔ حضرت سید احمد ایک مجاہد و قائد کے علاوہ ایک عزیز القدر رُوحانی پیشوا اور بے مثل شیخ الطریقت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات و ریاضیات، تزکیہ نفس اور قربِ الٰہی سے عشقِ الٰہی اور جذب و شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے۔

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر !

مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں،

اس لئے رُوحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوقِ شہادت ہے اور مجاہدے کی اکمل جہاد ہے۔[1]

---

[1] سیرت احمد شہیدؒ طبع ثانی ص

ہندوستان میں تصوف و جہاد کا ایسا عجیب امتزاج واجتماع ملتا ہے جس کی نظیر دُور دُور ملنی مشکل ہے اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے کہ ان کی یہ جامعیت مسلمات میں سے ہے اور حد تواتر کو پہنچ چکی ہے ان کے رفقاء جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوش جہاد، شوق شہادت، محبت دینی، بغض فی اللہ کے واقعات قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں، جب کبھی ان کے مفصل واقعات سامنے آئیں گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ قرن اوّل کا بچا ہوا ایک ایمانی جھونکا تھا جو تیرھویں صدی میں چلا تھا اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح تعلق باللہ اور راہِ نبوت کی تربیت وسلوک میں کتنی قوت اور کیسی تاثیر ہے اور بغیر صحیح روحانیت اور اصلاح کے پختہ جوش وجذبہ اور ایثار و قربانی اور جاں سپاری کی اُمید غلط ہے۔

سید صاحبؒ کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی سید صاحب کے پرتو تھے ان کے جانشینوں میں مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں حیثیتوں کے جامع تھے، ایک طرف ان کے جہاد و ابتلاء و امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبلؒ کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر انبالہ کے پھانسی گھر، کبھی جزائر انڈمان میں محبوس نظر آتے ہیں، دوسرے وقت وہ سلسلۂ مجددیہ وسلسلۂ محمدیہ (سید صاحب کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت وتعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق — ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جدوجہد اور قربانیاں اگر ایک پلڑے پر رکھی جائیں اور اہل صادق پور کی جدوجہد اور قربانیاں اگر دوسرے پلڑے پر تو شاید یہی پلڑا بھاری رہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہلِ سلسلہ اور اصحاب ارشاد دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ نشین نظر نہیں آتے، شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ ضامن، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ انگریزوں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ حضرت حافظ ضامن وہیں شہید ہوتے ہیں، حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کر جانی پڑتی ہے۔ مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کو عرصہ تک گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑتا ہے۔ پھر مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کر کے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو۔ ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستان وافغانستان و ترکی کو ایک سلسلۂ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے، ریشمی خطوط، انور پاشا کی ملاقات مالٹا کی اسارت انکی عالی ہمتی اور قوتِ عمل کا ثبوت ہے۔

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔

ان مسلسل تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ تعطل و بے عملی حالات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور پسپائی تصوف کے لوازم میں سے ہے۔ اگر اس دعوے کے ثبوت میں چند متصوفین اور اصحاب طریقت کی مثالیں ہیں تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ان آئمہ فن اور شیوخ طریقت کی مثالیں ہیں جو اپنے مقام اور رسوخ فی الطریقہ میں اوّل الذکر اصحاب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

حاشیہ گذشتہ صفحہ: بڑے قاہرہ میں مصر کے مشہور فاضل ومصنف ڈاکٹر احمد امین بے نے (جن کو شیخ محمد عبدہ سے شخصی واقفیت اور اسباق میں شرکت کا شرف حاصل ہے) سید جمال الدین و شیخ محمد عبدہ کی اس مناسبت اور اشتغال کا ذکر کیا۔

لہ ان تفصیلی واقعات کے لئے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ دوم وغیرہ مطبوعہ

اور زیادہ قرین قیاس ہے بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ و شاہ اسمٰعیل شہید جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے وہ بھی ایک فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور اُن کے شخصی حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پُوری طرح قائل تھا، اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں اسرار دین کے عارف اور امت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے ——— بیشک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحب وحی تو نہیں ہوتا، لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروّج بھی نہیں ہو سکتا، خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہُوا اور وہ اس کا داعی خاص ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو اُس میں اگر وہ بدعت و غیر بدعت میں امتیاز نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہو گا۔

بہر حال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی اُلجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے، اور اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے، اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہو لیا۔ اور راستے میں اپنے ذہنی بحث و مباحثہ اور اس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا، کہ :-

> "میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف کے اعمال و اشغال کے بارہ میں جو اب تک سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کُھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔"

موصوف میری یہ بات سُن کر مُسکرائے اور فرمایا :-

> "مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلایئے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا :-

> "بدعت کی تعریف تو علمائے کئی طرح سے کی ہے لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی چیز کا اضافہ جس کے لیے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔"

فرمایا :-

> "ہاں ٹھیک ہے لیکن یہ بتلایئے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو، اور اللہ و رسُول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو جس طریقے سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی،